قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in
جون 2013، قیمت -/15

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

بچوں کا ادب اور اردو

مشمولات

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:15، شمارہ:06، جون 2013

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا
انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: منظر سبحانی

قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت: 49539009)

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

اداریہ
ہماری بات 2

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3

انٹرویو
شموئل احمد — رفیق جعفر 7

خراج عقیدت
خاردار راستوں کا مسافر: اصغر علی انجینئر — سید احمد قادری 10

شمشاد بیگم: آواز کا شعلہ جو روشنی بن گیا — شفیع ایوب 12

کور اسٹوری
بچوں کا ادب تب اور اب — فاروق ارگلی 14
بچوں کے ادب کی اہمیت وافادیت — ابن آدم 17
بچوں کا ادب کوئی کھیل نہیں — ظفر عدیم 19
بچوں کے اردو رسائل کردار و تقاضے — امتیاز وحید 23
ادب اطفال کی تخلیقی ضرورتیں — وکیل نجیب 27

زبان و تعلیم
کرناٹک میں اردو زبان کا ارتقا — وہاب عندلیب 30

ادبی مباحث
گم شدہ مصرعوں کی تلاش — سید معین الدین علوی 33
میر انیس کی مصوری — شمشاد حیدر زیدی 37

اردو ادب اور گلکرسٹ — مہمنہ خاتون 39

شخصیت
ابومحمد سحر کا سحر غزل — محمد شاہد پٹھان 41
رام لعل: ایک مطالعہ — مظہر محمود 43

مشاہیر ادب/نظم
صفی لکھنوی — ادارہ 46
انتخاب کلام — صفی لکھنوی 47

مشاہیر ادب/نثر
محمد حسین آزاد — ادارہ 49
سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ — محمد حسین آزاد 50

ہم نے جنھیں بھلا دیا
مخمور اکبرآبادی: بحیثیت محقق و مصنف — سید اختیار جعفری 53

ہماری مطبوعات
نظریۂ ارتقائے حیات — افتخار عالم خاں 55

دوسری زبانوں سے
پرتی ترپتی (انگریزی کہانی) — نین تارا سہگل
مترجم: شائستہ فاخری 58

کریئر گائڈ
سول سروسیز کے لیے نیا پیٹرن — خورشید عالم 63

فلم
سنیما میں مردانہ بصری تسکین — عبدالقادر صدیقی 65

ماحولیات
ماحولیاتی آلودگی ایک بڑا مسئلہ — سمیع الدین شاداب 68

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 72

اردو کیمپس
یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں — ادارہ 78

عالمی اردو نامہ — ادارہ 79

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 81

ہماری بات

کسی بھی زبان کی قدر و قیمت، اہمیت ومقبولیت اور ترسیلی قوت کا اندازہ اس زبان میں بچوں کے لیے تخلیق کیے گئے ادب اور اس کے معیار سے ہوتا ہے۔ چاہے وہ پنچ تنتر کی کہانیاں ہوں، الف لیلہ کے قصے ہوں، جاتک کتھائیں ہوں یا مختلف مذہبوں وزبانوں کے دیو مالائی تذکرے اور اساطیری بیان ہوں۔ ان کا بہت سا حصہ بچوں کی ذہنی اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کر تخلیق کیا گیا تھا، اور ان قصے کہانیوں سے ہی متعلقہ زبانوں اور تہذیبوں و مذاہب کی پہچان اس دنیا میں بنی ہے۔ ان ہی کی طرح اردو بھی دنیا کی ایک ایسی ہی زندہ وتابندہ عظیم زبان اور تہذیب ہے، جس کا دامن اعلیٰ معیاری ادبِ اطفال سے مالا مال ہے، جس کے آسمان ادب پر چمکنے والے چاند ستاروں، خسرو، میر، نظیر، غالب، اقبال اور پریم چند جیسی روشن ہستیوں نے بچوں سے ادبی تخلیقی وابستگی کو اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھا ہے۔ 'خالق باری' جیسی نظم سے لے کر 'عید گاہ' جیسے نثری شاہکار تک پھیلے ہوئے جس کے ادبی سرمائے نے نسل درنسل ہمارے بچوں کی ذہنی تربیت واصلاح میں مثبت اور تعمیری کردار ادا کیا ہے۔

لیکن گزشتہ تیس چالیس برس سے ادب اطفال کے اردو سرمائے میں اضافے کا سلسلہ تقریباً رک گیا ہے۔ آج کے اردو ادب میں بچپن کہیں کھو سا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بچوں کے مطلب کا ادب تخلیق کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ ان کی ذہنی سطح پر آکر چیزوں کو دیکھنا سوچنا اور سمجھنا، تخلیق کو پند ونصائح کی بیزاریوں سے بچانا اور دل چسپی کو برقرار رکھنا، سیدھے سادے عام فہم لفظوں کے انتخاب اور استعمال کا ایک ایسا توازن قائم کرنا کہ زبان کی حرمت وعظمت اور شیرینی پر بھی حرف نہ آئے اور بچے اسے آسانی سے سمجھ بھی لیں۔ مشاہیرِ اردو ادب نے بچوں کے لیے لکھتے وقت اس توازن کو کمال کی حد تک قائم رکھا تھا۔ آج جن مشاہیر ادب کو شعر، فکشن اور تنقید کی آبرو مانا جاتا ہے ان میں بہت ہی کم ایسے ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے الگ سے کچھ لکھا ہو۔ یہاں تک کہ ادب اطفال پر تنقید وتحقیق کا بھی کوئی قابلِ ذکر کام سامنے نہیں آیا ہے۔ ایسے ہی بہت سے سوال ہیں جن کا جواب اس مرتبہ کور اسٹوری 'بچوں کا ادب اور اردو' کے تحت ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قومی اردو کونسل اپنی ابتدا سے ہی بچوں کے ادب کے ساتھ بڑی مضبوطی سے وابستہ رہی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اب تک جتنی کتابیں کونسل نے بہت کم قیمت پر اردو والوں کے لیے شائع کی ہیں ان میں ساڑھے تین سو سے زیادہ ٹائٹلز صرف بچوں کی کتابوں کے ہیں۔ اردو کونسل شروع سے اس نظریے کو مانتی آئی ہے کہ بچوں کے لیے اچھی اور دل چسپ ومعلوماتی کتابیں شائع کیے بغیر اردو زبان کو فروغ نہیں دیا جاسکتا۔ آج کے بچوں کو اچھی غیر نصابی اردو کتابیں پڑھنے کو نہیں ملیں گی تو وہ کل کی روشن اردو شخصیت نہیں بن سکیں گے۔

اردو میں ادب اطفال کے فروغ کی طرف ایک اور اہم قدم اٹھاتے ہوئے قومی اردو کونسل نے، بچوں کے لیے ایک دل چسپ معلوماتی اور خوب صورت ماہانہ رسالے کے اجرا کا فیصلہ کیا ہے جس کا نام 'بچوں کی دنیا' رکھا گیا ہے۔ اردو میں 'پھول' اور 'پھلواری' سے لے کر 'کھلونا' تک، بچوں کے معیاری ماہناموں کی ایک شاندار روایت رہی ہے۔ اپنے کاموں کے بارے میں لمبے چوڑے دعوے کرنا کبھی ہمارا شعار نہیں رہا ہے، اس لیے یہ بالکل نہیں کہیں گے کہ قومی اردو کونسل کا ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' اردو صحافت برائے اطفال کی تاریخ کو بدل کر رکھ دے گا۔ ایسی دور از کار خوش فہمیوں میں ہم مبتلا نہیں ہیں۔ پھر بھی اتنا یقین ضرور دلا سکتے ہیں کہ متنی، صوری اور طباعتی معیار سے اردو کا اتنا خوب صورت بچوں کا رسالہ تمام اردو دنیا میں آپ نے ابھی تک نہیں دیکھا ہوگا۔ اس سلسلے میں زیادہ انتظار کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ سب کچھ ٹھیک رہا تو بہت جلد، بلکہ اسی مہینے 'بچوں کی دنیا' آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

سید ریاست علی ریاست

لیکچرار، ڈاکٹر ذاکر حسین کالج، برہان پور (ایم پی)

اردو دنیا کا تازہ شمارہ دیکھ کر ذہن میں قومی کونسل کے وائس چیئر مین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کا مصرع گونجنے لگا۔ جو زندہ ہو تو پھر زندہ نظر آنا ضروری ہے۔

اردو ایک زندہ زبان ہے جس کی دھڑکنیں اردو دنیا کے اوراق میں صاف سنائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب اور پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کی رہنمائی میں اردو کا سفر خوب سے خوب تر کی جانب گامزن ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنا ایک مطلع اور ایک شعر ان حضرات کی خدمت میں پیش کروں:

پھل مقصد تعلیم کا بازار میں آئے
جو بات کتابوں میں ہے کردار میں آئے
اردو کے لیے خدمت بے لوث کا جذبہ
سب میں نہیں آتا ہے تو دو چار میں آئے

ویسے تو اردو دنیا، اپریل 2013 کے سبھی مضامین معلوماتی اور ادبی نقطۂ نظر سے معیاری ہیں۔ لیکن دور حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر فاصلاتی نظام تعلیم اور کونسل کے کورسیز عنوان کے تحت ڈاکٹر محمد احسن صاحب کا مضمون بہت پسند آیا۔ چونکہ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کا Drop out percentage دیگر زبانوں کے مقابلے زیادہ ہے اس لحاظ سے فاصلاتی نظام تعلیم مسلم طلبہ کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ اردو میڈیم طلبہ نیز فارغین مدارس کے لیے Functional English میں ڈپلومہ کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب کا مشورہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اردو کونسل ہندی اور انگریزی میڈیم کے طلبہ کو تو اردو سکھا رہی ہے لیکن اردو میڈیم کے طلبہ جن کی انگریزی کمزور ہوتی ہے ان کے لیے ہمارے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے۔ امید ہے قومی کونسل اس پر سنجیدگی سے غور کرے گی۔

کرشن بھاوک

201-A، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، پٹیالہ، پنجاب

'اردو دنیا' کا مئی کا شمارہ باصرنواز ہوا! از جانب تمام قارئین میں قومی اردو کونسل کے معزز وائس چیئر مین جناب پروفیسر وسیم بریلوی کو حکومت اتر پردیش سے مالی اعتبار سے ملک کے سب سے بڑے 11 لاکھ روپے کے ایوارڈ ('یش بھارتی سمان') سے نوازے جانے پر دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ ویسے یہ ایوارڈ انھیں بہت قبل ہی مل جانا تھا، لیکن 'دیر آید درست آید' کے ضرب المثل' اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قومی اردو کونسل کے ایگزیکٹو بورڈ کے سینئر رُکن و دیگر اردو جریدہ 'ایوان اردو' کے نگران و' اردو اکادمی دہلی' کے معزز وائس چیئر مین جناب پروفیسر اختر الواسع کو حکومت ہند کی جانب سے 'پدم شری' کے ایوارڈ سے نوازے جانے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ دونوں ہی وائس چیئر مین عالم و فاضل ادیب و شہرۂ آفاق صحافی بھی ہیں اور ان اعزازات کے کاملاً مستحق ٹھہرتے ہیں۔ اگرچہ مئی کے اس شمارے میں تمام مضامین بے حد معلوماتی و تحقیقی اوصاف لیے ہوئے ہیں، تاہم انصاری شگفتہ عبد الحفیظ کے مضمون میں 'غیر مسلم خواتین کی نثری ادبی خدمات' کو تفصیل سے نشان زد کیا گیا ہے اور یہ ایک قابلِ تحسین مقالہ ہے۔ صرف اپنی یادداشت کی مدد سے کہہ سکتا ہوں کہ مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کی بہن کا نام سری دیوی نہیں سرلا دیوی تھا، (ص 35)۔ جس طرح 'رامائن' سیریل کے ہدایت کار شری راما نند ساگر کے مقبولِ عام ناول 'اور انسان مر گیا' کے دیباچہ میں خواجہ احمد عباس نے ناول کے عنوان پر اعتراض ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'انسانیت کبھی بھی مر نہیں سکتی'، لہٰذا عنوان کے بعد ایک سوالیہ نشان؟ لگانا درکار ہے، یہی اعتراض اُن دنوں سرلا دیوی کے افسانوں کے مجموعہ 'چاند بجھ گیا' کے عنوان پر بھی کیا گیا تھا۔ اور سوالیہ نشان لگانے کی دلیل پیش کی گئی تھی۔ ان دنوں ایک ہی گھر میں تین ادیبوں کرشن چندر۔ ان کے بھائی مہندر ناتھ اور بہن سرلا دیوی کی یک جا ایسی موجودگی بے مثال تصور کی گئی تھی۔ ڈاکٹر نسیم اختر کا مضمون 'تانیثی ادب اور چند نمائندہ شاعرات' بھی بے حد تحقیقی و معلوماتی ہونے کے موجب لائق مدح ہے۔ گزشتہ برسوں میں ممبئی کے ممتاز جریدہ 'شاعر' نے لکھنؤ کی ممتاز شاعرہ عذرہ پروین کا گوشہ ان کی غزلیات کے ساتھ بڑی آن بان سے رسالہ کے مدیر افتخار امام صدیقی کے مشافہ (انٹرویو) اور ملک کے بلند پایہ و مایۂ ناز ناقدان کے مقالوں کے ساتھ اس طرح شائع کیا گیا تھا، کہ وہ عین ان کے شانِ شایاں ہی قرار دیا گیا تھا۔ یہ شاعرہ دنیا میں تانیثی اہمیت و انفرادیت کے بارے میں اتنا وسیع و وقیع ادب و شاعری تخلیق کر چکی ہیں، کہ اس بہترین مقالے میں ان کی عدم موجودگی کھٹکنے والی رہی ہے۔ مضمون کے عنوان کے مطابق یہ شاعرہ 'چند' اور 'نمائندہ' شعرا میں آنے کی کاملاً مستحق بھی ٹھہرتی ہیں۔ 'آپ کی بات' کے تحت معزز مصطفی ندیم خاں غوری کے خط میں فیض احمد فیض کے مشہور شعر کے حوالے کے اول مصرعے میں۔ ''وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا' کی جگہ 'ذکر نہیں' لکھنا غلط ہے۔ محمد شکیل خاں کے خط کے اس صحیح اعلان و حقیقی امر سے میری طرح باقی تمام قارئین بھی صدفی صد متفق ہوں گے کہ ... 'اردو دنیا' کا ہر آئندہ شمارہ پیشتر سے مزید بہتر ہوتا ہے۔''

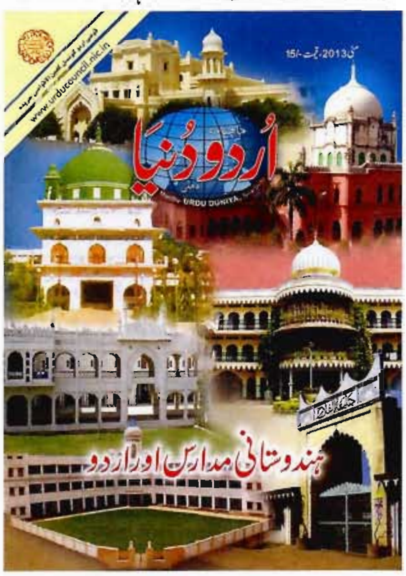

نصر ملک

کوپن ہیگن (ڈنمارک)

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ کیا ملا اک دبستاں کھل گیا۔ یوں تو اس شمارے میں شامل سبھی مضامین اور تخلیقات ایک سے بڑھ کر ایک ہیں لیکن 'ہندوستانی مدارس اور اردو' کے عنوان کے تحت شامل مضامین خاصے اہم ہیں اور

مصنّفین کی کاوشوں کو سراہا جانا چاہیے کہ انھوں نے اردو کے حوالے سے مدارس کی خدمات کو بڑی خوش اسلوبی سے سامنے لانے اور ان کے اثرات کو عیاں کرنے میں کافی سعی کی ہے۔ پروفیسر وسیم بریلوی سے 'گفتگو' بھی بہت اہم ہے۔ اور بین السطور بہت اہم نکات سامنے لاتے ہیں۔

دوسری زبانوں سے تراجم کا سلسلہ بہت اہم ہے اس سے دامن اردو میں وسعت کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ملیالم زبان پر اردو کے اثرات کے عنوان سے مضمون میرے علم میں مزید اضافہ کر گیا۔ 'عالمی اردو نامہ' تو کوزے میں سمندر بند ہے۔ یہ ایک بہت ہی مفید اور بہترین سلسلہ ہے کہ ہم سب اپنے ارد گرد دنیا بھر میں اردو کے حوالے سے ہونے والی پیش رفت سے آگاہ ہو پاتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے طول وعرض میں اردو کے حوالے سے ہونے والی کاوشوں کو سامنے لانے کے لیے 'اردو سے متعلق قومی وعلاقائی خبریں' کا کالم بھی بہت ہی معلوماتی ہے۔ مجھے جمہوریہ ہند کے مرکزی وزیر مواصلات شری سبل صاحب کی اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ ''اردو کو محض خوبصورت زبان کہہ دینا کافی نہیں بلکہ اسے نئی ٹکنالوجی سے جوڑنے کی بھی ضرورت ہے۔'' مجھے امید ہے کہ حکومت ہند مرکزی اور علاقائی سطحوں پر اس ضمن میں اپنا فرض پورا کرنے کے لیے اقدامات کرے گی۔

عبدالصمد
اے 212، رجنی گندھا، صداقت آشرم، پٹنہ (بہار)

مئی 2013 کے شمارے میں، شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی میں منعقد قومی سیمینار 'اردو ناول 1980 کے بعد' کے سلسلے میں روزنامہ 'انقلاب' دہلی کے حوالے سے ایک خبر شائع ہوئی ہے، اُس میں میرے تعلق سے اطلاع دی گئی ہے کہ میں نے سلمان رشدی کو قرۃ العین حیدر سے بڑا ناول نگار قرار دیا تھا۔ میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا اور نہ کبھی کہہ سکتا ہوں۔ میں سلمان رشدی کو ایک بڑا ناول نگار تسلیم ہی نہیں کرتا اور قرۃ العین حیدر سے تو ان کا موازنہ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ میں نے سلمان رشدی کو پڑھا ہے۔ اُن کے ہاں وہ دردمندی، وسیع النظری اور شعور کی گہرائی ملتی ہی نہیں جو قرۃ العین حیدر کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ طنزیہ پیرایہ اختیار کر کے تاریخ کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش سے کوئی بڑا ناول نگار نہیں بن سکتا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ سلمان رشدی کی شہرت کی وجہ صرف ان کا ادب نہیں، بلکہ وہ بہت کچھ ہے جس سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ پتہ نہیں 'انقلاب' کے نمائندے کو یہ غلط اطلاع کس نے دی۔ اُنھیں کم سے کم سیمینار کے منتظمین سے تصدیق کرنی چاہیے تھی۔ سیمینار میں بہت سے معزز افراد نے شرکت کی تھی اور ساری کارروائی رکارڈ کی گئی تھی۔

الحاج شفیق احمد
استاد مدرسہ انوار العلوم، رام نگر، ضلع بارہ بنکی (یوپی)

ماہ نامہ اردو دنیا مئی 2013 کے سرورق پر لکھا ہوا 'ہندوستانی مدارس اور اردو' نیز عالمی سطح پر شہرت یافتہ ہندوستانی مدارس کی چھپی خوبصورت تصویروں کے ساتھ شمارہ نظر نواز ہوا۔ ہماری بات کے موضوع پر مدیر صاحب نے اپنی بات کو بہت ہی مؤثر اور خوب صورت انداز میں قلمبند کیا ہے۔ تخیلات کی بلند پروازی حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو زندہ رکھنا ہے تو اردو زبان کو زندہ رکھنا ہوگا۔ ملک میں اردو کی ترویج وترقی نیز اس کی بقا کے لیے ہندوستانی مدارس کے کردار کو مزید مستحکم کرنے کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے 'ہندوستانی مدارس اور اردو' کو شمارہ کی کور اسٹوری کا موضوع بنا کر اردو کے تئیں مدارس کی بیش بہا خدمات سے عوام الناس کو روشناس کرانے کی جو نایاب کوشش کی گئی ہے۔ بہت ہی بہتر اور لائق ستائش ہے۔ کور اسٹوری میں شامل تمام مضامین کا انتخاب سمندر کو کوزے میں مقید کرنے کے مانند ہے۔ چونکہ مدارس اور مکاتب کے طلبا پرائمری سطح سے ہی لازمی طور سے اردو زبان کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس سرکاری یا غیر سرکاری اسکولوں میں پرائمری سطح پر اردو زبان کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ ہونا ایک طرح سے اردو زبان کی ساتھ سوتیلا برتاؤ کرنا ہے۔ کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک مدارس اسلامیہ کا بہت بڑا جال پھیلا ہوا ہے۔ ماضی حال اور فی الحال ہندوستانی مدارس اردو زبان میں لازمی طور سے درس وتدریس کا کام انجام دیتے آرہے ہیں۔ ملک میں آج جو اردو داں طبقہ نظر آرہا ہے یہ انھیں مدارس کی مرہون منت ہیں۔ ابتدا سے ہی مدارس نے اردو زبان کی بقا کے لیے مسلسل عملی طور پر جدوجہد کی ہے۔ اردو زبان کے فروغ وترقی کے معاون اسلامی مدارس کے کردار اور ان کی خدمات پر باقاعدہ کام کیے جانے کی ضرورت ہے۔ دیگر تمام مضامین بھی بہت خوب اور معلومات سے بھرپور ہیں۔ اردو دنیا کے تمام مضامین دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عبدالباری مسعود
جھا ہاؤس، بستی نظام الدین، نئی دہلی

ماہ نامہ اردو دنیا کا مئی 2013 کا شمارہ زیر مطالعہ رہا۔ آپ نے ایک اچھے موضوع پر خصوصی گوشہ شائع کیا۔ اس کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ تاہم اس حوالے سے بعض معروضات بھی پیش خدمت ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شمالی ہندوستان بالخصوص اردو کے گہوارہ اتر پردیش میں اردو زبان کو زندہ رکھنے میں دینی مدارس کا کلیدی کردار رہا ہے اور وہ آج بھی ہے۔ اس نکتے کو ابھارنے کی غرض سے بیشتر مضامین میں کچھ ایسی باتیں تحریر کی گئی ہیں جو حقائق سے علاقہ نہیں رکھتی ہیں۔ جس طرح 1857 کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کے ایک حلقے نے علم کے تصور اور دائرے کو محدود کر دیا یا اس میں تفریق کر دی (جسے آج کل کی اصطلاح میں سیکولرزم سے تشبیہ دی جاسکتی ہے) اسی طرح صاحبِ مضامین نے بھی مدرسے کے تصور کو محدود کر دیا ہے۔ 1866 میں دارالعلوم دیوبند کے قیام سے پہلے برصغیر ہند میں مدارس میں وہ تمام علوم و مضامین پڑھائے جاتے تھے جو اس زمانے میں مروج تھے۔ اس وقت دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں تھی جیسا کہ اسلام کی ازل سے تعلیم ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اردو کے عناصر خمسہ (سرسید، حالی، شبلی، محمد حسین آزاد اور مولوی عبدالحق) کا رشتہ بھی مدرسہ سے ہے، اس معنی میں تو صحیح ہے کہ وہ مدرسے کے فارغین تھے لیکن انھوں نے جن مدارس سے فراغت حاصل کی تھی وہ روایتی دینی مدارس نہیں تھے۔ سرسید نے دہلی مدرسہ سے تعلیم حاصل کی تھی اور مولوی ڈپٹی نذیر احمد اور آزاد نے بھی۔ تاج محل کا معمار (آرکی ٹیکٹ) استاد احمد لاہوری بھی ایک مدرسے کا فارغ تھا۔ چنانچہ مدارس کا ذکر کرتے وقت اس تفریق کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے اندر 1857 کے سانحہ کے بعد تعلیمی تفریق کی جو تحریکیں برپا ہوئیں اس نے انھیں خوب نقصان پہنچایا۔ جہاں تک برصغیر ہند میں اردو کے منظر نامے کا تعلق ہے وہ آزادی سے قبل بھی یکساں نہیں تھا اور آج بھی نہیں ہے۔ تاہم تقسیم ہند اور قومی سیاسی کشمکش کی کاری ضرب سب سے زیادہ کسی زبان پر پڑی تو وہ اردو ہی تھی۔ اتر پردیش میں اس پر شب خون مارا گیا۔ لیکن مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور کرناٹک میں اسے پھلنے پھولنے کا موقع میسر آیا۔ جہاں مسلمان بچوں کو اردو ذریعہ تدریس سے تعلیم حاصل کرنے کی

سہولت اول دن سے میسر ہے۔ کوئی بھی درخت اس وقت تک اپنا وجود قائم رکھتا ہے جب تک اس کی جڑوں کو پانی ملتا ہے۔ یوپی کے مسلمانوں نے حالات سازگار ہونے کے بعد اس طرف جتنی توجہ دینی چاہیے تھی وہ نہیں دی۔ آج ریاست کے مسلمانوں کی اکثریت یک لسانی گروہ سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنی مادری زبان سے نابلد ہے۔ ایک دوسرے مضمون میں یہ لکھا ہے کہ ہندی قومی زبان ہے۔ دراصل یہ ایک مغالطہ ہے۔ اس ملک میں اب بھی کوئی قومی زبان نہیں ہے۔ ہندی انگریزی کی طرح ایک سرکاری زبان یا راج بھاشا ہے۔

محمد عبدالعزیز سہیل

ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

ماہنامہ اردو دنیا مئی 2013 کا شمارہ حسب معمول یکم مئی سے دوروز قبل ہی موصول ہوا۔ سرورق دیدہ زیب اور اپنے اندر عظیم مقصد کو لیے ہوئے ہے۔ ہماری بات کے تحت مدیر اردو دنیا نے مدارس اسلامیہ کی اہمیت و افادیت کو واضح کیا ہے ساتھ ہی اردو کے تئیں مدارس کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ انھوں نے مدرسوں میں قومی کونسل کے تعاون سے فراہم کی جارہی کمپیوٹر کی تعلیم کا تذکرہ کیا ہے جو کہ موجودہ دور میں مدارس کے طلبہ کے لیے ٹکنالوجی سے استفادے کے لیے لازمی اور ضروری عنصر ہے۔ انٹرویو کے زمرے میں منتظر قائمی کے مظفر علی صاحب سے انٹرویو میں ان کی شخصیت اور زندگی کے اہم پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہوئی ساتھ ہی کونسل کے وائس چیرمین محترم پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کو حکومت اترپردیش نے گیارہ لاکھ روپے کے 'یش بھارتی سمان ایوارڈ' سے نوازہ جو ان کی اردو زبان و ادب کی خدمات کے ضمن میں بہترین صلہ ہے موصوف قابل مبارکباد ہیں۔ پروفیسر اخترالوسع بھی قابل مبارکباد ہیں جو پدم شری ایوارڈ سے نوازے گئے۔ انصاری شگفتہ کا مضمون 'اردو میں غیر مسلم خواتین کی نثری خدمات' اچھا ہے لیکن انھوں نے لکھا ہے کہ ''غیر مسلم اردو نثر نگار خواتین کی فکشن میں خدمات ناول، افسانہ نگاری پر مشتمل ہے'' میں اس بات سے اتفاق نہیں رکھتا۔ کیونکہ علاقہ دکن سے ڈاکٹر شیلا راج، اودیش رانی، پون کماری وغیرہ، غیر افسانوی نثر نگار ہیں۔ بہرحال اردو دنیا کے اس شمارے کے تمام ہی مشمولات اپنے اندر معلومات کا ذخیرہ لیے ہوئے ہیں۔

امتیاز عالم

کمرہ نمبر 241، پیریار ہاسٹل، جے این یو، نئی دلی

ماہ نامہ 'اردو دنیا' مئی 2013 کے سرورق پر لکھا ہندستانی مدارس اور اردو نیز چند نمائندہ مدرسے کی خوبصورت تصویروں کے ساتھ پیش نظر ہے۔ 'ہندستانی مدارس اور اردو' کے تحت چھ کور اسٹوری مختلف عنوانات پر مشتمل ہیں۔ 'ہندستانی مدارس اور اردو- ماضی، حال اور مستقبل' کے نام سے توقیر راہی صاحب کا مضمون بہت معلوماتی ہے، ملک گیر سطح پر مدارس میں اردو کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہت محنت اور جاں فشانی سے لکھا گیا مضمون ہے لیکن غور سے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون کا لب لباب کسی خاص تحریک سے وابستہ مدارس ہی ہیں جنھیں مطمح نظر بنا کر لکھا گیا ہو۔ اسی شمارہ میں 'مدارس اسلامیہ- اردو زبان کی تعلیم کا سب سے بڑا نیٹ ورک' کے عنوان سے خوشتر نورانی صاحب ایڈیٹر ماہ نامہ جام نور کا مضمون بھی شامل ہے۔ انھوں نے بہت اچھا لکھا ہے کہ اردو زبان کی تعلیم کا سب سے بڑا نیٹ ورک وہ غیر سرکاری ادارے ہیں جنھیں ہم مدارس کہتے ہیں۔ ان کے رسالے جام نور نے مدارس کی دنیا میں جدید اردو کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مدارس کے لوگ بے چینی سے اس رسالے کے منتظر رہتے ہیں۔ اردو زبان کی ابتدائی حروف شناسی مساجد اور ان سے ملحقہ مکاتب و مدارس کی تعلیم سے ہوتی ہے جہاں اردو کی تعلیم دینیات کے نام پر دی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی آبادی والے گاؤں اور شہری محلوں میں تقریباً 90 فیصد یا 95 فیصد مساجد قائم ہیں جن سے جڑی دینی تعلیم گاہیں بھی ہوتی ہیں۔ آج عام طور پر گاؤں اور شہروں میں بھی مسلم بچوں کا پہلا قدم تعلیم کے لیے انھیں اداروں کی طرف بڑھتا ہے۔ مزید تعلیم پانے کے لیے کسی دوسرے ادارے میں داخل ہوں، نہ ہوں لیکن اردو حروف شناسی کی سوجھ بوجھ ضرور پیدا ہوجاتی ہے۔ جس علاقے کا ماحول سیکولر اور ہندو مسلم بھائی چارے کا ہے، وہاں غیر مسلم بھی اس کی مٹھاس سے فیض اٹھا لیتے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کا اپنا کچھ نہیں ہوتا، سوائے اردو شعبہ کے، جہاں اردو کی تعلیم تو اعلیٰ درجے کی دی جاتی ہے اور شعر و ادب کی واضح شکل نظر آتی ہے، لیکن اردو کے تمام انتظامی امور دوسری زبان میں انجام پاتے ہیں، جس سے اسے اپنائیت کا احساس نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے فروغ میں مدارس کے کردار کو اب لوگ تسلیم کرنے لگے ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔

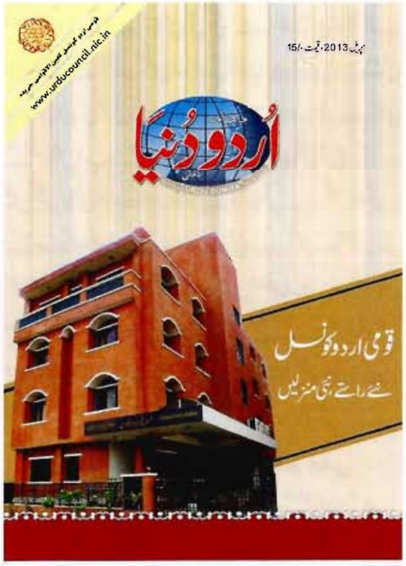

انجمن آرا انجم

حریم بالمقابل جٹاری ہاؤس، دودھ پور، علی گڑھ

'اردو دنیا' میرے مطالعے میں ہے جس کا سرورق حسین رنگوں کے امتزاج سے مزین سادہ مگر بے حد پرکشش ہے۔ خطوط کی تعداد سے 'اردو دنیا' کی غیر معمولی مقبولیت اور ہردلعزیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو کے فروغ اور بقا کے لیے مختلف سطحوں پر آپ کی سربراہی میں قومی کونسل جو کاوشیں، کوششیں، محنتیں جس جذبے اور لگن سے کررہی ہے، انشاءاللہ اس کے انتہائی مفید نتائج نکلیں گے اور اردو زبان دنیا کی ایک طاقتور زبان بن کر لوگوں کے دل و دماغ پر چھا جائے گی۔ قومی کونسل اپنی کاوشوں کے لیے قابلِ ستائش ہے۔ محترمہ سیدہ جعفر کا انٹرویو خاصا دلچسپ اور معلوماتی ہے جو ان کی ذہانت، علمیت اور اہلیت کا آئینہ دار ہے۔ جہاں تک دیگر مضامین اور تراجم کا تعلق ہے مواد اور زبان و بیان کے اعتبار سے معیاری اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ اردو زبان و ادب سے متعلق سیمیناروں، کانفرنسوں، ورکشاپ، تبصرے، علاقائی، صوبائی، ملکی اور غیر ملکی خبروں اور رپورٹوں سے 'اردو دنیا' اپنے دامن میں معلومات کا غیر معمولی خزانہ سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ بہت جلد قومی کونسل بچوں کا ماہنامہ جاری کرنے والی ہے۔

نور شاہ

صدر اردو اکادمی جموں کشمیر

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ (اپریل 2013) ایک نئی عظمت ایک نئی تصویر ایک نئے شعور اور ایک نئے احساس کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ اس شمارے میں اردو کونسل کی اَن گنت تصویروں کی بڑی خوبصورتی اور

معلوماتی انداز سے عکاسی کی گئی ہے۔ مضامین کا انتخاب لاجواب ہے، مختلف علمی اور ادبی شخصیات کے بارے میں پڑھ کر ان کی تخلیقی قوت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ اُن کے مخصوص لب و لہجے میں جو جمال ہے وہ واقعی آج کے دور میں بھی بڑی اہمیت اور افادیت کا حامل ہے۔ فکر و اظہار کے حدود کو انھوں نے وسعت دی ہے۔ فلم، سائنس اور صحت کے تعلق سے مضامین گوناگوں معلومات سے مالا مال ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے اردو کونسل جو کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہے وہ قابل تعریف ہے۔

الحاج ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد

اپریل 2013 'اردو دنیا' وقت پر ملا، شمارے میں سرورق پر فروغ اردو بھون کی عمارت کی تصویر شائع ہوئی یعنی NCPUL کی اردو زبان و ادب کے تعلق سے خدمات کا اظہار ہے۔ اردو دنیا نے زبان و ادب کے ساتھ ملک و ملت کی سماجی، تہذیبی، ثقافی، تجارتی، اقتصادی، روحانی اور سیاسی خدمات اپنے مضامین و مشتملات کے ذریعے انجام دے رہا ہے۔ اردو دنیا اور NCPUL آج جس نہج پر خدمات انجام دے رہا ہے اس کا اثر انشاء اللہ دیرپا اور دوررس و دائمی ہوگا۔ اردو کی ممتاز نقاد و محقق پروفیسر سیدہ جعفر کا انٹرویو جس کو سردار سلیم نے لیا ہے معلومات سے مزین ہے۔ اس انٹرویو سے پروفیسر صاحبہ کے خاندانی شجرہ حسب و نسب اور تعلیم و تربیت کے علاوہ موصوفہ کی ادبی خدمات کا ادراک و بصیرت ہمیں حاصل ہوتی ہے۔ زبان کی موت میں صحیح کہا گیا کہ اگر لوگ زبان کو اپنانا اور استعمال کرنا چھوڑ دیں تو مر جائے گی۔ ڈاکٹر فضل اللہ مکرم نے اپنے مضمون میں سب ایڈیٹر ایک گمنام صحافی میں سب ایڈیٹر کی محنت شاقہ، مشقت کی طرف اشارہ کیا ہے محنت کوئی کرتا ہے پھل کسی کو مل جاتا ہے لیکن صحافت میں Team Spirit اور Team Work ضروری ہے۔

سمیع الدین شاداب

(رامپور)

'اردو دنیا' کے اپریل 2013 کے شمارے کی کور اسٹوری سے متعلق مضامین اس لیے زیادہ اہم ہیں کہ اس سے ہمیں کونسل کی سرگرمیوں اور کئی اسکیموں کا علم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ معلومات کہیں اور سے اتنی صحیح اور بہتر حاصل نہیں ہوسکتی تھیں۔ 'اردو دنیا' میں شائع ہونے والے مضامین زیادہ تر معلوماتی اور جدید تقاضوں سے بھرپور ہوتے ہیں اور یہی چیز 'اردو دنیا' کی انفرادیت بناتی ہے۔ بچوں کے رسالے کے بارے میں پڑھا۔ سخت کام ہے لیکن آپ جیسے مخلص اور محنتی شخص کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہوتا۔

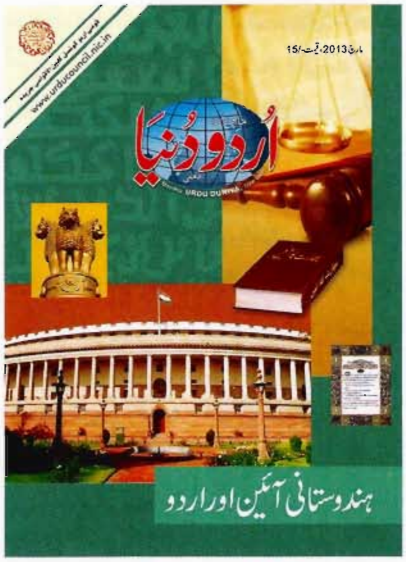

ڈاکٹر رضوانہ ارم

صدر شعبہ اردو، جمشید پور، ویمنس کالج

مارچ 2013 کا 'اردو دنیا' باصرہ نواز ہوا۔ 'اردو دنیا' کی ادبی، علمی، تہذیبی، سائنسی و ٹکنالوجی، بچوں کی اردو دنیا کھیل اور صحت کی موثر قابلِ رشک سرگرمیاں روز افزوں ترقی پر ہیں۔ آپ نے جس حسن و خوبی کے ساتھ تمام تر موضوعات کو ایک ادبی جریدے میں سمیٹا ہے اس کی داد نہ دینا ادبی حق تلفی اور بدذوقی ہوگی۔ 'اردو دنیا' کا ہر نیا شمارہ بطور خاص آپ کا اداریہ اور آپ کی بات کے حوالے سے پیش کی جانے والی باتیں دعوت فکر و غور دیتی ہیں۔

رضوان انصاری

روزگار بھون، بانس منڈی، چار باغ، لکھنؤ

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ مارچ 2013 نظر نواز ہوا۔ جریدہ ظاہری اور باطنی نیز صوری و معنوی محاسن کا گنجینہ ہے۔ طباعت، سرورق نہایت اعلیٰ معیار اور کاغذ بہت خوب ہے۔ تمام تر شعری و نثری تخلیقات اور اردو دنیا کی خبریں لائق صد تحسین ہیں۔ البتہ اسی شمارے میں ڈاکٹر کوثر رسول کا مقالہ 'اقبال فلسفہ سے مذہب تک' نہایت افسوس ناک بھی زیر مطالعہ آیا۔ اس ضمن میں پروفیسر محمود الٰہی کے ایک انٹرویو کا ایک جملہ یاد آیا کہ آپ نے فرمایا کہ ''جو عربی اور فارسی سے نابلد ہے اسے اردو کے کلاسیکل ادب پڑھانے کا حق نہیں۔''

ڈاکٹر کوثر رسول کشمیر یونیورسٹی میں اردو شعبے میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں موصوفہ اپنے متذکرہ مقالہ میں رقم طراز ہیں:

''اسی طرح ایک عربی مقولہ ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ۔'' محترمہ یہ عربی کا مقولہ نہیں بلکہ حدیث پاک ہے۔ حدیث پاک کو عربی مقولہ تحریر کرنا کس قدر افسوس کی بات ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی حدیث پاک پر مبنی ہے جسے علامہ نے خودی/ بے خودی کا نام دیا ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا 'ستیہ پال آنند' سے انٹرویو معلومات افزا ہے۔ ڈاکٹر معصوم شرقی کا مراسلہ لائق عمل ہے۔ کاش مرکزی اور صوبائی حکومتوں کا شعور بیدار ہوجائے اور فنکاروں کو اعزازات وایوارڈس 40 سال سے 60 سال عمر سے قبل ہی عطا کردیں جس سے وہ اس رقم سے کوئی کار خیر انجام دے سکیں۔ ظفر اللہ انصاری کا مضمون 'مومن کی شخصیت'، 'مغربی بنگال میں اردو: محمد زاہد'، شمس الرحمان فاروقی کا مقالہ 'حنیف نقوی کی جاسوسیاں' بہت اہم مقالے پڑھنے کو ملے۔

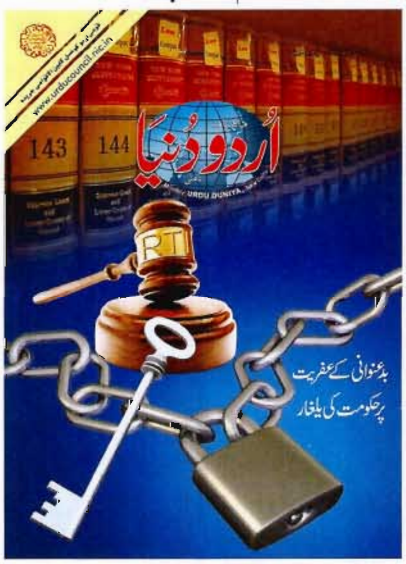

معین الدین شمسی

اسلامیہ مڈل، اسکول، گریڈیہہ 815301

جنوری 13 کا شمارہ تاخیر سے موصول ہوا۔ سرورق پر 'بدعنوانی کے عفریت پر حکومت کی یلغار' دیکھتے رہنے کی بات ہے۔ بلاشبہ بدعنوانی ایسا مرض ہے جو کسی بھی جمہوریت کو بے معنی اور کھوکھلا بنا دیتا ہے۔ (RTI) رائٹ ٹو انفارمیشن ایکٹ کا نفاذ جمہوری ہندوستان کی تاریخ کا وہ انقلابی عمل ثابت ہوا ہے۔ سارے مشمولات اچھے ہیں۔ صحت کے تحت مشرف علی کا 'Blood Pressur' فاروق ارگلی کا 'ہلال سیوہاروی' اور NCPUL کا خبرنامہ قارئین کے لیے اکسیر اعظم ہے۔ راجیش ریناؔ، شکیل شمسی، سید فیصل علی اور ڈاکٹر اطہر فاروقی سے نصرت ظہیر کے انٹرویو قابل صد ستائش ہیں۔ ◘

اردو میں ایسے افسانے بھرے پڑے ہیں جن کا رنگ آفاقی ہے: شموئل احمد

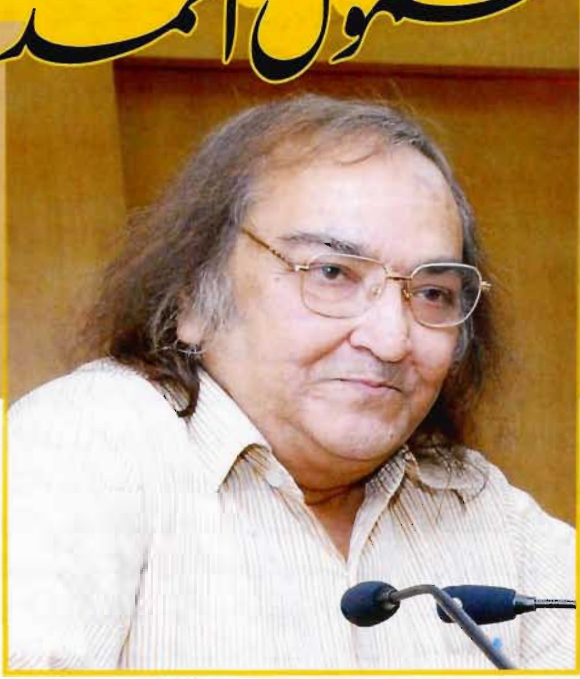

رفیق جعفر

شموئل احمد عصری افسانوی ادب کا ایک معتبر نام ہے۔ ہمعصر افسانہ نگاروں میں یہ اپنی منفرد سوچ، بیباکی اور اسلوب کی تازگی کی وجہ سے اپنا ایک الگ مام رکھتے ہیں۔ علم نجوم اور جنسی پہلوؤں کا اظہار ان کے افسانوں کا خاصہ ہے۔عنکبوت، ظہار، اونٹ، سراب جیسی تخلیقی کہانیاں افسانوی ادب میں اضافہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ افسانہ 'سنگھادان' کی پسندیدگی اور مقبولیت شموئل احمد کی شناخت ہے۔٠ تین افسانوی مجموعے اور دو ناول شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی زبان کے قارئین بھی ان کے فکشن کے قائل ہیں۔ 'اکیس سریشٹھ کہانیاں' ڈائمنڈ پاکٹ بکس نے ہندی میں شائع کیں۔ پنجابی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی ان کے افسانوں کے ترجمے ہوچکے ہیں۔ شموئل احمد ایک کامیاب مترجم بھی ہیں۔ ساھتیہ اکادمی نے گجراتی ناول 'کنواں' کا ترجمہ ان ھی سے کروایا ھے۔ انھوں نے دور درشن کے لیے ٹیلی فلمیں بھی لکھی ھیں۔ان دنوں 'کشف النجوم' کی تصنیف میں مصروف ھیں۔ ساتھ ھی ان کی ٹیلی فلم مرگ ترشنا بھی تکمیل کے آخری مراحل میں ھے۔ شموئل احمد ویسے رھتے تو پٹنه (بھار) میں ھیں لیکن اکثر وہ تلے گاؤں (پونه) اپنے بیٹے کے پاس آتے رھتے ھیں۔ پیش ھے تلے گائوں (پونه) میں ان سے اردو دنیا کے لیے لیے گئے انٹرویو کے اقتباسات

رفیق جعفر: سنگاردان سے افسانوی دنیا میں آپ کی پہچان بنی۔ یہ افسانہ خاص و عام میں مقبول ہوا۔ لیکن اس کے بعد شاید ہی آپ کے کسی اور افسانے کے اتنے چرچے ہوئے ہوں۔ اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

شموئل احمد: میری پہچان بگولے سے بنی۔ بگولے میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ تھا سنگاردان نے ادب میں میری حیثیت مستحکم کی۔ بگولے 67 میں تحریک میں چھپا تھا۔ میں نے اس زمانے میں بھی جدیدیت سے دامن بچایا۔

74 تک میرے افسانے ماہنامہ تحریک میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے بعد 17 سال کا لمبا وقفہ آیا جب میں نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ میں سمجھتا ہوں اتنی لمبی خاموشی کسی ادیب کی زندگی میں نہیں آئی ہوگی۔ 73 کے بعد میری واپسی 90 میں سنگاردان کے ساتھ ہوئی۔ سنگاردان کے مقبول ہونے کی وجہ افسانے کی انوکھی ہیئت اور منفرد اسلوب ہے۔ بہ قول بلراج کومل سنگاردان سے اردو افسانے میں بیانیہ کی واپسی ہوئی ہے۔ لیکن یہ عام بیانیہ بھی نہیں ہے۔ اس میں فنتاسی کا رنگ بھی غالب ہے اور لہجہ بہت بے باک ہے۔ افسانے کے مقبول ہونے کی وجہ اس کا موضوع بھی ہے۔ ان دنوں بابری مسجد کا انہدام ہوا تھا۔ مجھے اس بات کا شدّت سے احساس ہوا تھا کہ ایک فرقے کو اس کی وراثت سے محروم کر دینے کی سازش ہوئی ہے۔ ان دنوں ہی میرے وطن بھاگلپور میں فساد ہوا۔ میں وہاں ریلیف کیمپ میں گیا تھا جہاں ایک طوائف نے رو روکر اپنا قصہ بیان کیا تھا کہ کس طرح اس کا موروثی سنگاردان لوٹا گیا جس میں اس کی نانی اپنا عکس دیکھتی تھی اور پھر اس کی ماں اور اب وہ خود بناؤ سنگار کرتی تھی اور گاہکوں کا دل لبھاتی تھی۔ وہ یہ کہتے نہیں تھکتی تھی کہ اس کا سنگاردان موروثی تھا اور اس سے اس کی موروثی چیز چھین لی گئی۔ میں نے اسی وقت سوچا تھا کہ پروٹسٹ درج کروں گا۔

ر ج: یہی وجہ ہے شموئل صاحب کہ اس خیال کی ترسیل بہت شدّت سے افسانے میں ہوئی ہے۔ مجھے یاد ہے افسانے کا ایک منظر جب لٹیرا سنگاردان لوٹنے کے بعد یہ سوچ کر خوش ہوتا ہے کہ نسیم جان بھلے ہی اس سے اچھا سنگاردان خرید لے لیکن یہ موروثی چیز تو اس کو ملنے سے رہی۔

شموئل احمد: جی بالکل! یہ سوچ کر بھی اس کو لذت ملتی ہے کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہے جو ایک فرقے کو اس کی وراثت سے محروم کر دینے کی سازش میں لگے ہیں۔

ر ج: لیکن آپ کے دوسرے افسانوں کے اتنے چرچے کیوں نہیں ہوئے؟

شموئل احمد: کوئی چیز جب ہٹ ہو جاتی ہے تو لوگ اسی رنگ میں چیزوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ خود سنگاردان کا چرچہ سنگاردان کے پس منظر میں نہیں ہوا۔ کسی نے وراثت والی بات سمجھی ہی نہیں نہ بابری مسجد کے پس منظر میں اس کہانی کا تجزیہ ہوا۔

ر ج: آپ کا ہر افسانہ آپ کی تخلیقی زبان اور منفرد اسلوب کی وجہ سے قاری سے پڑھوا لیتا ہے۔ شروع میں یہ بات نہیں رہی ہوگی۔ بنتے بنتے بات بنی ہوگی۔ اس پر کچھ روشنی ڈالیں۔

شموئل احمد: کوئی بھی افسانہ اسلوب کی وجہ سے ہی اپنے کو پڑھواتا ہے بلکہ اگر افسانے کی شروع کی عبارت قاری کو گرفت میں نہیں لیتی تو قاری اسے پڑھنا بھی نہیں چاہے گا۔ میں نے کبھی کسی کے رنگ میں خود کو رنگنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی انفرادیت پر زور دیا ہے۔ بڑا ادیب بننے سے اچھا ہے منفرد ادیب ہونا۔ افسانے کی زبان اگر تخلیقی نہیں ہے تو خود افسانے کے ساتھ انصاف نہیں کرتی۔ تخلیقیت یہی ہے کہ افسانے کے پس منظر سے افسانے کی زبان ہم آہنگ ہو بلکہ افسانے کی زبان ایک ذرا کھردری ہونی چاہیے۔

ر ج: آپ کے فکشن میں مرکزیت یا اہمیت طرح طرح کی عورتوں کی ہی ہوتی ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

شموئل احمد: عورت تو کائنات کے مرکز میں ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ! تو مجھے بھی رنگ و بو کے مختلف شیڈس کی تلاش رہتی ہے۔

ر ج: اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک کے اردو فکشن میں سیکس کے موضوع کو برتنے کا انداز آپ کا اپنا ہے۔ اس انفرادیت کے باوجود آپ شعوری یا لاشعوری طور پر منٹو اور عصمت کی کہانیوں کے کرداروں سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟

شموئل احمد: بالکل سچ نہیں ہے۔ منٹو اور عصمت کی کہانیوں کے کردار میرے یہاں نہیں ملتے۔ وجہ یہ ہے کہ منٹو کا مسئلہ کچھ اور تھا میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔

رج: کیسے نہیں ملتے؟ منٹو نے طوائفوں پر کہانیاں لکھیں آپ کے یہاں بھی طوائف ہے۔ منٹو اور عصمت نے جنس نگاری کی آپ بھی جنس نگاری کے لیے مشہور ہیں۔

شموئل احمد: آپ کو میری کس کہانی میں طوائف نظر آئی؟

رج: سنگھاردان میں نسیم جان ہے۔ بدلتے رنگ میں میں رکمنی بائی ہے۔

شموئل احمد: سنگھاردان میں طوائف ہے لیکن کہانی طوائف کی نہیں ہے۔ کہانی طوائف کے سنگھاردان کی ہے جہاں خود سنگھاردان ایک کردار بن گیا ہے۔ میں نے طوائف کی اس طرح کردار نگاری نہیں کی ہے جس طرح منٹو نے کی ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ بتاؤ نسیم جان کیسی تھی تو آپ کچھ نہیں کہہ سکتے سوائے اس کے کہ سنگھاردان لٹنے پر روتی تھی۔ نسیم جان تو سنگھاردان میں جذب ہو کر پس منظر میں چلی گئی ہے۔ یہ سنگھاردان ہے جو نسیم جان کو باہر نکالتا ہے اور اس کے جلوے دکھاتا ہے۔ لیکن ہتک کی سوگندھی کے بارے میں پوچھا جائے تو آپ تفصیل سے بتا سکتے ہیں کہ اس کا کردار کیسا ہے۔ بدلتے رنگ کی رکمنی پر بدلتے حالات میں اس پر ایک عام فرقہ پرست عورت کا رنگ غالب ہو چکا ہے۔ عصمت کی کہانیوں کے کردار بھی مختلف ہیں اور ان کو جنس نگار کہنا بھی غلط ہوگا۔ عصمت تو لحاف لکھ کر بدنام ہو گئیں ورنہ ان کا فن 'چوتھی کا جوڑا' میں نظر آتا ہے۔ وہ متوسط طبقے میں عورتوں کی زبوں حالی کی عکاسی کے لیے جانی جاتی ہیں۔

رج: ابھی آپ نے کہا کہ منٹو کے مسائل کچھ اور تھے اور ہمارے مسائل کچھ اور ہیں۔ اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

شموئل احمد: منٹو نے غلام ہندوستان میں آنکھیں کھولی تھیں ہم نے آزاد ہندوستان میں آنکھیں کھولیں ہیں۔ منٹو کا مسئلہ تھا نیا قانون اور ٹوبہ ٹیک سنگھ، ہمارا مسئلہ ہے سنگھاردان اور مہاماری۔ منٹو منگو کوچوان کے ہاتھوں انگریزوں کو پٹوا سکتا تھا ہم اپنا غبار کس پر نکالیں؟ منٹو انگریزوں کا غلام تھا ہم اپنے سیاست دانوں کے غلام ہیں۔ منٹو کے لیے جمہوریت کا مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن ہمیں جمہوریت میں حسن کے بدلے داغ ملا ہے۔ جمہوریت کی پری بیٹھ گئی ہے بالا خانے پر اور اٹھائی گیرے سے ہم بستر ہوتی ہے، جمہوریت میں روز جرائم کے عناصر کھل رہے ہیں اور ہم کتے کی طرح زنجیر سے بندھے۔ دیکھتے رہتے ہیں۔ کرپشن کی مہاماری ہر طرف پھیل گئی ہے اور ہم کیا کر سکتے ہیں سوائے اس کے کہ پروٹسٹ درج کریں۔ میرا ناول مہاماری آج کے سیاسی نظام کے خلاف پروٹسٹ ہے۔ منٹو کے زمانے میں فرقہ وارانہ فساد ایک حادثہ ہوتا تھا جو کہیں رونما ہو جاتا تھا۔ اس وقت کی کہانیاں فساد کی خون ریزی اور ظلم و ستم کی داستان بیان کرتی تھیں لیکن آج فساد کی نوعیت بدل گئی ہے۔ آج فساد حادثہ نہیں ایک منصوبہ ہے جو نافذ کیا جاتا ہے۔ فساد آج ایک سیاسی نظریہ ہے جو اقلیت کے گرد گھومتا ہے۔ اقتدار میں آنا ہے تو اقلیت کی گردن مارو اور اقتدار میں آنا ہے تو اقلیت کی گردن بچاؤ۔

رج: مجھے آپ کی کہانی یاد آتی ہے۔ ..'القمبوس کی گردن'

شموئل احمد: جی ہاں! میں نے اس کہانی میں یہی کہنا چاہا ہے کہ آج کے سیاسی نظام میں اقلیت کی گردن القمبوس کی گردن ہے جس پر تلوار ہمیشہ لٹکتی رہتی ہے۔ آج کا اردو ادیب عدم تحفظ کے احساس سے گھرا ہے۔ خوف ہماری سائکی کا ایک حصّہ ہے۔ سب سے بڑا خدشہ ہے کہ ہم اپنی وراثت سے محروم کیے جا رہے ہیں۔ آج کی کہانیوں میں فساد کی بربریت کا ذکر کم ہے بلکہ فساد سے جو حالات پیدا ہوئے ہیں اور جس طرح کے مسائل کا سامنا ہے ہم اس کا بیان کرتے ہیں۔

رج: آپ کچھ مثالیں دیں گے؟

شموئل احمد: اشرف کی آدمی، حسین الحق کی نیو کی اینٹ عبدالصمد کی انہونی، غضنفر کی خالد کی ختنہ اور سلام بن رزاق ساجد رشید طارق چھتاری وغیرہ کی کہانیوں میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے۔ شفق تو خوف میں جیا اور خوف میں مر گیا۔ اشرف کے یہاں تو خوف اپنے عروج پر نظر آتا ہے کہ پھاوڑا لے کر زمین پر جھکے ہوئے مزدور کو بھی ہم اپنا قاتل سمجھ بیٹھتے ہیں اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ حسین کے سلامت علی کا مسئلہ ہے کہ نیو کی اینٹ کا کیا کرے جو اس کو تھوپ دی گئی ہے۔ صمد کو پریشانی ہے کہ وہ اپنی وراثت کس طرح بچائیں تو وہ آبا و اجداد کی اخلاقی قدروں سے کام لینا چاہتے ہیں۔ غضنفر کا بچّہ ختنہ کرانے سے ڈرتا ہے کہ پہچان لیا جائے گا اور مارا جائے گا۔ آج منٹو ہوتے تو ..کھول دو نہیں لکھتے بلکہ اسی قسم کی کہانیاں لکھتے جو ہم لکھ رہے ہیں۔

رج: منٹو کی جنس نگاری میں لذّتیت نہیں ہے لیکن آپ کے یہاں لذّتیت ہے جو عیب ہے۔ کیا آپ تسلیم کریں گے؟

شموئل احمد: لذّتیت تو ہونی ہی چاہیے۔ میں اسے فن مانتا ہوں۔ یہ سوال ایسا ہی ہے کہ آپ اپنے جوان بیٹے کی شادی کریں اور اسے تنبیہ کریں کہ شبِ عروسی تو مناؤ لیکن لذّت نہیں اٹھانا۔ جنس نگاری کے بیان میں اگر کردار جنسی عمل سے گزر رہا ہے تو جنس کی جولانیاں اور جو لہریں اس کے وجود میں اٹھ رہی ہیں اگر قاری اس کا حصّہ نہیں بنتا اور ان لہروں کو محسوس نہیں کرتا جس سے کردار گزر رہا ہے تو میں اسے بیانیہ کا نقص مانتا ہوں۔ بلکہ ایسی عبارت پڑھتے ہوئے خود کاغذ میں وہ پھڑ پھڑاہٹ اور تھرکن محسوس ہونی چاہیے جو کٹے ہوئے زندہ گوشت کے ریشوں میں ہوتی ہے اور منٹو کے یہاں خوب لذّتیت ہے اور یہی اس کا فن ہے۔ جو کہتے ہیں کہ لذّتیت نہیں ہے وہ دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں۔

رج: ندی آپ کا شاہکار ناول ہے۔ اسے لکھنے کا خیال آپ کو کیوں اور کن حالات میں آیا اور آپ نے اسے کتنے دنوں میں مکمل کیا۔

شموئل احمد: ندی میری ایک دوست کی کہانی ہے۔ وہ بہت انٹلکچوئل قسم کی لڑکی تھی اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ نئی نئی کتابوں کا علم مجھے اس کے ذریعے بھی ہوتا تھا۔ اس سے سیکس کے موضوع پر بھی کھل کر گفتگو ہوتی تھی۔ اس کی جب شادی ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ شوہر کی پیٹھ سے لگ کر سونا چاہتی ہے لیکن وہ اس کا ہاتھ جھٹک دیتا ہے کہ ڈسٹرب نہ کرے۔ اس بات سے اس کو روحانی تکلیف پہنچتی رہی اور اس کو یہی محسوس ہوا کہ وہ استعمال کرنے کی چیز ہے۔ شوہر اس سے پیار نہیں کرتا ہے بلکہ اپنی سہولت کے مطابق اس کا استعمال کرتا ہے۔ تو ندی اسی کی کہانی ہے۔

رج: کیا وجہ ہے کہ فکشن کے نقّادوں نے آپ پر کبھی کھل کر نہیں لکھا اور پوری توجہ نہیں دی جب کہ مدیران جرائد اور قارئین نے آپ کو کھل کر سراہا۔

شموئل احمد: اردو کا ناقد اپنے محلّے والوں پر لکھتا ہے یا ان پر جو ان کی لابی میں ہوتے ہیں۔ میں کسی لابی میں نہیں ہوں، کسی ناقد کو کبھی گھاس نہیں ڈالی۔ کسی کو کبھی خط نہیں لکھا۔ پھر بھی جو جینوئن ہیں میں ان کی قدر کرتا ہوں لیکن میرا اصل ناقد ہے میرا قاری۔ مجھے ان سے ہی تحریک ملتی ہے۔

رج: آپ کا افسانہ ہو کہ ناول سماجی سیاسی سائنسی ترقی اور تبدیلی کا ساتھ دیتا نظر آتا ہے۔ اپنے ہم عصروں میں یہ بات آپ کن افسانہ نگاروں کے پاس پاتے ہیں یا کن افسانہ نگاروں میں یہ امکانات آپ کو نظر آتے ہیں؟

شموئل احمد: فکشن اپنے عہد کی تصویر ہوتا ہے۔ زمانے میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کی جھلک ادب میں ملے گی۔ سائنس فکشن کی ایسی کوئی روایت اردو میں ہے نہیں۔ بلکہ جاسوسی ادب اور سائنسی فکشن کو اردو ادب میں ابھی تک وہ مقام بھی نہیں ملا ہے۔ پھر بھی سائنس اور گلوبلائزیشن کا اثر ادب میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔

رج: مجموعی طور پر ہمارا اردو افسانہ عالمی سطح پر آپ کو کہاں نظر آتا ہے؟

شموئل احمد: اردو افسانہ عالمی ادب سے آنکھیں ملاتا ہے۔ اسلوبیاتی سطح پر بھی اور فنّی سطح پر بھی۔ اردو میں ایسے افسانے بھرے پڑے ہیں جن کا رنگ آفاقی ہے۔ کرشن چندر کا آدھے گھنٹے کا خدا غلام عباس کی آنندی

حیات اللہ انصاری کی آخری کوشش منٹو کی کھول دو اقبال مجید کی دو بھیگے ہوئے لوگ وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جو کسی بھی ملک اور قوم کے کلچرل پس منظر میں اپنی پہچان بنائے رکھتی ہیں۔ سلام کی کہانی یک لویتہ کا موازنہ میں البیئر کاموکی کہانی دارو سے کروں گا بلکہ سلام کی کہانی اس معنی میں بھاری پڑتی ہے کہ دارو حکمراں طبقے کے آگے بے بس ہے جب کہ سلام کا یک لویتہ حکمراں طبقے سے آنکھیں ملاتا ہے اور خود کو استحصال سے بچاتا ہے۔ میجک ریلزم ہمارے یہاں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ انتظار حسین سریندر پرکاش نیّر مسعود انور قمر اور انیس رفیع وغیرہ کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ صمد کی کہانی گومڑ اور ساجد رشید کی کہانی مردہ سر کی حکایت میں میجک ریلزم سے کام لیا گیا ہے جس میں فکشن اور حقیقت آپس میں اس طرح گڈ مڈ ہیں کہ انھیں آسانی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسٹریم آف کانشسنیس کی تکنیک حسین اور ذوقی کے یہاں بھی ملتی ہے۔ حسین منجھا ہوا فن کار ہے اور ذوقی اپنی نسل کا ذہین افسانہ نگار ہے۔ لیکن اردو عالمی سطح پر جیکٹ نہیں ہو سکی ہے۔ اردو کی بستیاں پوری دنیا میں بکھری پڑی ہیں لیکن بستی کے لوگ خود تک ہی محدود ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اردو کہانیوں کا زیادہ سے زیادہ تراجم غیر ملکی زبانوں میں ہوتا اور گلوبل سطح پر اسے پھیلایا جاتا۔

ر ج: کہتے ہیں اکیسویں صدی فکشن کی ہے شاعری کی نہیں۔ یہ عالمی معاشرے کا خود ساختہ فیصلہ ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

شموئل احمد: شاعری تو خدا کی زبان ہے۔ خدا کو کوئی صحیفہ اتارنا ہوتا ہے تو شاعری سے کام لیتا ہے۔ لیکن فکشن کا دور تو ہمیشہ رہا ہے۔ بیسویں صدی بھی فکشن کی صدی تھی۔

ر ج: اردو فکشن میں علم نجوم کی شمولیت کا سہرا آپ کے ہی سر جاتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ آپ سے پہلے کسی اور نے یہ تجربہ کیا تھا؟ انگریزی یا ملکی یا غیر ملکی زبانوں میں ایسے ناول یا افسانے لکھے گئے۔

شموئل احمد: اردو افسانے میں میں نے ہی پہلی بار علم نجوم کی اصطلاحوں کا استعمال کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مجھے علم نجوم سے گہرا شغف ہے۔ میرے اندر دو شخصیتیں ہیں۔ ایک نجومی اور دوسرا فکشن نگار۔ دونوں میں جنگ ہوتی رہتی ہے۔ دونوں لہولہان رہتے ہیں لیکن مرے گا کوئی نہیں ... مرتا ہوں میں۔ جب فکشن نگار حاوی ہوتا ہے تو افسانے لکھتا ہوں جب نجومی حاوی رہتا ہے تو ستارے دیکھتا رہتا ہوں۔ میری دیرینہ خواہش ہے علم نجوم پر ایک بھاری بھرکم گرنتھ لکھنے کی۔ میں نے جو بھی مطالعہ کیا ہے اور جو میرا مشاہدہ ہے میں اسے اردو قاری کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ انگریزی ادب میں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ ڈبلو بی ایٹس اور ٹی ایس ایلیٹ کو ٹیرو کارڈ سے دلچسپی تھی۔ جرمن ادیب ہرمن ہیس بھی نجومی تھے۔

ر ج: تقسیم کے بعد سے ہندو پاک کے اردو فکشن سے کیا آپ مطمئن ہیں؟

شموئل احمد: تقسیم ہند کے بعد برّصغیر میں اردو فکشن نے نئی جہتوں میں سفر کیا ہے۔ ہمارے مسائل قریب قریب ایک جیسے رہے ہیں لیکن پاکستان کو جمہوریت راس نہیں آئی۔ فوجی نظام کے جبر کے خلاف پروٹسٹ درج کرنے کے لیے اظہار کے نئے وسیلے درکار تھے۔ وہاں علامتی ادب کا چلن بڑھا اور انتظار حسین نے داستانی اسلوب کی داغ بیل ڈالی۔ علامتی اظہار بیان انتظار حسین کی فنی ضرورت تھی لیکن سریندر پرکاش کی یہ نفسیاتی ضرورت تھی۔ اپنے کو زیادہ سے زیادہ منفرد بنانے کے لیے۔ سریندر پرکاش تجریدیت پر اتر آئے لیکن ان کے یہاں نثری آہنگ ہے۔ اس لیے ان کی کہانیاں خود کو پڑھوا لیتی ہیں۔ ہندوستان کے ادیب عدم تحفظ کے احساس سے گھرے رہے اور پاکستان میں کلچرل شناخت کا مسئلہ بنا رہا۔ مجموعی طور پر ہندوستان میں بہتر کہانیاں لکھی گئیں اور پاکستان میں بہتر شاعری ہوئی۔

ر ج: سرکاری اور غیر سرکاری ادبی رسائل بہت شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے معیار اور مقصد کے بارے میں کچھ عرض کریں۔

شموئل احمد: سرکاری رسائل کی اپنی ایک حد ہوتی ہے اس لیے ان کے معیار کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ان کا مقصد سرکار کی پالیسی کی حمایت ہے۔ غیر سرکاری رسائل زیادہ تر گروہ بندی کے شکار ہیں اس لیے اونچا معیار قائم نہیں کر سکتے۔

ر ج: ہر بڑی ریاست میں اردو اکادمیاں کام کر رہی ہیں۔ کیا آپ ان سے مطمئن ہیں؟

شموئل احمد: میں کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔

ر ج: مرکزی حکومت کا فعال ادارہ اردو کونسل اردو کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ تعلیمی، علمی اور صحافتی طور پر یہ ادارہ کامیاب بھی ہے۔ جس سے آپ خوب واقف ہیں۔ آپ کے ذہن میں کچھ تجاویز کچھ مشورے ہوں تو کہیے۔

شموئل احمد: کونسل کی سرگرمیاں ادھر چند سالوں میں بہت بڑھی ہیں۔ ایک اچھا کام کونسل نے یہ کیا ہے کہ مختلف علوم انسانیہ کی اردو ڈکشنری ترتیب دی ہے جس سے اردو میں تراجم کا کام آسان ہوگیا ہے۔ آپ جب تک مختلف زبانوں کی کتابیں اردو میں منتقل نہیں کرتے یا اردو ادب کو دوسری زبانوں میں منتقل نہیں کرتے اردو کی توسیع نہیں ہو سکتی۔ فکشن کو ہی لے لیجیے تو غیر ملکی کلاسیکی ادب اردو میں نظر نہیں آتا۔ آج ماڈرن عالمی ادب کا کیا رجحان ہے اس سے بھی اردو کا عام قاری نابلد ہے۔ تو ضرورت زیادہ سے زیادہ اردو میں تراجم کرانے کی ہے۔ جس پر خاطر خواہ توجہ دینی چاہیے۔

□

Rafiq Jafar, Ranjit Singh Colony, Opp. Talau Nalband Gali, Talegaon Dabhade Taluka Maval, Pune - 410506 (MS)

شموئل احمد 4 مئی 1945 کو بھاگلپور [بھارت] میں پیدا ہوئے۔ سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور حکومت بہار کے شعبہ پبلک ہیلتھ انجینئرنگ میں چیف انجینئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ گزشتہ سال انھیں بہترین فکشن نگاری کے لیے عالمی فروغ اردو ادب دوحا قطر 2012 کے انعام سے نوازا گیا ہے۔

سنگھاردان جیسی کہانی کے خالق شموئل احمد اپنے منفرد اسلوب اور بے باک لہجے کے لیے جانے جاتے ہیں۔ ان کے ہر افسانے میں ایک نیا تجربہ اور نئی حسیت کارفرما نظر آتی ہے۔ شموئل صرف جنس کی نفسیات پر ہی گہری نظر نہیں رکھتے بلکہ عصری اور سیاسی مسایل کو تمام پختگی سے پیش کرنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کا دلکش اسلوب فنی رویہ اور تخلیقی مزاج انھیں اپنے ہم عصروں سے الگ کرتا ہے۔ 'عنکبوت'، 'اونٹ'، 'ظہار' اور 'سنگھاردان' جیسی کہانیاں شموئل کے قلم سے ہی نکل سکتی تھیں۔ شموئل احمد کو علم نجوم سے گہرا شغف ہے۔ انھوں نے علم نجوم کی اصطلاحوں کا بہت تخلیقی اظہار 'مصری کی ڈلی' چھگمانس اور 'القمبوس کی گردن' جیسی کہانیوں میں کیا ہے۔ شمویل ہندی زبان میں بھی یکساں قدرت سے لکھتے ہیں۔

شموئل احمد کے افسانوں کا ترجمہ انگریزی کی علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ پنجابی میں ان کے نمائندہ افسانوں کا انتخاب 'مرگ ترشنا' حال میں ہی شایع ہوا ہے۔ شموئل ٹیلی اسکرپٹ بھی لکھتے ہیں۔ ان کی کہانی 'آنگن کا پیڑ'، 'کاغذی پیراہن' اور 'مرگ ترشنا' پر ٹیلی فلمیں بن چکی ہیں جس کی اسکرپٹ شمویل نے ہی لکھی۔ ان کا ناول 'ندی' پینگوئن اردو نے شایع کیا ہے۔ حال میں ہی اس ناول کا انگریزی ترجمہ River جرمنی سے شایع ہوا ہے۔ جرمنی سے ہی انگریزی میں ان کے افسانوں کا مجموعہ The Dressing Table کے عنوان سے شایع ہوا ہے جس کی یوروپ میں بہت دھوم ہے۔ شموئل احمد کا دوسرا ناول 'مہاماری' اردو کے اہم سیاسی ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ شمویل صف اول کے مترجم بھی ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے اصرار پر گجراتی ناول کنواں کا ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

افسانوی مجموعے: 'بگولے'، سنگھاردان، القمبوس کی گردن، عنکبوت ــــ ناول: مہاماری، ندی

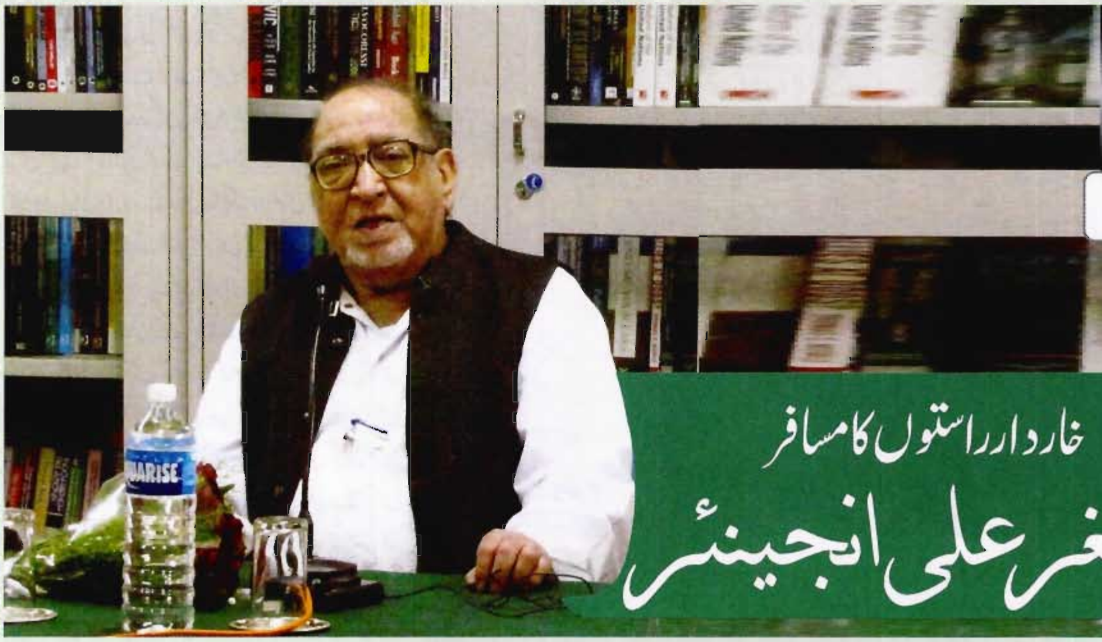

سید احمد قادری

خاردار راستوں کا مسافر

اصغر علی انجینئر

اصغر علی انجینئر تین ماہ تک بستر علالت پر رہ کر آخر کار 14 مئی 2013 کی صبح سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ ویسے بھی انھوں نے اپنی پوری زندگی سفر میں ہی گزاری ہے، پوری دنیا میں امن و آشتی کا پیغام لے کر ملک اور بیرون ممالک کا سفر کرتے اور اپنی مؤثر تقاریر سے لوگوں کو مسحور کر دیتے، اپنی بات اس انداز سے مختلف قومی اور بین الاقوامی سیمیناروں میں پیش کرتے کہ لوگ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اصغر علی انجینئر کی یہی بڑی کامیابی تھی۔

اصغر علی انجینئر، جہد مسلسل کا ایک اہم اور بڑا نام تھا۔ جبر و ظلم اور استحصال کے خلاف نبرد آزما رہنا، سماجی انصاف، مساوات، قومی یکجہتی اور امن و چین کی قندیلیں لے کر دنیا کے مختلف ممالک میں دم توڑتی انسانیت اور قدروں کو روشن رکھنے کے لیے اپنے افکار و تصورات کی دولت لٹاتے رہنا اصغر علی انجینئر کا مقصد حیات تھا۔ ان مقاصد کے حصول میں جو لوگ ان کے منافی تھے، اکثر ان کے راستوں کو خاردار بناتے رہتے، لیکن ایسی کوششوں کی اصغر علی انجینئر نے کبھی پرواہ نہیں کی، یہاں تک کہ قاہرہ، کلکتہ اور احمد آباد میں ان پر جان لیوا حملے ہوئے، لیکن اصغر علی انجینئر نے ان حملوں کو بس حادثہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس سلسلے میں اصغر علی انجینئر نے مجھ سے ایک انٹرویو میں کہا تھا— ''مخالفت اور پریشانیاں تو قدم قدم پر ملتی ہیں، جب بھی کوئی اچھا کام کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لیے ایسے لوگوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اپنے مشن میں آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔ دھیرے دھیرے ایسی قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔''— اور یہی ہوا۔ اصغر علی انجینئر کی ہمت، حوصلے اور جرأت کے آگے مخالفین کی کوششیں سرد پڑنے لگیں اور وہ پوری جواں مردی کے ساتھ پوری دنیا میں بہت تیزی سے پھیل رہی بدامنی، فرقہ واریت اور دہشت گردی کے خلاف سیکولرزم کی مشعل لیے عمل پیرا رہے۔ مختلف مذاہب کا گہرا مطالعہ، کئی زبانوں پر حاصل عبور اور بے حد واضح انسانی اقدار اور کمیونل ہارمنی کے افکار و خیالات کی خصوصیات نے تقریباً پوری دنیا کے امن پسند لوگوں کی توجہ ان کی جانب مبذول کرائی اور وہ اپنی ان جملہ صفات کے اظہار کے لیے انگلینڈ، امریکہ، جرمنی، فرانس، سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا، میکسیکو، کناڈا، افریقہ، یمن، ملیشیا، انڈونیشیا، ہانگ کانگ، فلپائن، جاپان، تھائی لینڈ وغیرہ جیسے ممالک کے سیمیناروں اور کانفرسوں میں بلائے جانے لگے۔ جہاں اپنی سحر انگیز تقاریر سے انھوں نے دنیا میں بڑھ رہی جارحیت اور شدت پسندی کے منفی اثرات کے نتائج کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خیر سگالی، اخوت اور یکجہتی کے لیے راستے ہموار کرنے کی تلقین کی——اصغر علی انجینئر تقریر کے ساتھ ساتھ تحریری طور پر بھی بہت زیادہ فعال رہے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ ملکی و غیر ملکی اخبارات و رسائل میں سیکولرزم کی اہمیت و افادیت پر مضامین لکھتے رہے ہیں۔ کئی اہم موضوعات پر ان کی تقریباً 72 سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ادبی طور پر بھی اصغر علی انجینئر بے حد فعال اور متحرک تھے، ترقی پسند ادب اور اس تحریک سے ان کا گہرا تعلق تھا، اپنے نظریات کے اظہار کے لیے ان کی کئی اہم کتابیں منظر عام پر آ کر ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنی ہیں۔ ان کی ایک بہت اہم کتاب 'لوکاچ اور مارکسی تنقید' آٹھ ابواب میں منقسم ہے اور ان تمام ابواب میں لوکاچ کے حالات زندگی، اس کے نظریات، اس کے افکار و خیالات، لوکاچ کے مضامین اور کتابوں پر معرکے وغیرہ کا اصغر علی انجینئر نے بھرپور جائزہ لیا ہے۔

بہت ممکن ہے اصغر علی انجینئر کے نظریات سے جسے انھوں نے اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے، کچھ لوگوں کو اختلاف ہو، لیکن نظریاتی اختلاف کے باوجود اس کتاب کی اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اصغر علی انجینئر نے بیسویں صدی کے ابتدائی عہد کے ایک اہم اور مشہور مفکر کے افکار و خیالات کو اپنے نقطۂ نظر سے شاندار اسلوب اور گہری معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس پیش کش میں اصغر علی انجینئر نے اپنے گہرے مطالعے کا ثبوت دیا ہے۔

اصغر علی انجینئر کو فرقہ وارانہ اتحاد اور خیر سگالی کی انتھک کوششوں کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح کے کئی قابل فخر اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ 1997 میں حکومت ہند نے کمیونل ہارمنی ایوارڈ دیا، وہیں 1993 میں کلکتہ یونیورسٹی نے ان کے کمیونل ہارمنی کے کارناموں سے متاثر ہو کر، ڈی لٹ کی ڈگری سے سرفراز کیا۔ عالمی سطح پر سماجی انصاف اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرنے پر سوئڈن حکومت نے 2004 میں 'مساوی نوبل انعام برائے امن' (Alternative

(Noble Prize Of Peace) جیسا باوقار اعزاز دے کر سوئڈن حکومت نے نہ صرف اصغر علی انجینئر کی بلکہ ہمارے ملک کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سماجی انصاف کے لیے جدوجہد اور عملی کوششوں کی تائید کی۔

اس عالمی سطح کا امن ایوارڈ ملنے پر آگے کا لائحہ عمل آپ کا کیا ہوگا، میرے اس سوال پر اصغر علی انجینئر نے کہا تھا:

''پروگرام وہی رہے گا، دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہنا اور اسلام کی سچی تصویر پیش کرنا۔ اسلام کے نام پر جو تشدد ہو رہا ہے اور غلط طور پر جو جہاد کو جوڑ دیا گیا ہے اس تاثر کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ میں برسوں سے یہ کام کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔''

ایسی عظیم اور باوقار شخصیت، جن کے افکار ونظریات کی دنیا قائل ہو، کی تعمیر میں کن عناصر نے اہم رول ادا کیے، اس کے لیے ہم اصغر علی انجینئر کی ذاتی زندگی کے احوال وکوائف کو دیکھیں تو ہمیں کئی حیرت انگیز واقعات سامنے آتے ہیں۔ اصغر علی انجینئر کی پیدائش راجستھان کے ایک گاؤں سلومبر میں 1939 میں ایک ممتاز بوہرہ عالم خاندان میں ہوئی، ان کے دادا اور ان کے والد نہ صرف ممتاز عالم تھے، بلکہ حافظ قرآن بھی تھے۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس ان کے والد نے ہی انھیں دیا۔ سب سے پہلے اصغر علی انجینئر کا داخلہ ہوشنگ آباد کے ایک اسکول میں کرایا گیا پھر وہ وردھا اور دیواس کے اسکول میں آئے اور دیواس سے ہی میٹرک پاس کیا۔ دیواس میں ہی انھیں اردو کے ایک باذوق استاد شمع نے ان کے اندر اردو ادب سے دلچسپی بڑھائی اور اپنے اسی استاد کی ترغیب پر اصغر علی انجینئر نے ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات میں کامیاب ہوتے گئے۔ اصغر علی انجینئر کی مادری زبان گرچہ گجراتی تھی لیکن اردو اسکول میں داخلہ اور شمع صاحب جیسے اردو کے قابل قدر استاد کی شاگردی نے ان کے اندر اردو زبان وادب سے گہری دلچسپی پیدا کر دی۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد ایک ایسا واقعہ رونما ہوا، جس نے اصغر علی انجینئر کی زندگی کو ایک نیا موڑ دے دیا۔ یہ واقعہ اصغر علی انجینئر کی زندگی کے لیے Turning Point ثابت ہوا۔ واقعہ یوں ہوا کہ اصغر علی انجینئر نے جب امتیازی نمبروں سے میٹرک پاس کیا تو ان کے والد بوہروں کے دستور کے مطابق سیدنا صاحب کی قدم بوسی کے لیے دیواس سے ممبئی کے بدری محل پہنچے۔ آگے کا حال خود اصغر علی انجینئر کی زبانی اس طرح ہے۔

''بدری محل میں، میں نے زندگی میں پہلی بار عجیب منظر دیکھا۔ سبھی بوہرے سیدنا صاحب کو سجدہ کرنے پر مجبور تھے۔ ہر بوہرے کو سیدنا صاحب کی خدمت میں

اصغر علی انجینئر، جہد مسلسل کا ایک اہم اور بڑا نام تھا۔ جبر و ظلم اور استحصال کے خلاف نبرد آزما رہنا، سماجی انصاف، مساوات، قومی یکجہتی اور امن و چین کی قندیلیں لے کر دنیا کے مختلف ممالک میں دم توڑتی انسانیت اور قدروں کو روشن رکھنے کے لیے اپنے افکار و تصورات کی دولت لٹاتے رہنا اصغر علی انجینئر کا مقصد حیات تھا۔

ہاتھ جوڑ کر اور گھٹنے کے بل چلتے ہوئے جانا ہوتا ہے اور سیدنا صاحب پر نظر پڑتے ہی سجدے میں گر پڑنا لازمی ہے۔ میں مجبوراً ہاتھ جوڑے ہوئے گھٹنے کے بل چلتا ہوا تو گیا لیکن سجدہ نہیں کیا۔ وہیں قریب میں مارشل کھڑا تھا۔ اس نے میری گردن پکڑ کر پیشانی زمین سے لگا دی اور کہنے لگا شیطان کہیں کا، اپنے آقا مولا کو سجدہ نہیں کرتا، جہنم رسید ہوگا۔ میں اور والد صاحب باہر آئے میں غصے میں بھرا ہوا تھا میں نے والد صاحب سے کہا آپ نے تو مجھے بتایا تھا کہ سجدہ ماسوا اللہ کے حرام ہے اور یہاں ایک انسان کو سجدہ کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ یہ سراسر غیر اسلامی حرکت ہے۔ میں اس در پر دوبارہ نہیں آؤں گا۔ اگر آپ نے مجبور کیا تو میں آپ کی نافرمانی کا مرتکب ہونے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ والد صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہنے لگے، بیٹا تو میری مجبوری نہیں سمجھتا، میں تجھے اپنی خوشی سے نہیں لایا ہوں اور اس در پر میں دوبارہ نہیں گیا۔ میں نے وہاں پر ہر چیز اسلامی تعلیمات کے خلاف پائی۔ اسلام مساوات کی اور عمل کی تعلیم دیتا ہے اور یہاں اسلام کا نام لے کر ظلم، جبر، استحصال اور غلامی کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔''

اسی دن سے اصغر علی انجینئر کے ذہن میں ظالموں اور جابروں کے خلاف باغیانہ رویے نے جگہ بنا لی، جو بتدریج بڑھتا گیا۔ 1962 میں اصغر علی انجینئر نے اندور سے سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور ممبئی کے میونسپل کارپوریشن میں ملازمت کر لی، لیکن قدرت کو تو اصغر علی انجینئر سے انجینئرنگ کے بجائے اللہ کے بندوں پر ہونے والے ظلم و بربریت، تشدد واستحصال، فرقہ واریت اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف کام لینا تھا۔ 1962 میں ہی جبلپور میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا، اس کے بعد رانچی، راول کیلا اور جمشید پور وغیرہ کے فرقہ وارانہ فساد میں معصوم بچوں اور بے سہارا عورتوں کی دلدوز چیخ نے اصغر علی انجینئر کے ذہن کو متزلزل کر دیا اور وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر 'آواز برادران' نام کی ایک تنظیم بنانے پر مجبور ہوئے اور اس تنظیم کے تعاون سے وہ فرقہ وارانہ فسادات کے سیاسی، معاشی، سماجی اور تاریخی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور بڑی تفصیل سے ان عوامل کو قلم بند کر کے مختلف اخبارات ورسائل میں مضامین لکھ کر حکومت وقت کو صداقت پر مبنی حالات سے واقف کراتے، یہ سلسلہ ان کے انتقال سے قبل تک جاری رہا ہے۔ اس سلسلے میں بھی اب تک اصغر علی انجینئر کی کئی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اصغر علی انجینئر کا مقصد حیات انسانی خدمات اور انسانی اقدار کی بقا تھا اور اس کے لیے وہ قریہ قریہ گھوم گھوم کر امن و یکجہتی کے پیغامات پہنچاتے رہے۔ اصغر علی انجینئر اپنے ادارہ سینٹر فار اسٹڈی آف سوسائٹی اینڈ سیکولرزم، ممبئی سے بھی ہر پندرہ روز پر 'اردو سیکولر پرسپیکٹو' نامی کتابچہ سے بھی وہ پوری دنیا میں سیکولرزم کی جوت جگاتے رہے ہیں۔

افسوس کہ خاردار راستوں پر چلتے چلتے ان کا سفر ختم ہو گیا، لیکن انھوں نے علم و ادب اور امن و آشتی کے جتنے کارنامے انجام دیے ہیں، وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

■

Dr. Syed Ahmad Qadri, 7 New Karim Ganj, Gaya - 823001 (Bihar)

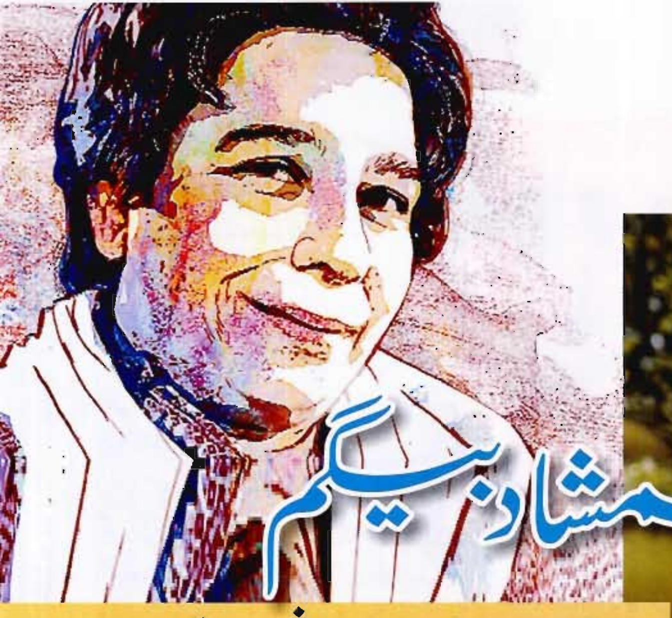

شمشاد بیگم

آواز کا شعلہ جو روشنی بن گیا

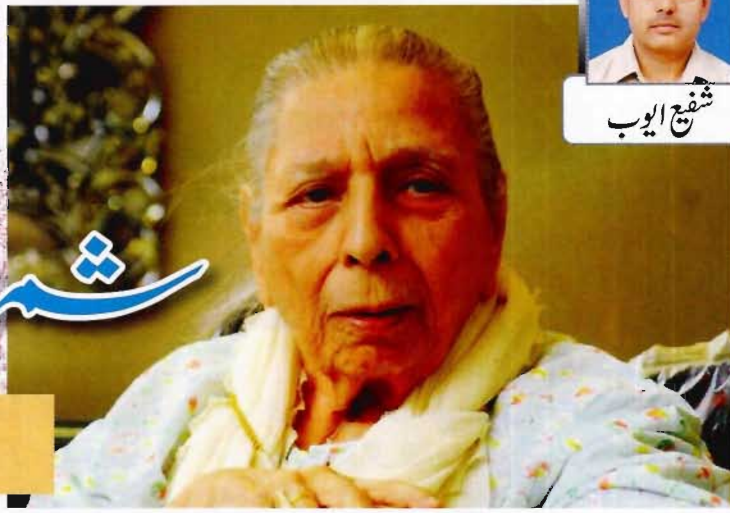

شفیع ایوب

'تری محفل میں قسمت آزما کر ہم بھی دیکھیں گے'، 'کجرا محبت والا انکھیوں میں ایسا ڈالا'، 'یا' لے کے پہلا پہلا پیار' جیسے سدابہار گیتوں کو اپنی کھنک دار آواز بخشنے والی شمشاد بیگم 14 اپریل 1919 کو پنجاب کے شہر امرتسر میں پیدا ہوئیں۔ والد میاں حسین بخش نے بیٹی کا نام شمشاد رکھا۔ شمشاد اپنی منفرد کھنک دار آواز لے کے پیدا ہوئی تھیں۔ اسکول کے دنوں میں ہی ان کے اساتذہ نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ اس لڑکی کی آواز میں بلا کی کشش ہے۔ اس کی آواز کو کوئل کی کوک کسی نے نہیں کہا۔ اس کی آواز میں ماں کی لوری جیسا پیار نہیں تھا لیکن اس کی آواز میں کسی جھرنے کی الھڑ، لاپرواہ روانی تھی۔ اس میں مندر میں بجنے والی گھنٹیوں کا تقدس تھا۔ 1924 میں جب شمشاد کی عمر ابھی صرف دس برس تھی ان کے اسکول کے پرنسپل نے ان کی آواز کی انفرادیت کو پہچان لیا۔ انھوں نے اسکول میں ہونے والے حمد و مناجات کے لیے شمشاد کو ہیڈ سنگر بنا دیا۔ شمشاد کی منفرد آواز کی شہرت اسکول کی چہار دیواری سے نکل کر آس پاس کے علاقوں میں پھیل گئی۔ اب وہ مذہبی تقریبات میں حمد و نعت پڑھنے کے لیے اور شادی بیاہ کی محفلوں میں پنجابی لوک گیت گانے کے لیے بلائی جانے لگیں۔ شمشاد کے والد میاں حسین بخش کو یہ سب پسند نہیں آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شمشاد کے گانے کے ہی خلاف ہو گئے۔ حالانکہ شمشاد کی آواز کے وہ بھی قائل تھے۔ لیکن وہ اپنی بارہ تیرہ سال کی بیٹی کی بڑھتی ہوئی شہرت سے خوف زدہ تھے لیکن رفتہ رفتہ انھیں بھی اندازہ ہو گیا کہ شمشاد کے لیے گانا صرف گانا نہیں ہے بلکہ وہ اس کی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ اگر چہ شمشاد کو موسیقی اور گائیکی کی باقاعدہ تربیت نہیں ملی تھی لیکن ان کی خداداد صلاحیت میں یوں ہی دن بہ دن نکھار آتا گیا، رفتہ رفتہ ان میں موسیقی کا جنون بڑھتا گیا۔ شمشاد کے ایک چچا قوالی اور غزل سرائی سے شوق رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے بھائی یعنی شمشاد کے والد کو اس بات کے لیے آمادہ کر لیا کہ شمشاد گانے کا اپنا شوق پورا کر سکیں۔ چچا شمشاد کو ساتھ لے کر امرتسر سے لاہور گئے۔ گیت سنگیت کی دنیا کے کئی بڑے استاد اس وقت لاہور میں موجود تھے۔ ان میں سے ایک بڑے نامی گرامی موسیقار غلام حیدر بھی تھے۔ چچا نے غلام حیدر سے شمشاد کا تعارف کرا دیا۔ پارکھی نظر نے ہیرے کو پہچان لیا۔ غلام حیدر نے شمشاد سے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل گانے کو کہا۔ شمشاد کی کھنکتی آواز میں بہادر شاہ ظفر کی غزل نے وہ جادو جگایا کہ غلام حیدر نے ایک ساتھ بارہ گانوں کے لیے شمشاد سے معاہدہ کر لیا۔ غلام حیدر جیسے بڑے موسیقار کا شمشاد جیسی نووارد کے ساتھ ایک ساتھ بارہ گانوں کا معاہدہ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ شمشاد کی اس کامیابی پر دوسروں کے ساتھ ان کے والد میاں حسین بخش بھی بے حد خوش ہوئے اور انھوں نے دو شرطوں کے ساتھ اپنی بیٹی کو اجازت دی کہ وہ گانے کے میدان میں آگے بڑھے۔ پہلی شرط یہ تھی کہ جب بھی ریکارڈنگ کے لیے جائے تو برقعہ اوڑھ کر جائے اور دوسری شرط یہ تھی کہ شمشاد کی تصویر اخبارات میں نہ شائع ہو یعنی وہ کسی صورت کیمرے کا سامنا نہ کرے۔ شمشاد اگرچہ ضدی تھیں اور اپنے ڈھنگ سے کام کرنے کی عادی بھی لیکن انھوں نے اپنے والد کی ان دونوں خواہشات کا احترام کیا۔

1937 سے وہ لگاتار آل انڈیا ریڈیو کے پشاور اور لاہور مراکز سے گانے لگیں اور ان کی شہرت فلم انڈسٹری تک پہنچ گئی۔ ریڈیو پر ان کی آواز میں گیت سن کر لوگ دیوانہ وار آل انڈیا ریڈیو کو خطوط لکھتے، لیکن ان کے چاہنے والے، ان کی آواز کے لاکھوں مداح 1970 تک ان کی تصویر نہیں دیکھ سکے تھے۔ کیونکہ اپنے والد سے کیا وعدہ انھوں نے پورا کر کے دکھایا۔

گیت کے ساتھ ساتھ انھوں نے حمد، نعت، سلام، منقبت وغیرہ اپنی آواز میں ریکارڈ کرائے۔ دہلی کی مشہور دی کراؤن امپریل تھیٹریکل کمپنی نے بھی شمشاد کے گائے گیت اور غزلوں کے گراموفون ریکارڈ بازار میں اتارے۔ 1940 کی دہائی میں شمشاد بیگم کے گراموفون ریکارڈ سب سے زیادہ قیمت پر بازار میں فروخت ہوتے تھے۔ 1941 میں فلم 'خزانچی' اور 1942 میں فلم 'خاندان' میں غلام حیدر صاحب نے بڑی خوبصورتی سے شمشاد بیگم کی آواز کا استعمال کیا۔ شمشاد بیگم کی آواز نے سب کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ 1940 میں فلم 'یملا جاٹ' (Yamla Jatt) ریلیز ہوئی۔ بے حد کامیاب اس فلم نے ایک طرف اداکاری میں پران کی شناخت قائم کی تو دوسری طرف بطور موسیقار غلام حیدر اور بطور گلوکارہ شمشاد بیگم کی شناخت کو مستحکم کیا۔ اس کے بعد موسیقار اور گلوکارہ کی اس جوڑی نے پے در پے 'زمیندار'، 'پونجی' اور 'شمع' جیسی ہٹ فلمیں دیں۔ ان تمام فلموں کی کامیابی میں شمشاد بیگم کی کھنک دار آواز کا بڑا عمل دخل تھا اور اسی وجہ سے اس وقت فلم انڈسٹری میں سب سے زیادہ فیس لینے والی گلوکارہ

کے طور پر شمشاد بیگم کا نام ابھر کر سامنے آیا۔

1943 میں فلم ہدایت کار محبوب خان نے 'تقدیر' بنانے کا فیصلہ کیا تو بطور اداکارہ نرگس کا انتخاب کیا اور بطور گلوکارہ شمشاد بیگم کا محبوب خان جیسے بڑے اور کامیاب فلم ہدایت کار کے ساتھ کام کرنے کی حسرت بھلا کون نہیں رکھتا۔ لیکن شمشاد بیگم کے لیے یہ اہم نہیں تھا کہ وہ کس کے ساتھ کام کر رہی ہیں بلکہ ان کے لیے یہ اہم تھا کہ ان کا کام کتنا اچھا رہا۔ وہ ڈوب کر گاتی تھیں۔ گانا ان کے لیے اپنے اندرون میں ڈوبنے کا نام تھا، وہ اپنے گانوں میں ڈوب کر سراغِ زندگی پا لیتی تھیں اور ان گانوں کے سننے والے ان کی آواز کی کھنک میں ڈوب کر درد و داغ، جستجو و آرزو سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔

شمشاد بیگم کا شمار ہندوستانی سنیما کی ان خوش نصیب فن کاروں میں ہوتا ہے جنھیں عوام کے ساتھ خواص نے بھی بے حد پسند کیا ہے۔ وہ ہندوستانی فلم انڈسٹری کے پہلے دور کی پلے بیک سنگر ہیں۔ انھوں نے اردو۔ہندی کے علاوہ بنگالی، پنجابی، تمل، مراٹھی اور گجراتی زبانوں میں 6 ہزار سے زیادہ گانے گائے ہیں۔ انھوں نے ایس ڈی برمن اور نوشاد علی جیسے مایہ ناز موسیقاروں کی دھنوں کو اپنی کھنکھناتی آواز سے سجایا ہے۔

ہندوستان کی آزادی اور ملک کی تقسیم سے پہلے انھوں نے رفیق غزنوی، امیر علی، پنڈت امرناتھ اور ایم اے مختار جیسے اعلیٰ درجے کے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا تھا۔ لیکن تقسیم وطن کے بعد انھوں نے ہندوستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ ان کا زیادہ تعلق پشاور اور لاہور سے رہا۔ لیکن ان کی رگوں میں گنگا جمنا کی دھارائیں ایک ساتھ رہتی تھیں۔ مشترکہ تہذیب کی وہ ایک زندہ مثال تھیں۔ ہندوستان ان کی آتما تھی۔ جن لوگوں نے شمشاد بیگم کے ساتھ کام کیا ہے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ بیگم کا دل نور سے بھرا تھا اسی لیے جب وہ گاتی تھیں تو فضاؤں میں نور بکھر جاتا تھا۔ ایک چھناکے کے ساتھ ہر سمت ایک روشنی بکھیرتی نظر آتی تھیں۔ اپنے زمانے کی مشہور گلوکارہ مبارک بیگم کا کہنا ہے کہ شمشاد آپا اپنے اندر کی خوشی کو باہر نکالنے کے لیے گایا کرتی تھیں۔ ان کے ہم عصروں میں امیر بائی کرناٹکی، نور جہاں، ثریا، مبارک بیگم اور گیتا دت جیسی گلوکارائیں اپنا خاص مقام رکھتی تھیں لیکن ان سب میں جو آواز سب سے منفرد تھی جس آواز میں سب سے زیادہ جھنکار تھی، سب سے زیادہ صفائی تھی وہ آواز شمشاد بیگم کی تھی۔ 1940 سے 1955 تک کے زمانے کو ان کے عروج کا زمانہ کہتے ہیں۔ 1955 میں اپنے شوہر کو ایک سڑک حادثے میں کھو دینے کے بعد شمشاد بیگم نے گانا چھوڑ دیا تھا۔ 1955 میں شوہر کی موت کے بعد یہ آواز خاموش ہوئی تو ملک بھر میں ان کے مداح بے حد مایوس ہوئے۔ لیکن انھوں نے خود کو سنبھالا اور دو سال بعد 1957 میں دوبارہ گانا شروع کیا۔ 1970 تک وہ اپنی آواز کا جادو جگاتی رہیں۔ اس کے بعد ایک طرح کی گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

نوشاد جیسے عظیم موسیقار نے بار بار اعتراف کیا کہ فلم انڈسٹری میں ان کا جو مقام ہے اس میں شمشاد بیگم کی آواز کو بڑا دخل ہے۔ نوشاد جب گمنامی کے اندھیروں

میں بھٹک رہے تھے اس وقت شمشاد بیگم شہرت کی بلندیوں پر تھیں۔ 1940 کی دہائی میں شمشاد بیگم نے نوشاد کے لیے جو گیت گائے وہ بے حد مقبول ہوئے۔ اس طرح نوشاد کی مقبولیت میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا۔ بعد میں جب نوشاد کو بے پناہ کامیابی ملی اور وہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچے تو انھوں نے بہت سے نئے گلوکاروں کو موقعہ دیا لیکن وہ شمشاد بیگم کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ اپنے زمانے کی سپرہٹ فلم 'مدر انڈیا' کے لیے نوشاد نے ایک دو نہیں بلکہ چار گیت شمشاد بیگم کی آواز میں ریکارڈ کیے۔ ان کی آواز میں رنگا رنگی بہت تھی۔ اپنے زمانے کے مشہور موسیقار سی رام چندرن نے مغربی طرز کی دھن بنائی۔ اس وقت یہ طریقہ ہماری فلم انڈسٹری میں بہت عام نہیں تھا۔ لیکن رام چندرن کی دھن کو شمشاد بیگم نے اپنی آواز سے سجا کر 'میری جان ... سنڈے کے سنڈے' جیسا مقبول گانا دیا۔ ایس ڈی برمن اگرچہ بنگالی فلموں میں بطور موسیقار جگہ بنا چکے تھے۔ لیکن قومی سطح پر ان کی پہچان 1946 کے بعد اس وقت بن سکی جب ان کی تیار کردہ دھن پر فلم 'شکاری' کے لیے شمشاد بیگم نے 'کچھ رنگ بدل رہی ہے' جیسا سدابہار گیت گایا۔ اس کے بعد 1949 میں برمن کے لیے ہی شمشاد بیگم نے مکیش کے ساتھ فلم 'شبنم' کے گیت گائے۔

ایس ڈی برمن کی زندگی میں فلم 'شبنم' کی بڑی اہمیت رہی۔ اس فلم کی کامیابی نے برمن کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ کامنی کوشل کی اداکاری اور شمشاد بیگم کی کھنک دار آواز نے 'یہ دنیا روپ کی چور' جیسے گانے کو امر کر دیا۔ اس کے علاوہ برمن نے فلم 'بازار'، 'بہار'، 'مس انڈیا' اور 'شہنشاہ' کے گیت شمشاد بیگم کی آواز میں ریکارڈ کیے۔ نوشاد اور ایس ڈی برمن کے علاوہ او پی نیر نے بھی شمشاد بیگم کی آواز کا خوبصورت استعمال کیا۔ نیر اکثر کہا کرتے تھے کہ بیگم کی آواز مندر کی گھنٹیوں جیسی ہے۔

شمشاد بیگم نے او پی نیر کے لیے 'اب تو جی ہونے لگا'، 'ذرا پیار کر لے' اور 'سیاں تیری آنکھوں میں' جیسے سدابہار گیتوں کو آواز دی۔ ہندوستانی فلموں نے کچھ ایسے لازوال نغمے دیے ہیں جنھیں اب چوتھی نسل پسند کر رہی ہے۔ ایسے لازوال اور ہر دور میں پسند کیے جانے والے گیتوں میں زیادہ تر شمشاد بیگم کی آواز میں ہیں۔ مغل اعظم میں نگار سلطانہ پر فلمایا گیا وہ گانا 'تیری محفل میں قسمت آزما کر ہم بھی دیکھیں گے' بھلا کون بھول سکتا ہے۔ محمد رفیع کے ساتھ شمشاد بیگم نے 'چھلا دے جا نشانی' جیسا لازوال گیت گایا۔ موسیقی کے ماہرین کا خیال ہے کہ 'میرے پیا گئے رنگون'، 'چھلا دے جا نشانی' جیسے گیت صرف شمشاد بیگم ہی گا سکتی تھیں۔ انھوں نے کشور کمار کے ساتھ 'گوری کے نینوں میں نیند یا بھری' جیسا خوبصورت گیت گایا، ان کا گایا گیت کجرا محبت والا آج بھی اسی قدر مقبول ہے جس قدر 1969 میں فلم قسمت کے ریلیز ہونے کے وقت مقبول تھا۔ 'لے کے پہلا پہلا پیار'، 'کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ' اور 'ریشمی شلوار کرتا جالی کا' ایسے گیت ہیں جو آج بھی سننے والوں پر جادو سا اثر کرتے ہیں۔ 1913 میں جب ہندوستانی سنیما کی عمر سو برس ہوئی تو شمشاد بیگم زندگی کی 94 بہاریں دیکھ کر 23 اپریل 1913 کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ لیکن ان کی کھنک دار آواز کانوں میں رس گھولتی رہے گی۔

◘

Dr. Shafi Ayub, CIL/SLL & CS, JNU, New Delhi - 110067

فاروق ارگلی

بچوں کا ادب

تب اور اب

اردو کا قریبی رشتہ چونکہ کئی زبانوں سے ہے اس لیے اس کی گود میں بچوں کے ادب کی پوری ایک دنیا سانس لیتی دکھائی دیتی ہے۔ سنسکرت، فارسی اور عربی جیسی عظیم زبانوں کی قربت نے اردو ادب کو جس طرح ہر پہلو سے نکھارا اور سنوارا ہے اس کا اثر اردو کے ادب اطفال پر بھی پڑا ہے۔ لیکن گزشتہ چند عشروں سے اردو میں بچوں کے ادب کی گاڑی کچھ رک سی گئی ہے۔ یہ ایک عجیب صورت حال ہے کہ ایک طرف اردو کے فروغ کی نئی راہیں کھل رہی ہیں اور دوسری طرف بچوں کا معیاری ادب تخلیق نہیں ہو پا رہا ہے۔ جو کچھ بچوں کے ادب کے نام سے سامنے آرہا ہے اس کا معیار ہرگز ویسا نہیں ہے جیسا اس سے پہلے کے دور میں اس وقت کے تقاضوں اور حالات کے تناظر میں قائم رکھا جا سکا تھا۔ زیرِ نظر کور اسٹوری کے قلم کاروں نے ، اردو میں ادب اطفال کے تمام پہلوئوں کا جائزہ لینے اور ان سبھی اہم سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے جو ادب اطفال کے معیار و مقدار اور ماضی و حال سے تعلق رکھتے ہیں۔ (ادارہ)

انسانی تہذیب، سماجیات اور لسانیات کی تاریخ گواہ ہے کہ تمدنی ارتقا کے ہر دَور میں، ہر زبان اور ہر سماج میں ادبِ اطفال کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھا گیا ہے۔ بھارت ورش کی قدیم بھاشا سنسکرت میں پنچ تنتر کی کہانیاں بچوں کی نفسیات اور معصومانہ فطرت کے مطابق ان کی کردار سازی اور ذہنی تربیت کے لیے تخلیق کی گئی تھیں، ڈھائی تین ہزار سال پرانے اُپنشدوں میں بڑوں کی رہنمائی اور اصلاح کے ساتھ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے دلچسپ معلوماتی، نصیحت آمیز کتھائیں اور قدیم جاتک کہانیاں بھی ہندوستانی ادبِ اطفال کا بہترین نمونہ ہیں۔ مشرقی دُنیا میں الف لیلوی عہد کی عجیب وغریب داستانیں ہر عمر کے لوگوں کی تفریحِ طبع کے ساتھ ساتھ بچوں کی تربیت اور ان کی قوتِ متخیلّہ کو بیدار و بالیدہ کرنے کے ساتھ ساتھ حق و باطل اور نیک و بد کو پہچاننے کی صلاحیت بخشنے کی قوت رکھتی ہیں۔

اُردو زبان جس طرح عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور ہندوستانی بولیوں کے امتزاج سے بنی اسی طرح اس کے قدیم ادب میں بھی سبق آموز داستانوں، تمثیلی قصوں، حکایتوں وغیرہ کی کمی نہیں ہے جو بڑوں اور بچوں کے لیے یکساں دلچسپ اور افادیت سے بھرپور ہیں۔ اگر ہم حضرت امیر خسرو کو اُردو کا بنیاد گزار مان کر ان کے نام سے منسوب 'خالق باری' کو دیکھتے ہیں تو یہ تخلیق فارسی میڈیم سے اُس وقت کی ہندوی زبان سکھانے والی دلچسپ گائڈ ہے، اسے ہم اُردو کے ادبِ اطفال کے اوّلین نمونوں میں شمار کرسکتے ہیں۔ اُردو کے قدیم شعرا نے عربی، ایرانی، تورانی، ہندوستانی قصے کہانیوں کو اپنی مثنویوں میں جس خوبی سے بیان کیا ہے ان میں ادبِ اطفال کی جھلکیاں اور ان کے اصلاحی تعلیمی اور تربیتی مقاصد کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اُردو کے اوّلین عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی نے 'ریچھ کا بچہ'، 'ایامِ طفلی'، 'کن کوّے اور سینگ'، 'گڑ پتنگ کی لڑائی'، 'ہرنی کا بچہ'، 'تل کے لڈو' اور 'گلہری کا بچہ' جیسی شاہکار نظمیں بچوں کے لیے ہی تو لکھی تھیں۔ اور مرزا غالب نے بھی 'قادر نامہ' کے عنوان سے بڑی مزیدار تعلیمی نظم تخلیق کی تھی۔ غالب جیسے عظیم فلسفیانہ فکر کے اور مشکل پسند شاعر کس معصومانہ اسلوب اور سادہ زبان میں بچوں کو سکھا رہے ہیں کہ:

چاہ کو ہندی میں کہتے ہیں کنواں
دُود کو ہندی میں کہتے ہیں دھواں
ہندی میں عقرب بچھو کا نام ہے
فارسی میں بھوں کا ابرو نام ہے

کیا کہیں کھائی ہے حافظ جی سے مار
آج ہنتے آپ جو کھل کھل نہیں
جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا
اس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

ڈپٹی نذیر احمد اُردو کے ابتدائی ناول نگار کہے جاتے ہیں۔ ان کے اصلاحی ناول 'توبتہ النصوح'، 'بنات النعش'، 'مراۃ العروس' اُردو ادب کا کلاسیکی اثاثہ ہیں، لیکن انھوں نے بچوں کے لیے 'خالق باری' اور 'قادر نامہ' کی تقلید میں 'نصابِ خسروٗ' کے عنوان سے منظوم کتاب اور بہت سی سبق آموز کہانیوں کا مجموعہ 'منتخب الحکایات' اور 'چند پند' جیسی دلچسپ، سبق آموز اور مفید کتابیں لکھیں۔

لیکن اُردو میں افسانہ، ناول اور مقصدی شاعری کی طرح بچوں کے ادب کا باقاعدہ شعبے کی صورت میں آغاز انگریزوں کے دور میں ہوا جب اُردو عوام کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جدید نصاب کی ضرورت پیش آئی۔ فورٹ ولیم کالج کے جان گلکرسٹ اور اس کے بعد کرنل ہالرائڈ کے دور میں اُردو ادبِ اطفال کی تشکیل و تنظیم کا عمل شروع ہوا۔ اُس وقت لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی اور پیارے لعل آشوب نے اُردو میں بچوں کی نئی تعلیمی ضرورتوں کے لیے نثر و نظم میں جو کچھ لکھا اور جمع کیا آج کی ترقی یافتہ اُردو کے ادبِ اطفال کی اساس ہے۔ اس کے بعد تقریباً ہر بڑے شاعر و ادیب نے بچوں کے لیے لکھنا اپنا علمی فریضہ تصور کیا۔ بچوں کے لیے لکھی گئیں منظوم و نثری تخلیقات میں بچوں کے فطری تقاضوں، ان کی نفسیات، دلچسپی اور تفریحِ طبع کے ساتھ ان کی ذہنی صلاحیتوں کے فروغ اور شعور کی نشوونما کو ملحوظ رکھا گیا۔ انگریزوں کے عہد اقتدار میں تیزی سے ترقی کرتے ہوئے اُردو میں بچوں کے ادب نے بہت جلد ایسی اہمیت حاصل کرلی کہ بعض اہلِ دانش نے ادبِ اطفال کے لیے اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو وقف کردیا۔ مولانا اسماعیل میرٹھی ادبِ اطفال کی تاریخ کی ایسی شخصیت ہیں جنھیں اُردو کا کوئی طالب علم فراموش نہیں کرسکتا۔ اگر ہم بیسویں صدی کی ادبی تاریخ کے ایسے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کا مختصراً بھی تذکرہ کریں تو ایک ضخیم کتاب چاہیے۔ اس جگہ اُردو کے ادبِ اطفال پر محض ایک سرسری

نظر ڈالتے ہوئے صرف چند عظما کی بات کی جائے تو شاعرِ مشرق علامہ اقبال سب سے پہلے سامنے آتے ہیں جن کی شاہکار نظمیں طفل شیر خوار، بچہ اور شمع، عہدِ طفلی، نیا شوالہ، چاند اور تارے اور 'ایک آرزو' وغیرہ ہمارے ادبِ اطفال کا انمول سرمایہ ہیں۔

اُردو کے عہد آفریں افسانہ نگار پریم چند کے گلی ڈنڈا، نوک جھونک، نمک کا داروغہ، جگنو کی چمک، نئی دُنیا، اناتھ لڑکی اور عیدگاہ وغیرہ بڑوں کے ساتھ بچوں کے لیے بھی ہمیشہ زندہ رہنے والے افسانے ہیں۔ مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی نے بچوں کے لیے بھی خوب لکھا۔ جھینگر کا جنازہ، چڑیا چڑے کی کہانی، خانساماں شہزادہ، چیتے کی سرگزشت، دیا سلائی جیسی مزیدار کہانیاں لکھیں تو ان کی اہلیہ محترمہ خواجہ بانو بھی کیوں پیچھے رہتیں۔ آخر کو وہ ایک شفیق ماں اور ذہین استانی کی طرح بچوں کی تعلیم و تربیت کی دلدادہ تھیں۔ انھوں نے 'بچوں کی کہانیاں' کے عنوان سے اپنی مزیدار اور بامقصد کہانیوں کا مجموعہ شائع کیا جس میں 'بدتمیز مینڈک'، 'عقلمند کی دوربلا'، 'کھیل تماشوں کا مینہ'، 'چڑیا چڑیا پٹ کھول دے' اور 'چوہیا نے ہاتھی سے پاؤں دبوائے' ایسی کہانیاں ہیں جو بچوں کی نفسیات کے مطابق اعلیٰ درجے کے ادبِ اطفال کے زمرے میں آتی ہیں۔ ڈرامہ 'انارکلی' کے خالق، عورتوں کی تعلیم و تربیت کے مشہور رسالے 'تہذیبِ نسواں' اور بچوں کے اوّلین رسالے 'پھول' کے ایڈیٹر امتیاز علی تاج نے بچوں کے لیے ڈھیروں کہانیاں لکھیں۔ 'موت کا راگ'، 'چڑیا خانہ'، 'پرستان'، 'بچوں کی بہادری' وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں جو برِصغیر کے لاکھوں بچوں نے پڑھی ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے خوبصورت نظمیں بھی لکھیں۔ ان کی بیگم حجاب امتیاز علی نے بھی، جو ہیبت ناک افسانوں کے لیے مشہور تھیں، بچوں کے لیے اعلیٰ درجے کی فنتاسی کہانیاں تحریر کیں۔ اُردو کے نامور مزاح نگار عظیم بیگ چغتائی نے بچوں کے لیے 'بحرِ جنوبی کا سفر' کے نام سے پراسرار سمندری مہمات پرمبنی ناول لکھا۔ انھوں نے انگریزی کے مشہور مہماتی ناول 'رابنسن کروسو' کا اُردو میں 'قصرِ صحرا' کے نام سے ترجمہ بھی کیا۔ عظیم بیگ چغتائی بچوں کے سب سے پہلے ناول نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے صدرِ جمہوریہ اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین کی مزیدار کہانی 'ابوخاں کی بکری' اور ان کی دوسری کہانیاں پورے ملک کے بچوں اور بڑوں نے پڑھی ہیں۔ عظیم ادیبہ قدسیہ زیدی کی کہانیاں 'انوکھی دُکان'، 'گلابی چوہیا' اور 'غبارے' اور معلوماتی کتاب 'دُنیا کے جانور' بہت مشہور ہوئیں۔ مشہور ناول نگار ایم اسلم سماجی ورومانی ناولوں کے مقبولِ عام مصنف تھے، لیکن انھوں نے بچوں کے لیے بھی دلچسپ ناول 'باورچی شہزادہ' لکھا۔ مقتدر دانشور پروفیسر عبدالغفور نے بچوں کے لیے درجنوں مزیدار کہانیاں اور معلوماتی مضامین لکھے۔ ڈاکٹر سلامت اللہ نے بچوں کے لیے سائنسی موضوعات پرمبنی بہترین معلوماتی کتابیں تصنیف کیں، جن میں 'ستاروں کے جھمکے'، 'سورج کے گرد زمین کا چکر'، 'چاند گرہن'، 'سورج گرہن' وغیرہ آج بھی یاد کی جاتی ہیں۔ بچوں کے لیے انھوں نے بلجیم اور اٹلی کی جغرافیائی معلومات پرمبنی کتابوں کے علاوہ جنرل نالج کی کتابیں 'میرے اندر کیا ہے' اور 'سوتاریخی واقعات' تالیف کیں۔ حامد اللہ افسر اسماعیل

میرٹھی کے بعد بچوں کے سب سے بڑے شاعر کہے جاسکتے ہیں، جن کی بیشتر نظمیں اُردو کے بنیادی تعلیمی نصاب کا حصہ ہیں اور ہر اُردو دانوں کے حافظے اور زبان پر زندہ ہیں۔ افسر صاحب کے بعد شفیع الدین نیر کا نام ادبِ اطفال میں سب سے نمایاں ہے۔ وہ بچوں کے اچھے شاعر و ادیب ہونے کے ساتھ ماہرِ تعلیم بھی تھے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی نظمیں بھی داخلِ نصاب ہیں اور آج تک بلامبالغہ کروڑوں اُردو طالب علم پڑھ چکے ہیں اور پڑھ رہے ہیں۔ شفیع صاحب نے تین درجن سے زیادہ نثری کتابیں بچوں کے لیے تصنیف کیں جن میں 'گلگلے کی دوڑ'، 'مکھن کا ڈبہ'، 'ڈھول کا بول'، 'انوکھی چھتری'، 'منی کا پرستان'، 'پرستان کی سیر'، 'بطخ شہزادی'، 'آٹے کا پتلا'، 'یادگار انگوٹھی' اور 'طلسمی بینا' کبھی نہ بھلائی جانے والی کہانیاں ہیں۔ نامور مزاح نگار شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، احمد جمال پاشا، یوسف پاپا، مشہور فکشن نگاروں میں خان محبوب طرزی، اے آر خاتون، سہیل عظیم آبادی، عادل رشید، اظہار اثر، زکی انور، انیس مرزا اور عطیہ پروین تک لگ بھگ سبھی نے بچوں کے لیے لکھا ہے۔ نامور افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، رام لعل، رضیہ سجاد ظہیر، واجدہ تبسم سبھی نے بچوں کے لیے اپنا ادبی فرض ادا کیا ہے۔

بین الاقوامی شہرت یافتہ افسانہ نگار کرشن چندر کے فنتاسی ناول 'اُلٹا درخت' اور 'ستاروں کی سیر' اپنے سائنسی موضوعات، دلچسپ اندازِ بیان اور کہانی کی ندرت کے لحاظ سے اُردو ادبِ اطفال کے بیش بہا شاہکار ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی اُردو ادب کی سب سے نمایاں خاتون فکشن نگار قرۃ العین حیدر نے بچوں کے لیے جو کچھ لکھا وہ اپنی مثال آپ ہے، 'جن حسن عبدالرحمٰن'، 'شیر خاں'، 'بھیڑیے کے بچے'، 'بہادر' اور 'لومڑی کے بچے' اُردو بچوں کے لیے ہمیشہ تازہ رہنے والی سائنسی معلومات سے بھرپور دلچسپ کہانیاں ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے یہ کتابیں انگریزی سے اُردو میں منتقل کرکے اُردو کے ادبِ اطفال کی قدروقیمت میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر کی طرح بچوں کے لیے اور بہت سے عمدہ ناول لکھے گئے۔ میرزا ادیب نے 'پہاڑ کی چوٹی پر' اور 'اُستانی جی' لکھے تو عصمت آپا نے 'تین اناڑی' لکھ کر بچوں کو ہی نہیں بڑوں تک کو پراسرار دُنیاؤں کی سیر کرادی۔ دیوان بیرندر ناتھ ظفر پیامی نے 'ستاروں کے قیدی' لکھ کر معاصر سائنس فکشن لکھنے والوں کو چنوتی دے ڈالی۔ بچوں کے خالص ادیب دلّی کے فوٹوگرافر سراج انور نے 'خوفناک جزیرہ'، 'کالی دُنیا' اور 'نیلی دُنیا' جیسے تحیرخیز ناول لکھ کر اُردو دنیا کے بچوں کو ہی نہیں بڑے بوڑھوں کو بھی حیرانی میں ڈال دیا۔ مظہرالحق علوی انگریزی کے ڈراکیولا جیسے ہیبت ناک ناولوں کے اُردو ترجموں کے بادشاہ تھے۔ انھوں نے بچوں کے کئی انگریزی ناول اپنے خاص انداز میں ترجمہ کر ڈالے جو دائمی یادگار بن گئے۔ اتنے ناول چھپے کہ گنتی نہیں کی جاسکتی۔ بچوں کے لیے اچھے اچھے ناول ہی نہیں ڈرامے بھی لکھے گئے، پڑھنے کے ساتھ کھیلے بھی گئے۔ آغا حشر نے 'نیکی اور بدی کا مباحثہ' لکھ کر بچوں کو نیکی اور پاکیزگی کا سبق دیا تھا۔ عظیم بیگ چغتائی نے 'نوجوان ڈاکٹر' کا تماشہ دِکھا کر بچوں کو خوب ہنسایا تو علی عباس حسینی کیوں پیچھے رہتے، انھوں نے بھی 'دل بہلاوا' سے بچوں کو خوب بہلایا۔ شوکت تھانوی نے تو 'لاٹری کا ٹکٹ' لکھ کر ہنسی سے بچوں کو لوٹ پوٹ ہی

کر دیا۔ علی بابا چالیس چور کی کہانی بچوں کی سب سے من پسند کہانی ہے۔ اس پر مزیدار ڈراما لکھا اظہر افسر نے۔ کرشن چندر نے بچوں کا ڈرامہ 'گیند' لکھ دیا، خوب چلا، پسند کیا گیا۔ اطہر پرویز بچوں کے زبردست قلم کار ہیں۔ انھوں نے مشہورِ عالم سائنسداں گیلیلیو پر ڈرامہ لکھا، جو دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ مظفر حنفی نے 'تاج کی درگت' کے نام سے بچوں کو توہم پرستی سے دور رہنے کا سبق دیا۔ جگن ناتھ آزاد ماہرِ اقبالیات تھے، بڑے بڑوں کو اقبال پڑھایا تو بچوں کو بھی اقبال سے متعارف کرانے کا ڈھنگ نکالا 'ہندوستان ہمارا' کے نام سے خوبصورت علمی تعلیمی ڈرامہ لکھ کر۔ پروفیسر محمد حسن جتنے بڑے نقاد اور محقق تھے، اتنے ہی بڑے ڈرامہ نویس، ایکٹر اور ڈائریکٹر بھی تھے۔ 'ضحاک' لکھ کر حکومت کے عتاب میں آگئے تھے۔ انھوں نے بھی بچوں کے لیے پیارا سا ڈرامہ لکھا 'نظیر اکبر آبادی'، جو اُردو کے سب سے بڑے عوامی شاعر کا بہترین تعارف سمجھا جاتا ہے۔ بچوں کے لیے لاتعداد عمدہ ڈرامے لکھے گئے سب کا ذکر اس جگہ ممکن نہیں، البتہ کرشن گوپال عابد کی 'شیطانی گھنٹی' نے بچوں کے ساتھ بڑوں کو بھی خوب ہنسایا تھا۔ پہلے تو ایک چلڈرن فلم سوسائٹی بھی سرگرم تھی، بچوں کی بڑی بڑھیا فلمیں بناتی تھی، اُردو لکھنے والوں کو بھی کئی بار چانس ملا۔ خواجہ احمد عباس جیسے فلم ساز اور ادیب اب نایاب ہیں۔

اُردو ادبِ اطفال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عہد کے تمام بڑے فکشن نگاروں کے ساتھ ساتھ شعرائے کرام بھی بچوں کے لیے طبع آزمائی میں پیچھے نہیں رہے۔ حفیظ جالندھری، تلوک چند محروم، اختر شیرانی، غلام مصطفیٰ تبسم، وامق جونپوری، یکتا امروہوی، غلام ربانی تاباں، ساحر لدھیانوی، راجہ مہدی علی خاں، جگنا ناتھ آزاد، قتیل شفائی، کیف احمد صدیقی، حرمت الاکرام، شوکت پردیسی، علقمہ شبلی، مسعودہ حیات، نریش کمار شاد، ظفر گورکھپوری، ناوک حمزہ پوری، خضر برنی، سلام مچھلی شہری، خلیل الرحمٰن اعظمی جیسے نامور شعرا کے ساتھ ساتھ لاتعداد نئی نسل کے شاعروں نے بچوں کے لیے بڑی صحت مند شاعری کی ہے، لیکن اُردو ادبِ اطفال کی ایک اور اہم خصوصیت مستقبل کے تذکرہ نگاروں کو حیرت زدہ کرتی رہے گی کہ اردو کے تخلیقی ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کے ناقدین، محققین اور دانشوروں نے بھی بچوں کے لیے بڑی محبت اور خلوص کا عملی مظاہرہ کیا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بچوں کے لیے دلچسپ موضوعاتی مضامین کے ساتھ ساتھ خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔

'ایورسٹ کی داستان' اور 'ننگا پربت' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ پروفیسر نورالحق ہاشمی، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر مظفر حنفی اور پروفیسر شمیم حنفی جیسے سرکردہ دانشور اپنے عالمِ شباب میں بچوں کے لیے مسلسل لکھتے رہے۔ مظفر صاحب نے خوبصورت نظموں کے علاوہ درجنوں کہانیاں، ڈرامے اور معلوماتی تربیتی مضامین لکھے۔ ان کا ایک مزاحیہ ڈرامہ 'بندروں کا مشاعرہ' اُردو کے ادبِ اطفال میں ناقابلِ فراموش تحریر ہے۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ 'نیلا ہیرا' بچوں کے لیے ہی نہیں بڑوں کے لیے بھی دلچسپ ترین ادبی تحفہ ہے۔ دراصل پروفیسر مظفر حنفی ماہرِ تعلیم ہیں، انھوں نے بچوں کی اخلاقی، علمی اور ادبی تربیت کو اپنی نثری و منظوم تخلیقات میں پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔

پروفیسر شمیم حنفی کا شمار موجودہ عہد کے صاحبِ نظر ناقدین میں ہوتا ہے۔ شمیم صاحب نے بچوں کے لیے بہترین ادبی معلوماتی کتابیں تالیف کی ہیں جن میں 'بچوں کے اقبال'، 'چکبست کے اشعار' اور 'اندرا گاندھی کی کہانی' خاص اہمیت کی حامل ہیں، لیکن بچوں کے ادب سے ان کی دلچسپی اور خلوص کا نمونہ دلچسپ کہانی 'بھوتوں کا جہاز' ہے۔

اُردو ادب کی تعلیمات، علم نصاب اور بچوں کی نفسیات کے ماہر ڈاکٹر خوشحال زیدی کہنہ مشق شاعر، صاحبِ طرز ادیب اور فاضل معلّم ہیں۔ انھوں نے اپنی منصبی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے متعدد دلچسپ کہانیاں اور معلوماتی مضامین لکھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'اُردو میں بچوں کا ادب' کے عنوان سے نہایت اہم تحقیقی کتاب ہے۔ اُردو کے عصری ادب کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کی اوّلین کاوش ہے۔ اس کتاب میں زیدی صاحب نے برِصغیر میں اُردو ادبِ اطفال کی اہم شخصیات کا مختصر لیکن جامع تذکرہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی تناظر میں ادبِ اطفال کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔

بچوں کے ادب کے ضمن میں یہ اب سے پچیس تیس برس پہلے کی اجمالی بلکہ سرسری تصویر ہے، جب نہ صرف اُردو کے لاتعداد ادیب اور شاعر بچوں کے لیے لکھ رہے تھے اور اُردو بچوں کی اکثریت ان کی کاوشوں سے استفادہ بھی کر رہی تھی۔ بچوں کے ملک گیر رسالے نکل رہے تھے جن میں 'پھول'، 'پھلواری'، 'پیامِ تعلیم' اور دہلی سے دور دراز شہروں سے شائع ہونے والے چھوٹے چھوٹے جریدوں کے علاوہ پورے برِصغیر میں جہاں جہاں بھی اُردو ہے وہاں وہاں تک رسائی رکھنے والا کثیر الاشاعت ماہنامہ 'کھلونا' آب و تاب سے شائع ہو رہا تھا۔ 'کھلونا' اُردو صحافت کی تاریخ کا پہلا اور آخری جریدہ تھا جس نے عہد ساز ادیبوں اور شاعروں کو بچوں کے لیے لکھنے پر متوجہ کیا۔ تخلیقی صلاحیتوں سے آراستہ کتنے ہی نوخیز قلمکار 'کھلونا' کے ذریعے ہی بڑے ادیب بنے۔ ہم نے بھی بچوں کا ایک جاسوسی ناول 'خطرناک چہرے' لکھا تھا، جو 'کھلونا' کی زندگی کے آخری ایام میں قسط وار چھپا۔ 'کھلونا' کیا بند ہوا پھر ویسا لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔

جامعہ ملیہ کے 'پیامِ تعلیم' نے بھی بڑی خدمت انجام دی۔ اس رسالے کے ذریعے بہت سے بڑے لکھنے والوں کی تخلیقات سے لاکھوں بچوں کی تربیت ہوئی، لیکن پھر وقت نے کروٹ لی اُردو زبان اور تہذیب کے ساتھ سیاست دوراں کی ستم ظریفی اور نامنصفی رنگ لائی۔ بچوں کا ادب پڑھنے والی نسل عمر رسیدہ ہوگئی۔ نئی نسل اُردو سے دور کر دی گئی۔ رسالے، کتابیں خرید کر پڑھنا موقوف ہوا۔ 'کھلونا' ٹوٹ گیا، 'پھلواری' اُجڑ گئی، 'پیامِ تعلیم' کی آواز گھٹ گئی۔ بچوں کی صحافت اکا دُکا روزنامہ اخباروں کے ہفتہ واری کالموں تک رہ گئی۔ کہانیاں لکھنے والے غائب ہو گئے۔ خریدنے والے نہ رہے تو بچوں کی کتابیں چھاپنے والے بھی ناپید ہو گئے۔ اب اُردو کی بنیادی تعلیم اگر برائے نام کہیں ہے بھی تو کیا، وہ تہذیبی ماحول ہی نہیں رہا جس میں اُردو بچوں کے کام آسکے۔ بچے اب ٹی وی کارٹون چینلز دیکھتے ہیں۔ ہیری پوٹر یا تنالی رامن اور چاچا چودھری سے جی بہلاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہندوستان میں بچوں کے لیے اُردو میں لکھنے والے کہیں کھو گئے ہیں۔ دکن کے دیارِ اُردو میں ابھی کچھ رمق باقی ہے مگر پورے شمال کا مطلع صاف ہے۔ اتنی بڑی دلّی میں صرف ایک رسالہ 'اُمنگ' اُردو اکادمی فرضِ کفایہ کے طور پر چھاپتی ہے، جسے خریدتے اور پڑھتے کسی بچے کو نہیں دیکھا۔ اُردو صحافت اور اشاعت زوروں پر ہے، مگر بچوں کے لیے لکھنے والے تلاش کرو تو ساری دلّی میں لے دے کر عادل اسیر نظر آتے ہیں ادبِ اطفال کا پرچم اور اپنی لکھی اور چھاپی کتابوں کا بوجھ اُٹھائے، بچوں کے اکلوتے کل وقتی قلمکار، ہاں شاعروں، تنقید نگاروں اور اسکالروں کی خوب دھوم دھام ہے۔ ہر طرف کمپیوٹر چل رہے ہیں، دفتر کے دفتر چھپ رہے ہیں، مگر بچوں کے لیے لکھنے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ دانشور نما ناقدین اور محققین کی تو مجبوری ہے، جنھیں بالعموم اور بچگانہ لکھنے کی مشق نہیں، لیکن تخلیق کاروں کو کیا ہوگیا ہے؟ کاش ہم سبھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں۔

■

Farooque Argali, 25, Ganesh Park,
Rasheed Market, Delhi - 110051
Mob. 9212166170

بچوں کے ادب کی اہمیت وافادیت

ابنِ آدم

'تجسّس' انسانی فطرت کا اساسی پہلو ہے۔ خواہ وہ بچپن ہو، جوانی ہو یا بڑھاپا یا عمر کا کوئی حصّہ ہو 'تجسّس' ہر وقت انسان کا رہنما، استاد اور بعض اوقات بڑے کارناموں کے انجام دینے کا باعث بھی ہوتا ہے۔ اپنے بچپن میں ہی ہر شے کے لیے تجسّس، چیزوں سے متاثر ہونے کی صلاحیت، نتیجہ اخذ کرنے اور نقل کرنے کی قابلیت اپنے نقطۂ عروج پر ہوتی ہے۔ یعنی انسان اپنے بچپن میں بہت حساس ہوتا ہے۔ انسان بچپن میں جن اشیا کو دیکھتا ہے، جن کی جانب متوجہ ہوتا ہے یا جن کا استعمال کرتا ہے ان کے متعلق مکمل معلومات حاصل کرنے کا مشتاق ہوتا ہے۔ اتنا ہی نہیں انسان کو اپنے بچپن میں خوف، حیرت، اُمیدیں، انکشافات، خوشی، غم، حقیقت، فریب اور تجربات حاصل کرنے کی خواہش اس قدر شدید ہوتی ہے کہ یہ عمر کے کسی اور حصّے میں نہیں پائی جاتی۔ یہ عمر ایک تعمیری اور تشکیلی عمر ہوتی ہے۔ یہی عمر شعوری، نفسیاتی، فطری، جسمانی اور سماجی ارتقا اور نشو ونما کی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں تخیلات پیدا ہوتے ہیں۔ تصورات کے چشمے پھوٹتے ہیں اور نئے احساسات، جذبات اور نظریات کی کونپلیں نمودار ہوتی ہیں۔ پانچ برس کی عمر دیکھنے، سننے، دوڑنے، گرنے اور کچھ نہ کچھ کرنے کی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں بچہ اپنے افرادِ خاندان میں دلچسپی لیتا ہے اور اپنے قریبی رشتہ داروں کی شناخت کرتا ہے۔ مثلاً والدہ، والد، بھائی، بہن، دادی، دادا، نانی اور نانا وغیرہ۔ اسی طرح وہ اطراف میں موجود جانوروں کا بھی مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ اُنھیں بغور دیکھتا ہے، اُن کی آوازیں سنتا ہے اور نقل بھی کرتا ہے۔ چونکہ اس عمر میں بچوں کے مزاج میں تلوّن پایا جاتا ہے اس لیے انھیں سہل زبان والی، سادہ جملوں والی، کم کرداروں والی، خوش رنگ تصاویر کی حامل مختصر کہانیاں پسند آتی ہیں۔ جن کہانیوں میں ان کے تصورات کو پَر لگانے کا نسخہ موجود ہوتا ہے اُنہی کہانیوں سے انھیں تسکین حاصل ہوتی ہے۔ غم آمیز، بوجھل اور افسانوی کہانیاں انھیں خوش نہیں کرسکتیں۔ اس عمر میں گیت اور ایسی نظمیں دل میں پیوست ہو جاتی ہیں، جن میں آسان لفظیات، الفاظ کی تکرار، صوتی آہنگ اور ترنم کی خوشگواری شامل ہو۔ پانچ برس سے کم عمر بچوں کو اکثر وبیشتر کہانیاں و نظمیں صرف سنائی جاتی ہیں۔ جو سماعت سے فہم اور محاکات تک بچوں کے ذہن کی رہنمائی کرتی ہیں۔

انسان کا ماحول واطراف اس کے ذہنی ارتقا پر بھرپور طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر ہم موازنہ کریں تو بڑوں کے مقابلے میں بچوں کے مسائل نہایت صاف وشفاف اور آسان ہوتے ہیں۔ بچے حقیقت، فسانہ، سچ، جھوٹ، فریب، اچھے، بُرے، خوشی، غم، انصاف اور ناانصافی کے فرق کو سمجھتے ہیں۔ اسی لیے بچوں کے ادب کی تخلیق عرق ریزی کے ساتھ خونِ جگر بھی چاہتی ہے۔

یہ مقام چھ (6) سے بارہ سال تک کے بچوں پر مشتمل ہوتا ہے اور یہی خصوصیت سے پرائمری تعلیم کا بھی مقام ہوتا ہے۔ ادنیٰ عمر کے بچے ابتدائی تعلیم کی مہارت سیکھ رہے ہوتے ہیں۔ متوسط ابتدائی تعلیم کے بچے یہ مہارتیں سیکھ چکے ہوتے ہیں۔ البتہ کسی قدر خام ہوتے ہیں اور اعلیٰ ابتدائی تعلیم کے بچے سہولت کے ساتھ کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ لہٰذا ان تینوں سطحوں کے لیے مناسب تعلیمی مواد فراہم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقام پر بچے اپنے گرد وپیش کی دُنیا میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اُنھیں اشخاص میں بھی دلچسپی ہوتی ہے، لوگ کیا سوچتے ہیں؟ کیا محسوس کرتے ہیں؟ ان کا رہن سہن، لباس اور طور طریق کیسا ہے؟ یہ بھی اُن کے تجسّس کا محور ہوتا ہے۔ انھیں کہانیاں سننے سے زیادہ پڑھنے میں دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کے لیے کہانیوں کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کہانی کسی قدر پیچیدہ ہو مگر زیادہ مشکل نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی کہانی دلچسپ ہو، رواں دواں ہو، آگے بڑھتی جائے تاکہ ننھے قارئین میں مطالعے کا شوق کم نہ ہو۔ بچوں کی عمر کے چھ سے نو سال کے دورانیے میں نظمیں اور کہانیاں بچوں کو سنائی جاتی ہیں اور کسی قدر انھیں خود پڑھنے کے لیے بھی دی جاتی ہیں۔ بچوں کی کہانیوں کا پلاٹ ایسا ہو کہ جس سے بچے مانوس ہوں۔ کہانی کے مطالعے کے وقت انھیں یہ محسوس ہو کہ کہانی کی فضا ان کے لیے جانی بوجھی ہے۔ یہ ان کی اپنی تخیلاتی دُنیا ہے۔ کہانی کے کردار بچوں کی عمر سے بڑے ہوں

تو بچے ان کرداروں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ مخاطراتی (Horror) کہانیاں بھی بچوں کو اچھی لگتی ہیں۔ سائنس کے نئے نئے کرشمے بچوں کے لیے دل کشی کا باعث ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی عمر اور لسانی استعداد کے لحاظ سے انھیں ایسی کتابیں پڑھنے کے لیے دینی چاہئیں جن سے ان کی نظر میں وسعت پیدا ہو اور ان کی معلومات میں اضافہ بھی ہو۔ اس عمر میں بھی بچوں کے ادب میں نظم کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ نظموں کے مطالعے سے ان کی زبان میں شائستگی اور شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ اُردو میں ایسی بیانیہ نظموں کی کمی نہیں ہے۔ نظیر اکبرآبادی، شاعر مشرق علامہ اقبال، محمد حسین آزاد مولانا اسماعیل میرٹھی اور اکبر الہ آبادی کی نظمیں اُردو ادبِ اطفال کی بہترین مثال ہیں۔

انسان تیرہ سے چودہ برس تک بڑی تیز رفتاری سے ذہنی اور جسمانی نشو و نما کے مختلف مدارج طے کرتا ہے۔ اگرچہ کہ اس نشو ونما کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے مگر یہی نشو ونما، تبدیلیاں اور ترقیات انسانی فطرت اور نفسیات کی بنیادیں ہوتی ہیں۔ ہر لحظہ زندگی میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان تجربات اور تبدیلیوں سے انسان علم حاصل کرتا ہے اور معاملات یہاں تک آتے ہیں کہ نہ صرف اس کا جسم بلکہ ذہن بھی پختگی پالیتا ہے۔ انسان کا ماحول واطراف اس کے ذہنی ارتقا پر بھرپور طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر ہم موازنہ کریں تو بڑوں کے مقابلے میں بچوں کے مسائل نہایت صاف وشفاف اور آسان ہوتے ہیں۔ بچے حقیقت، فسانہ، سچ، جھوٹ، فریب، اچھے، بُرے، خوشی، غم، انصاف اور ناانصافی کے فرق کو سمجھتے ہیں۔ اسی لیے بچوں کے ادب کی تخلیق عرق ریزی کے ساتھ خونِ جگر بھی چاہتی ہے۔

یہی وہ نکات ہیں جو بچوں کے ادب کو بڑوں کے ادب سے منفرد، مختلف اور ممتاز بناتے ہیں۔ چونکہ بچوں اور بڑوں کی فطرت اور نفسیات میں نہ صرف فرق پایا جاتا ہے بلکہ دونوں کے تقاضات بھی مختلف ہوتے ہیں اسی لیے بڑوں کے ادب اور بچوں کے ادب میں بھی بہت فرق واقع ہوتا ہے۔ فن کے نظریات کے تحت بچوں کے ادب کی تخلیق بڑوں کے ادب سے مشکل ہوتی ہے۔ بقول شخصے ''بچوں کا ادب تخلیق کرنا، بچوں کا کھیل نہیں ہے۔'' بڑوں کے ادب کا خالق اپنے تجربات اور حقائق کی روشنی میں اپنے فن کے ذریعے اپنے عہد کو پیش کرتا ہے۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنے والا بچوں کی فطرت اور نفسیات کا عالم ہوتا ہے۔ وہ اپنے ادب کو بچوں کی فطرت اور نفسیات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کرتا ہے۔ تاکہ ننھے قارئین کو اس کے ادب کے مطالعے سے نہ صرف حظ ومسرت حاصل ہو بلکہ وہ اس کے ادب کی گہرائی میں موجود ادب کے موضوع اور مقصد تک بھی رسائی حاصل کرسکیں۔ بچوں کے ادب کا موضوع اور مقصد چاہے کتنا ہی غیر اہم اور خشک کیوں نہ ہو، اگر تخلیق کار کی سلیس زبان اور اسلوبِ نگارش شگفتہ اور شیریں ہو جو بچوں کے دلوں میں اُتر جائے تو وہ کامیاب 'ادبِ اطفال' ہے۔ اس کے برخلاف ارفع خیال اور صادق جذبہ ہونے کے باوجود اگر ادب میں زبان کی لطافت اور بیان کا حسن شامل نہ ہو تو وہ تحریر بچوں کے لیے غیر دلچسپ اور خشک ترین ہو جائے گی جو کہ ظاہر ہے بے کار ہے۔

فنی اعتبار سے ادب اطفال کی تخلیق میں آورد کا دخل ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ ادیب یا شاعر ادب اطفال تخلیق کرتے وقت کسی تجربے یا احساس کی اُس کیفیت سے واقفیت نہیں رکھتا جس سے عام طور پر بڑوں کا ادب تخلیق کرتے وقت شاعر وادیب رکھتے ہیں۔ بڑوں کے ادب کا خالق اپنے عہد کا بصیر ہوتا ہے۔ زمانے کی رگ رگ سے واقف ہوتا ہے اور اپنی تخلیق میں اپنے عصر کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اس کے برخلاف ادب اطفال میں مصنف وشاعر کو بچہ بن کر تخلیقی کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔

بقول ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور) رقم طراز ہیں، ''یہ حقیقت ہے کہ ہر بچے میں فطری طور سے اچھائی، برائی، محبت، نفرت، بغض، عداوت، جدائی، ملاپ اور حسد ومقابلہ نرمی وسختی جیسے جذبات کسی نہ کسی سطح پر اُبھرے یا چھپے، ظاہر یا پوشیدہ حالت میں رہتے ہیں۔ ان کی تطہیر وتہذیب اور اُن کو صحت منداور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی طرف مائل کرنا بچوں کے ادیب کا قلم جس مہارت، عمدگی اور غیر محسوس ڈھنگ سے انجام دے سکتا ہے۔ وہ بعض لکچر اور براہ راست نصیحت سے ممکن نہیں۔ اُردو میں بچوں کے ادیب اپنی ذمہ داری اور مقدس کام کی عظمت سے غافل نہیں ہیں۔''

(بچوں کے ادب کی سمت ورفتار: سہ ماہی قرطاس جنوری تا اپریل 2013، ص18)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادیب الاطفال کو کن کن خصوصیات، عمرانوی عوامل اور نفسیاتی حربوں کا عالم ہونا چاہیے۔ ادبِ اطفال، بچوں کی ذہنی تربیت کا کس قدر مؤثر ذریعہ ہے جو عوامل براہ راست بچوں کی شخصیت پر اثر انداز ہونے سے قاصر رہ جاتے ہیں وہ خوبصورت کہانیوں، نظموں اور کرداروں کے پیکر کے توسط سے اُن کے اذہان پر دیرپا نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔

فنی اعتبار سے ادبِ اطفال کی تخلیق میں آورد کا دخل ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ ادیب یا شاعر ادبِ اطفال تخلیق کرتے وقت کسی تجربے یا احساس کی اُس کیفیت سے واقفیت نہیں رکھتا جس سے عام طور پر بڑوں کا ادب تخلیق کرتے وقت شاعر وادیب رکھتے ہیں۔ بڑوں کے ادب کا خالق اپنے عہد کا بصیر ہوتا ہے۔ زمانے کی رگ رگ سے واقف ہوتا ہے اور اپنی تخلیق میں اپنے عصر کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اس کے برخلاف ادب اطفال میں مصنف وشاعر کو بچہ بن کر تخلیقی کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنی تخلیق کے موضوع زبان اور اسلوب کو بچوں کی شعوری استعداد اور فطرت ونفسیات سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ ان تمام سعی کا نصب العین بچوں کو پند ونصائح، سبق آموز کہانیوں کے ذریعے ترسیل کرنا کہ یہ بچوں کے مزاج پر گراں نہ گزرے اور دیرپا مثبت اقدار کے اثرات بھی مرتب کردے۔ ایسا ادب بچوں کی نگہداشت اور پرورش کا بلا واسطہ مگر اہم ترین ذریعہ ہے۔

عہدِ قدیم میں انسان اپنی زندگی سے متعلق حادثات، مشاہدات، تجربات اور واقعات، کہانی اور قصّوں کی شکل میں ایک دوسرے کو سناتا تھا۔ عہدِ حاضر میں تمام ممالک میں ادبِ اطفال کی اہمیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ عالمی ادبِ اطفال میں ہندوستانی کہانیوں نے سب سے پہلے ادبی حیثیت حاصل کی۔ ان کہانیوں میں سنسکرت زبان کی مشہور تصنیف 'پنچ تنتر' ہے۔ 'پنچ تنتر' کی کہانیوں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کہانیوں نے صدیوں سے محض بچوں کی ہی نہیں بلکہ بڑوں کی بھی دلچسپی اور تفریح طبع کا سامان مہیا کیا ہے۔ ان کہانیوں کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ابتدا میں یہ فارسی زبان میں ترجمہ ہو کر 'ایران' اور پھر دُنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو کر مختلف ممالک میں مقبول ہوئیں۔

■

Ibne-Adam, 641/B, Nayapura, 5th lane, Malegaon. Dist - Nashik 423 203 (MS)

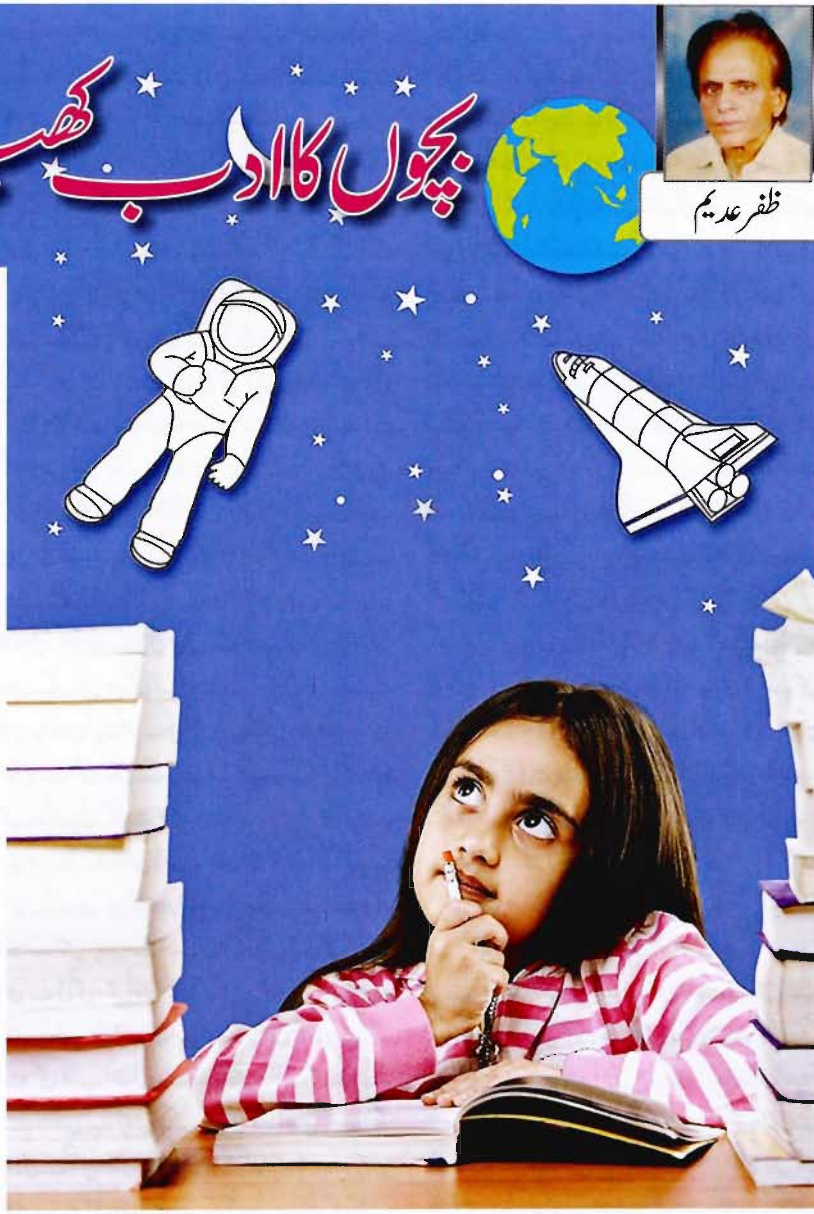

بچوں کا ادب کھیل نہیں!

ظفر عدیم

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — اس بازیچۂ اطفال کو ایک طفل اس عمر اور سن میں محسوس کرنے سے قاصر رہتا ہے جب دنیا اس کے نزدیک محض ایک تماشا گاہ ہوتی ہے ایک ایسی تماشا گاہ جس میں وہ اکیلا نہیں، بلکہ اپنے چند ہم عمر رفیقوں کے ساتھ مل کر سیر کرنا پسند کرتا ہے اور اس کی ذہنی کیفیات تماشا گاہ کی ان چیزوں سے متحرک ہوتی ہیں جن میں تنوع ہوتا ہے، ایسا اس لیے ہے کہ ایک بچے کی فطرت اپنی جگہ تبدّل پذیر رہتی ہے۔ انسانی فطرف کو پایۂ استحکام تک پہنچنے میں اتنا ہی وقت یا عرصہ لگتا ہے جتنا شعور کو پختگی تک پہنچنے میں لگتا ہے تب ہی ایک انسان میں بردباری اور اچھے برے کی تمیز آتی ہے۔ از روئے فطرت ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بچہ قبل از وقت سنِ شعور کی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو وہ آگے چل کر اپنی ذات میں ایک مثال ایک تاریخ بن جاتا ہے، یہ ایک استثنائے خاص ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک انسان شعور میں آنے کے بعد بھی شعوری اعتبار سے پختہ نہیں ہوتا تو اسے دنیا کے انقلابات وحوادث پر قابو پانے میں اتنا وقت لگتا ہے کہ حینِ حیات بھی کم پڑ جاتا ہے، پہلا معاملہ وضع ذات کا ہے اور دوسرا تضیعِ ذات کا اور یہ استثنا بالعموم ہے یعنی Commonly Exceptional۔ استثنائے خاص (Specific Exception) اور استثنا بالعموم کے بالفصل وہ عام بچے آتے ہیں جو دنیا کو تماشا گاہ سمجھتے ہوئے سنِ شعور کی پختگی تک پہنچتے ہیں۔ بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کا اگر کوئی ماہر نفسیات دعویٰ کرتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کا دعویٰ اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہے کہ جس پیمانے پر وہ ایک بچے کی نفسیات کو جاننے کی کوشش کرتا ہے، یہ وہ پیمانہ ہے جو پختہ سنِ شعور کے لیے آزمایا جاتا ہے جیسے علم نفسیات کا Response Mechanism یا پھر Stimulus اور Heredity کی بنیاد پر Case کو سمجھنے کی کوشش۔ جب کہ بچوں کے معاملے میں ظاہری جسم سے لے کر قلبی ماہیئت اور نروس سسٹم، پورا وجود شاخ پر لٹکے ایک ایسے پھل کی طرح ہے جس کا اندازہ دور سے نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بچوں کی نفسیات کو ہم بچوں پر تجربے کے ذریعے نہیں سمجھ سکتے، ان کی ذہنی کیفیات وخصوصیات کو ہم خود سنِ شعور سے بچوں کے شعور میں واپس جا کر ہی محسوس کرسکتے ہیں جیسا کہ غالب نے سنِ شعور میں محسوس کیا کہ بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے۔ اور دوسرے مصرعے میں بازیچۂ اطفال کیوں ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے بچوں کی ذہنی کیفیات کو بھی نفسیاتی نقطۂ نظر کے اعتبار سے ایک نفسیاتی نظیر (سائکلوجیکل کیس) کی طرح سامنے رکھ دیا کہ ''ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے — پس، اگر بچوں کی بھی کوئی سائکلوجی ہے تو صرف یہ ایک 'تماشا' — چنانچہ بچوں کا ادب تخلیق کرنے کے لیے ہمیں بچوں کی نفسیات کی تہہ میں جانے کی بجائے ہمیں خود لوٹ کر اپنے بچپن میں جانا ہوگا گویا ہمیں آج اپنے دیدۂ بینا سے بچپن کے نادیدہ تماشوں کو دیکھنا ہوگا کہ ایک بچہ، دنیا کو ایک تماشا گاہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا کہ اس کے پاس دنیا ایک تماشا گاہ کی طرح ہوتی ہے، نہ وہ عالم اسباب ہے نہ ہی وہ عالم آخرت جیسی کوئی چیز ہے کہ یہ ساری اشیائے ذات، وثبات شعور میں اس وقت یکجا ہوتی ہیں جب دماغ پر مذہب کا غلبہ ہوتا ہے، ورنہ ہر دماغ 'معصوم' ہے۔

بچوں کا ادب تخلیق کرنا کھیل (آسان) ہے یا نہیں، یہ تو بعد کی بات ہے، ہماری فکر کا فوری تقاضا یہ ہے کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنے کے لیے ہمیں واپس اپنے بچپن میں لوٹنا ہوگا۔ یہاں ایک سوال یا ایک نکتہ ہمارے سامنے ہے کہ کیا ہمارا بچپن آج کے بچپن سے میل کھاتا

ہے؟ یقیناً نہیں، پہلے گاڑی چھک چھک چلتی تھی کیونکہ بھاپ کی قوت اتنی نہیں تھی کہ پہیوں کے میکنزم میں سرعت پیدا ہو، رفتار کے لیے بھاپ نیچے آتی ہے پھر اوپر جاتی تھی تو اس وقفے میں مسلسل چھک چھک کی آواز نکلتی تھی۔ آج کا بچپن ڈیزل اور الیکٹرانک ٹرین کا ہم مزاج ہے۔ اسی طرح ہمارے بچپن کا سرکس، جہاں طرح طرح کے جانور، جوکر، کرتب باز ہوتے تھے، آج کے بچپن میں وہ سرکس کارٹون بن گیا ہے جسے بچے کسی رنگ ماسٹر کی مدد کی بجائے اپنے ہاتھ سے ریموٹ کی مدد سے آگے پیچھے کرتے ہیں، وہیں جو شیر اور ہاتھی ہمارے بچپن میں سامنے آتے تھے، ان سے بھی زیادہ اقسام کے جانور، پرندے، مچھلیاں کیڑے مکوڑے آج کے بچے اس طرح دیکھتے ہیں جیسے عجائب گھر، چڑیا خانے، دنیا بھر کے جنگل ان کے کمرے میں ان کی آنکھوں کے سامنے سجے ہیں اور آج کا بچپن ہمارے بچپن سے زیادہ جنرل نالج رکھتا ہے — یہ ساری حقیقتیں اپنی جگہ بجا ہیں اور اگر ہم آج کے بچپن کو اپنی دقیانوسیت کا درس دیتے ہیں تو اس سے ہمارا فرسودہ بچپن فائق نہیں ہو جاتا۔ لیکن ہمارے بچپن اور آج کے بچپن میں ایک خصوصیت ایسی بھی ہے جو مشترک ہے، وہ ہے Adopt اور Adapt کرنے کی خصوصیت اور ہر بچے میں یہ خصوصیت موجود ہے جو اسے چھوٹی سی عمر میں متجسس بناتی ہے، اور یہ چھوٹی سی عمر پالنے اور گھٹنے کے بل چلنے سے لے کر آٹھ سال اور پھر سنِ بلوغت تک اور بعض معاملات میں شعور کی پختگی تک جاری رہتی ہے چنانچہ بچوں کا ادب ان سارے مراحل اور مدارج پر محیط ہونا چاہیے۔ ہم ایک بچے کے آگے جو کچھ رکھتے ہیں، اسے وہ پہلے اختیار کرتا ہے اور پھر اسے اپنی مرضی سے تصرف میں لاتا ہے، کسی کھلونے سے بچہ کھیلنے لگتا ہے تو کبھی کسی کھلونے کو ہاتھ میں لے کر پھینک دیتا ہے۔ اس کھلونے کے بیک وقت دو اثرات اس کے ناپختہ شعور پر مرتب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کھلونا اس کے لیے لطف ہے اور دوسرا یہ کہ کھلونا اس کے لیے تماشا ہے جس میں وہ لطف محسوس کرتا ہے اس سے کھیلتا ہے اور یوں ہی نہیں کھیلتا بلکہ ہر کھلونے کو وہ زمین پر رکھ کر اپنے طور سے اسے تماشا بناتا ہے اور اس تماشے میں وہ ہم عمر رفیقوں کو بھی شامل کرنا چاہتا ہے۔ بچوں کی اس ذہنی کیفیت کے مطابق بچوں کے ادب میں 'تماشا' موجود ہونا ضروری ہے — یعنی تفریحی مواد! یہ 'تماشا' ہم بچپن میں لوٹ کر ہی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح بچے کو پتنگ میں مزہ اس لیے نہیں آتا کہ بازی جیتتی ہے بلکہ پتنگ کا ہواؤں میں تماشا اسے اچھا لگتا ہے — کرکٹ کے بلّے یا گیند سے اس کی دلچسپی نہ تو رن بنانے نہ کسی کو آؤٹ کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے بلکہ دوڑ لگانا اسے ایک تماشا لگتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اردو زبان میں بھی باتصویر کہانیاں آتی تھیں۔ ان میں کردار ہوتے تھے اور کرداروں کے مختصر مختصر مکالمات ایک مکمل پلاٹ کے ساتھ دیے جاتے تھے۔ ہم نے بھی ایسی کہانیاں پڑھی تھیں اور چالیس پچاس سال پہلے دوسرے بچوں نے بھی پڑھی ہوں گی جو آج ہماری عمر کے ہوں گے۔ ہمیں ان کہانیوں میں کیا چیز اپنی طرف مائل کرتی تھی؟ مکالمات سے زیادہ وہ کردار جو لکیروں سے بنی تصویروں میں ہمارے سامنے آتے تھے۔ ان تصویری کرداروں میں ہمیں تماشا محسوس ہوتا تھا اور اس سے لطف پیدا ہوتا تھا۔ اپنے زمانے کے کثیر الاشاعت بچوں کے رسالہ 'کھلونا' میں شائع ہونے والی تصویری کہانی 'میاں فولادی' کو آج کے اسّی سال کے لوگ بھی نہیں بھولے ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ 'کھلونا' کے سرورق پر سب سے اوپر یہ اعلان ایک نعرے کی شکل میں شائع ہوتا تھا: ''آٹھ سال سے اسّی سال کے بچوں کے لیے —'' اس فقرے میں وہ نفسیاتی کیفیت پوشیدہ ہے کہ بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے۔ میں دعویٰ تو نہیں کرتا مگر ایسا لگتا ہے کہ 'میاں فولادی' کی قسط وار (ماہانہ) کہانی لکھنے والے نے اگر اردو میں بچوں کے ادب کی بنیاد نہیں ڈالی تو آبیاری اسی نے کی تھی، میں نہیں سمجھتا کہ 'میاں فولادی' جیسا بچوں کا ادب اس کے بعد سے اب تک پھر تخلیق ہوا ہو، حالانکہ اردو کبھی ادب اطفال سے خالی نہیں رہی۔ گاہے گاہے لکھنے والوں نے بچوں کے لیے بھی لکھا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ بچوں کا ادب ہے؟ ٹی وی چینلوں کے چلن سے پہلے بھی بچوں کے واسطے جو لکھا گیا کہ وہ اس دور کے بچوں کے لیے نہیں تھا جب کہ میں اتنا دعویٰ ضرور کروں گا کہ آج اردو پڑھنے والے، کارٹون چینلوں کے شائق کسی بچے کے آگے 'میاں فولادی' کو رکھ دیا جائے تو وہ اس سے اسی طرح لطف اندوز ہوگا جس طرح ہم پچاس سال قبل میاں فولادی کے 'تماشے' سے محظوظ ہوتے تھے۔ تخلیق وہی ہے جو ہر وقت و زمان میں حسبِ حالات ہو۔ 'میاں فولادی' کے بعد کے عہد میں بچوں کے لیے تخلیق کیا گیا ادب غالباً ویسے ہی ہے جیسے اردو شاعری کی تضیعِ توانائی صنف 'رباعی' جہاں وعظ و پند کی خشکی میں جذبات کے پت جھڑ کا موسم پنپتا ہے۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ بچوں کے بھی اپنے مخصوص جذبات ہوتے ہیں جو ان کی ذہنی کیفیات سے مماثلت رکھتے ہیں ان میں سب سے بڑا جذبہ، جذبۂ انسانیت ہے جیسا میں نے کہا کہ کوئی بچہ مردم بیزار یا خلوت پسند نہیں ہوتا، وہ اپنی عمر کے بچوں میں یعنی اپنے سماج میں رہنا چاہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ودیعت انسانیت زمانے کی سیاست اور مذہب کی شدت سے آلودہ نہیں ہوتی ہے۔ بچے کی رگوں میں دوڑنے والے خون میں ماں کے دودھ کی تاثیر تازہ رہتی ہے اس لیے وہ ماں باپ دادا دادی، نانا نانی کے خون کے رشتے کو سب سے پہلے بھانپ لیتا ہے۔ بچہ خون دیکھنا پسند نہیں کرتا، خون کا فطری ادراک اس کے شعور کو وحشت زدہ رکھتا ہے، ایک شریر بچہ پتھر سے کھڑکی یا کار کا شیشہ توڑ سکتا ہے، ہوا میں یا ایک چھت سے دوسری چھت پر پتھر اچھال دیتا ہے، لیکن کسی بچے پر یا کسی چلتے آدمی پر کسی گداگر یا کسی پاگل پر پتھر نہیں مارتا، اس کے پیچھے دوڑے گا لیکن اسے نقصان نہیں پہنچائے گا — یہ اس کا جذبہ کسی کی تکلیف کا پیشگی فطری احساس ہے جو بعد میں شعور کی پختگی کے آخری مرحلے میں بے حسی میں تبدیل ہوتا ہے۔ بچے کی اس فطرت کی عکاسی غالب نے کیا خوب کی ہے:

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

بچوں کا ادب ان سارے عوامل پر مشتمل ہونا چاہیے۔ 'میاں فولادی' ایک بے ضرر انسان ہے اس لیے اس کے کردار کی یہ خصوصیت بچوں کے جذبات کو چھو لیتی ہے، میں تو کم پڑھا لکھا آدمی ہوں، میرا مطالعہ بھی محدود ہے، وسیع مطالعے والے ادبی حضرات بتائیں کہ بچوں کے نام پر جو ادب تخلیق کیا جا رہا ہے، اس میں کہیں 'بچہ' نظر آتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر کیا واقعی 'بچوں کا ادب' کھیل نہیں ہے؟ پوری قطعیت کے ساتھ اس پر صاد کرنا بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ پہلے زمانے میں بچوں کے ادب کی معنویت ہوتی تھی، ادبی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ تو پھر 'بچوں کا ادب' اردو میں کیوں غروب ہوتا جا رہا ہے —
میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ اردو زبان میں 'ادب' کی بتدریج نیستی ہے۔ یہ میں نہایت معذرت کے ساتھ عرض کر رہا ہوں۔ تیزی سے بدلتے ہوئے اصلاحات پسند زمانے میں ہم شاید ادب (لٹریچر) کی سرشت کو بھول گئے ہیں کہ یہ جذبات کے اظہار کی متقاضی ہے۔ جذبات ہی منجملہ فنونِ لطیفہ کی ترغیب دیتے ہیں اور یہی ترغیب تخلیق کا سبب بنتی ہے۔ اردو ادب کی سرشت 'تنقید' کی دراندازی سے غارت ہو رہی ہے جب

کہ 'تنقید' ادب اس لیے نہیں ہے کہ اس میں تخلیقیت نہیں ہوتی ہے، بہ ایں سبب اس میں جذبات نہیں ہوتے ہیں۔ بجز تنقید، ہر تخلیق ادب ہے، تنقید، ادب کے ساتھ ساتھ چلتی ہے بلکہ ہمیشہ تعاقب میں رہتی ہے تو اس لحاظ سے تنقید کو ایک Literalistic اپروچ کہا جاسکتا ہے بالفاظِ دیگر ایک ایسی جگت جو کسی متن یا سیاق وسباق کے مدِ مقابل، لطیف جذبات سے عاری ذوق کو استادہ کرنے کے لیے بالجبر لگائی جائے۔ پچیس تیس برس میں ہوا یہ ہے کہ ''پروفیسر ڈاکٹر صدر شعبہ اردو'' کی باڑھ سے ادب کا پشتہ یوں ٹوٹا ہے کہ تخلیق تو خانماں برباد ہوئی تنقید اسرائیل میں یہودیوں کی طرح آباد ہوگئی۔ آج زیادہ تر 'ادبی' درفش کے ساتھ کہیں کہیں لہرانے والے اردو رسائل پر اکثر تنقیدی ضحاک کا قبضہ نظر آتا ہے۔ نقاد حضرات مانیں یا نہ مانیں، ادب کہانی افسانہ اور شعر وشاعری کا تخلیق پارہ ہے، تنقید نامہ نہیں۔ جب تک ادب، تخلیق پارہ رہا، اردو رسائل وجرائد کی خاصی ریڈر شپ رہی جب سے ان پر تنقیدی مقالے مضامین اور نگارشات کا تسلّط ہوا، ان کی کساد بازاری کا دور شروع ہوا اور خریدار ایسے ناپید ہونے لگے کہ نام نہاد ادبی دکانیں بند ہونے لگیں۔ پچیس تیس سال پہلے بھی ان رسالوں کے ذریعے بچوں کا ادب کم ہی سہی قارئین تک پہنچتا رہا، عام طور پر شکایت کی جاتی ہے کہ ''ہمیں خریدار نہیں ملتے''۔ خریدار آخر خریدیں کیا؟ وہی حوالوں ریفرنسوں اور اقتباسات سے پٹے ہوئے مضامین جو اندر سے سب کے سب ایک ہی ذات برادری کے لگتے ہیں۔ پہلے رسالے گھروں میں پڑھے جاتے تھے، خواتین پڑھتی تھیں ان کے بچے پڑھتے تھے رسالے پڑھے اس لیے جاتے تھے کہ ان میں جذبات ہوتے تھے۔ قارئین ہر ماہ پڑھتے تھے اور بیزار نہیں ہوتے تھے کہ ان کے سامنے نئی نئی تخلیق ہوتی تھی۔ اب کیا پڑھا جائے؟ وہی خودی، بے خودی کا فلسفہ، آخر قوتِ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

آج بازار میں دستیاب رسائل میں بچوں کا ادب نہیں ہوتا ہے کیونکہ ''پروفیسر ڈاکٹر صدر شعبہ اردو'' بچوں کا ادب تخلیق نہیں کرتے کہ یہ ان کے لیے باعث ہتک ہے۔ البتہ جو رسائل بازار میں نظر نہیں آتے ان میں ڈیڑھ دو صفحات گاہے بہ گاہے گوشۂ اطفال کے عنوان سے نظر آجاتے ہیں یہ وہ رسائل ہیں جن کے مالی وسائل ہمیشہ ناغہ کرنے والے معدودے چند خریدار ہیں یا چند ایسے اللہ کے دردمند بندے ہیں جو ازراہِ ہمدردی تعاون کرتے ہیں۔ لیکن اس طرح کے گوشۂ اطفال میں بھی ڈھونڈے سے بمشکل کوئی 'بچہ' سا نظر آتا ہے۔ تو کیا یہ مان لیا جائے کہ بچوں کا ادب کھیل نہیں ہے۔ میرا دل نہیں مانتا! مجھے ایسا لگتا ہے کہ جہاں تنقید کے بڑھتے رواج نے ادب سے تخلیقیت چھینی ہے وہیں لٹی پٹی تخلیق سے جذبات بھی چھن گئے ہیں۔

ادبی رسائل میں شائع ہونے والی چند ایک تخلیقات (افسانہ، کہانی، یا شعر وشاعری) جذبات سے محروم کیوں ہوگئی ہیں؟ اس کی ایک تلخ وجہ ہے، جسے کہتے ہوئے خوف نادیدہ سے میرے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ ہم سرحد پار کی نام نہاد ادبی ایجادات واختراعات کو فیشن کے طور پر اپنانے میں بڑے ماہر ہیں۔ حالانکہ لفظ 'فکشن' انگریزی لغات میں معنی ومفہوم کے ساتھ ایک زمانے سے موجود ہے، لیکن اس کے باوجود انگریزی ناول لکھنے والے ناولسٹ اور کہانی لکھنے والے اسٹوری رائٹر ہی کہے جاتے ہیں۔ اچانک بیس پچیس سال پہلے ہمارے یہاں 'فکشن' اور 'فکشن نگار' یہ دو ادبی آئٹم آؤٹ سورس ہو کر ہمارے ادب کا اوڑھنا بچھونا بن گئے اور ہم اس فیشن میں اتنے ہی آگے نکل گئے کہ کہانی یا ناول کو فکشن کہنے لگے اور افسانہ نگار کو افسانہ نگار کہنا بھول گئے اور فکشن نگار کہنا اپنی شان سمجھنے لگے۔ ایک اچھے خاصے رسالے کے بہت زیادہ پڑھے لکھے مدیر کو بر سبیل گفتگو میں نے اپنے کسی ناول کے بارے میں بتایا تو وہ پوچھ بیٹھے ''یہ فکشن ہے؟'' یہ سن کر میں سٹپٹا گیا، سوچنے لگا کہ انگریزی ڈکشنریوں میں فکشن کے جو معنی دیے گئے ہیں وہ بدل گئے یا اردو ادب میں جتنی کہانیاں لکھی گئیں وہ سب رائیگاں چلی گئیں؟ آپ غور کیجیے؟ افسانہ یا کہانی میں کوئی لغوی فرق نہیں ہے۔ کچھ لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ کہانی تو سچی ہوتی ہے، افسانہ بالکل فرضی اور جھوٹا ہوتا ہے۔ یہ غلط فہمی ہے۔ دونوں معنوی اعتبار سے ایک ہیں، صرف زبان کا فرق ہے۔ افسانہ فارسی لفظ ہے جبکہ کہانی اردو ہندی، دونوں سرگزشت ہیں، دونوں روداد ہیں، دونوں قصے اور حکایت ہیں، دونوں حقیقی بھی ہوسکتے ہیں اور فرضی بھی۔ Fiction صرف اور صرف فرضی، قیاسی یا گھڑی ہوئی اسٹوری کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ ناؤن (Noun) ہے اور Fictitous اسی کی ایڈجیکٹیو (Adjective) جس کے معنی بناوٹی، مصنوعی، غیر حقیقی ہیں۔ جب سے ہم فکشن

پروفیسر مظفر حنفی

پروفیسر مظفر حنفی

مجھے بچپن سے ہی پڑھنے کا مرض لاحق ہے لڑکپن میں کہانیاں اور نظمیں لکھنے کی لت پڑ گئی جس میں تا حال مبتلا ہوں۔ گھر اور پھر اسکول میں صبح تا شام 'یہ کرو، یہ مت کرو' کی پابندیاں، والدین اور بڑے رشتے داروں سے لے کر اساتذہ تک نصیحتوں کے پٹارے، آزادانہ سوچنے، کھلی فضا میں سانس لینے اور اپنی پسند کی چیزیں پڑھنے کو جی ترستا تھا۔ درسی کتب سے مہلت پاتے ہی نظموں اور کہانیوں کی تلاش میں لگ جاتا جن میں بچوں کی شوخیوں، شرارتوں، حماقتوں اور دلچسپیوں اور مہمات کا ذکر ہو۔ عظیم بیگ چغتائی کا 'قصر صحرا' حفیظ جالندھری کے مرتب کردہ 'عمر و عیار' کے کارنامے اور اُن کی نظم 'بول مرے مرغے کگڑوں کوں' جیسی نگارشات، جنھیں مزے لے لے کر پڑھا جاسکے، دوستوں کو سنایا جاسکے۔ آگے چل کر کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، راجہ مہدی خاں کی تحریریں سمندِ شوق پر تازیانے لگاتی رہیں علوے فکر کو مہمیز کرتی رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو میں ادبِ اطفال کا ارتقا بڑے کشادہ اور آزاد ماحول میں ہوا۔ میر کی موہنی بلی، غالب کی بچوں کی اُچھل کود سے متعلق نظمیں (ہر چند کہ وہ قادر نامہ جیسی درسی تصنیف میں شامل ہیں) نظیر اکبر آبادی کی 'گلہری کا بچہ' جیسی درجنوں منظومات، اقبال کی 'پہاڑ اور گلہری' جیسی تخلیقات ایسی ہیں کہ بچے اپنے طور پر تلاش کرکے پڑھتے ہیں۔ پھر وہ دور آیا کہ محمد حسین آزاد، مولانا حالی، اسماعیل میرٹھی وغیرہ نے درسی کتابوں کے لیے مختلف موضوعات پر نظمیں اور کہانیاں لکھیں جن میں ادبی چاشنی کے ساتھ ڈھکے چھپے انداز میں پند ونصیحت بھی شامل تھے اور پھر وہ زمانہ آگیا کہ شفیع الدین نیر جیسے غیر تخلیقی لوگوں نے (موصوف جامعہ ملیہ کے شعبۂ تعلیم وترقی میں اس کام کے لیے ملازم تھے) خالص واعظانہ نظموں اور کہانیوں کا انبار لگا دیا جن میں ادب سرے سے غائب ہے اور نصیحتیں بیزار کن حد تک موجود ہیں۔ آج کے ادب اطفال میں نثری حصہ تو کسی حد تک ادبیت کا حامل ہے لیکن شاعری کی حالت خستہ ہے۔ پچانوے فیصد لکھنے والے اسکولوں کے اساتذہ ہیں جو پند وموعظت سے مملو ایسی سپاٹ قسم کی تک بندیاں پیش کرتے ہیں جنھیں پڑھ کر ابکائی آتی ہے۔ میرے دوست ڈاکٹر محبوب راہی نے ایک بار کہا کہ ایسی نظموں کے بارے میں بچوں کے توصیفی خطوط تو رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں اور جواباً میں نے کہا تھا یہ خطوط بھی بچوں کو ان کے اساتذہ ہی ڈکٹیٹ Dictate کراتے ہیں۔

خدارا ادب اطفال کو استادوں کی قید سے نکالیے ان کے لیے ایسی چیزیں تخلیق کیجیے جو وہ خود تلاش کرکے پڑھیں استادوں اور والدین کے کہنے سے نہیں!''

تخلیق کرنے لگے اور فکشن نگار بن گئے ہیں، ہم پوری ذات سے مصنوعی اور غیر حقیقی ہوگئے اور ہمارے جذبات بھی جھوٹے ہوگئے نتیجتاً ہماری تخلیق جذبات سے خالی ہوگئی۔ نثر کے ساتھ ساتھ شعر وشاعری میں بھی ہم نے بہت کچھ امپورٹ کیا، جیسے ہائیکو، ماہیہ، اور توارد، ہم نے اپنے سودیشی مال پر بھی اپنا ٹریڈ مارک چپکا لیا جیسے 'دوہا'— کچھ اصناف ایسی ہیں جو ان کی ہی زبان میں اچھی لگتی ہیں 'دوہا' کا ہندی ادب میں اتنا بڑا خزانہ ہے کہ ہم خواہ مخواہ اردو میں ایک گنجینہ کھڑا کر رہے ہیں پھر یہ کہ جو دوہے ہندی میں کہے جاچکے ہیں اس کے بعد کہنے کی کوئی گنجائش نہیں بچتی ہے اس لیے اردو میں ممبئی سے دہلی تک کہے جانے والے دوہوں میں نہ تو کوئی جان ہے نہ ہی تازگی، مگر دوہوں کی ریس لگی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک یہ وہ ساری علتیں ہیں جن کی وجہ سے ہماری تخلیقات میں انسانی جذبات کی ترجمانی نہیں ہورہی ہے، اور یہی سبب ہے کہ ہم بچوں کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے ان کے لیے ادب تخلیق کرنے سے قاصر ہیں۔

> **اردو میں بچوں کا ادب رکا ہوا ہے، جبکہ بچے ایسے جدید دور میں داخل ہوچکے ہیں جہاں نئی تکانیک اورنئے Appliances ہیں شکر ہے کہ بچوں کے دماغ کا Application نہیں بدلا ہے اوریہ بچوں کے ادب کے احیا کا سہارا بن سکتا ہے۔ مگریہ رواروی میں ممکن نہیں ہے، ہاں اگر بچوں کے ادب کوبھی تنقید کی طرح آرکیئولوجیکل بنانا مقصود ہے تو پھر نکاسی کی صورت نکل آنے پر سپلائی میں کوئی کسر باقی نہیں رہے گی کیونکہ بچوں کے ادب کے نام پر کتابیں حال میں بھی آئی ہیں چند ایک کو اکادمیوں سے انعام بھی ملے ہیں اوریہ کتابیں بھی بچوں کی بجائے لائبریریوں کے کام آئیں گی۔ البتہ صدق دلی سے اردو زبان کی خدمت کو مدنظر رکھتے ہوئے بچوں تک ان کا ادب پہنچانے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں تو ہمیں باقاعدہ پلاننگ کرنی پڑے گی۔**

اردو میں بچوں کا ادب رکا ہوا ہے، جبکہ بچے ایسے جدید دور میں داخل ہوچکے ہیں جہاں نئی تکانیک اور نئے Appliances ہیں شکر ہے کہ بچوں کے دماغ کا Application نہیں بدلا ہے اور یہ بچوں کے ادب کے احیا کا سہارا بن سکتا ہے۔ مگر یہ رواروی میں ممکن نہیں ہے، ہاں اگر بچوں کے ادب کو بھی تنقید کی طرح آرکیولوجیکل بنانا مقصود ہے تو پھر نکاسی کی صورت نکل آنے پر سپلائی میں کوئی کسر باقی نہیں رہے گی کیونکہ بچوں کے ادب کے نام پر کتابیں حال میں بھی آئی ہیں چند ایک کو اکادمیوں سے انعام بھی ملے ہیں اور یہ کتابیں بھی بچوں کی بجائے لائبریریوں کے کام آئیں گی۔ البتہ صدق دلی سے اردو زبان کی خدمت کو مدنظر رکھتے ہوئے بچوں تک ان کا ادب پہنچانے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں تو ہمیں باقاعدہ پلاننگ کرنی پڑے گی۔ اول تو اردو رسائل کو یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ ان کی ریڈر شپ اس لیے کم ہوئی ہے کہ ہم نے قارئین کے مزاج اور جذبات کو محسوس کیے بغیر صرف اداروں کی ناموری کے لیے رسالوں کو تنقیدی و تحقیقی مضامین کا ایک ایسا شوکیس بنا کر رکھ دیا ہے جن کے قریب وِگ اور گون پہن کر ہی جایا جاسکتا ہے۔ اردو رسائل نے خواتین میں ریڈر شپ کو رائج کرنے اور فروغ دینے کے بارے میں بھی کبھی غور نہیں کیا۔ کسی پروفیسر صاحبہ، ڈاکٹر صاحبہ کا تنقیدی مضمون آگیا اور شائع کردیا تو جیسے رسالے کی شان بڑھ گئی۔ یہ نہیں سوچا کہ ریڈر شپ نہیں بڑھی پچیس تیس سال پہلے کے رسائل خواتین بھی پڑھتی تھیں، اس بارے میں بھی کبھی سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ آخر وہ کیا چیز تھی جو خواتین کو رسالے سے منسلک کرتی تھی اور سب سے اہم بات یہ کہ آج کے بچے ان اردو رسالوں کے قریب کیسے آئیں گے جن میں ان کے لیے خاص طور سے ادب کا اہتمام کیا گیا ہے؟ یہ بھی ایک کار محال ہے، میں سمجھتا ہوں کہ بچوں کو رسالوں کے قریب لانے سے پہلے ان کی ماؤں کو رسالوں کے قریب لانا ہوگا۔ جب تک کوئی کتاب گھر کے اندر نہیں جاتی اور خاتونِ خانہ اسے نہیں دیکھتیں، وہ کتاب بچوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ آج کے زمانے کی مصروف خواتین جو پابندی سے ٹی وی سیریل دیکھتی ہیں اور ان سے جذباتی طور پر وابستہ ہیں، کیا ہم کسی رسالے کی شکل میں انھیں ویسے میٹیریل فراہم کرسکتے ہیں تاکہ وہ اس رسالے کے لیے بھی وقت نکالیں جس طرح وہ کبھی حریم، ماہِ نو، بانو وغیرہ کے لیے وقت نکالتی تھیں تو بچوں میں ایک تحریک پیدا ہوتی تھی تو اسے دیکھتے ہوئے بچوں کے لیے 'کھلونا' یا 'پھلواری' جیسے پرچے جاری کرائے جاتے تھے۔ آج بھی ایسا ممکن ہے، اگر پلاننگ اور مارکیٹنگ درست ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم پانچ سال کے لیے ہندوستان کے سارے ادبی رسائل تنقیدی و تحقیقی مضامین اور مقالوں کی اشاعت روک کر ادبی تخلیقات (کہانی، افسانہ، شعر وشاعری) کثیر تعداد میں شائع کرنا شروع کردیں جن میں سماج کے سروکار اور انسانی جذبات کے بھرپور Touch ہوں تو ادب کا ذوق رکھنے والی خواتین مائل ہوں گی اور اس کے ساتھ ہی بچوں کے لیے بھی مواد مہیا کرائے جائیں تو کچھ بعید نہیں کہ رفتہ رفتہ حریم، بانو، کھلونا کا زمانہ پھر سے لوٹنے لگے۔ ہمیں یہ دھیان رکھنا ہے کہ ہمارے بچے آج کیا چاہتے ہیں اور کیا پسند کرتے ہیں۔ آج کا بچہ چاند اور چندا ماموں سے دلچسپی نہیں رکھتا، وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ جب آرمس اسٹرانگ چاند پر گیا تھا تو چاند میں نظر آنے والی بڑھیا سے اس کی کیا بات ہوئی تھی۔ آج کا بچہ تتلیوں کے پر سے بھی زیادہ خوبصورت پر ڈسکاوری چینل پر دیکھتا ہے ہاں اسے یہ نہیں معلوم کہ جب تتلی اڑتی ہوئی کسی پھول پر بیٹھتی ہے تو پھول کی پتیاں اس سے کیا کہتی ہیں اور تتلی اپنے پروں پر اترا کر کیا جواب دیتی ہے۔ ہاں! آج کے بچے بھی اب تک سمجھ نہیں پائے کہ آگے تیتر پیچھے تیتر، بولو کتنے تیتر—ایسی پہیلیاں آج کے بچوں کو بھی محظوظ کرسکتی ہیں۔

رسالہ 'اردو دنیا' کے اپریل کے شمارے میں یہ اعلان پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ قومی اردو کونسل کی جانب سے بچوں اور نوعمر طلبا کے لیے 'بچوں کی دنیا' کے نام سے ماہانہ رسالے کی اشاعت شروع کی جارہی ہے۔ یقیناً یہ وہ نیک کام ہے جسے اردو کونسل ہی بحسن خوبی انجام دے سکتی ہے اور اس کا پیہم قصد کرسکتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ رسالے کا نظام الاجزا کیا ہوگا، پھر بھی امید کرتا ہوں کہ اردو میں بچوں کے ادب کی کمی اس سے پوری ہوگی، اس کے ساتھ ہی منتظمین سے درخواست بھی کرنا چاہوں گا کہ مجوزہ 'بچوں کی دنیا' کو تخلیقی ادب تک محدود رکھا جائے تو بہتر ہے تخلیق آج کے بچوں کے مزاج کے مطابق ہو، خواہ تخلیق کار ''پروفیسر ڈاکٹر صدر شعبۂ اردو'' نہیں ہے تو نہ سہی۔ میں اردو کونسل کی نئی پیشکش کے لیے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

■

Zafar Adeem, House No. B-36/2, Lane No. 35, Zakir Nagar, New Delhi - 110025

بچوں کے اردو رسائل، کردار اور تقاضے

امتیاز احمد

رسائل اور میگزین کا مقصد تازہ کار علم و آگہی کی ترسیل ہے۔ بچے ملک و قوم کا مستقبل ہیں ان کی تزئین حیات کے لیے رسائل اور میگزین محرک نیز موثر ذرائع ہیں جو اپنے بیش قیمت مشمولات اور پرتاثیر مواد سے بچوں میں زندگی جینے اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ان معنوں میں رسائل کو ایک پختہ کار مربی کا درجہ حاصل ہے جو اپنے زیر تربیت بچے کے نفسیاتی تقاضوں، وقت اور زمانے کے مزاج اور ضرورتوں سے پوری طرح آگاہ ہے اور اپنی ذمے داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے لیے وقتاً فوقتاً ناگزیر تبدیلیوں کو راہ دیتا ہے۔ اس طرح اس کی بنا اخلاقی اقدار، بصیرت اور تعمیر پسندی پر استوار ہوتی ہے۔ یہ کبھی معلم، مربی، مصلح تو کبھی ہمدرد معالج بن جاتا ہے اور پھر معاشرے لیے مربیانہ، معلمانہ اور ہمدردانہ رویہ اپنا کر اس کی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے۔ رسائل کے انھی وسیع تر کردار کو سرسید کی پارکھ نگاہ نے اپنے قیام یورپ میں جب پہچانا تو وطن واپس لوٹ کر دو انگریزی میگزین 'ٹیٹلر' اور 'اسپکٹیٹر' کے طرز پر 24 دسمبر 1870 میں 'تہذیب الاخلاق' کا اجرا کیا، یہ رسالہ سرسید کی ترجیحات میں اس قدر دخیل تھا کہ حینِ حیات اس کی اشاعت کے چھ برس تک سرسید خود ہی تہذیب الاخلاق کے ایڈیٹر اور منیجر رہے۔ رسالے کی پیشانی پر جو اس کا نام اور بیل چھپتی تھی اس کا ٹائپ وہ لندن سے بنوا کر اپنے ہمراہ لائے تھے۔ یورپ میں مسٹر اسٹیل اور اڈیسن کی میگزین نے تطہیر معاشرہ کا جو انقلابی کارنامہ انجام دیا اور سرسید و تہذیب الاخلاق کے پیش نظر جو اصلاحی مقاصد تھے اس سے زمانہ واقف ہے۔

وکی پیڈیا کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق "میگزین، رسالہ، جرنل وغیرہ وہ اشاعتی سلسلے ہیں جو عموماً ایک متعینہ مدت میں تسلسل سے کاغذ پر چھاپے جاتے ہیں اور اپنے مشمولات میں تنوع کے حامل ہوتے ہیں، معاشی طور پر ان کا انحصار اشتہار، انفرادی خریداری یا پیشگی سالانہ خریداری پر ہوتا ہے۔ میگزین انگریزی زبان میں مجموعہ کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ اس سیاق میں رسالہ/میگزین مجموعہ ہائے مضامین کا نام ہے۔" لندن میں 1731 میں Sylvanus Urban قلمی نام کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے 'The Gentleman's Magazine' میں پہلی بار لفظ 'میگزین' کا ستعمال ہوا جو فرانسیسی زبان کی راستے عربی الاصل لفظ 'مخزن' کی جمع 'مخازن' سے مشتق ہے۔

اردو زبان میں رسالہ کا وجود صحافت سے مستعار ہے۔ اوّلاً اخبارات عالمِ وجود میں آئے، خبریں شائع ہوئیں، حسب ضرورت ادبی نگارشات کو بھی جگہ ملی، جس نے رفتہ رفتہ علوم وفنون کے ہر شعبے سے متعلق رسائل کی صورت اختیار کرلی۔ اب یہی رسائل متعدد اوقات اور مدت کار میں وسیع پیمانہ پر ماہنامے، دو ماہی، سہ ماہی اور سالنامے کی صورت میں شائع ہوتے ہیں۔

یہ میگزین بچوں کے لیے ادبی ذخائر کا درجہ رکھتے ہیں، عالمی ادب کے برعکس ادب اطفال کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے جو اردو میگزین شائع ہوئے ہیں وہ بھی کچھ کم لائقِ اعتنا نہیں۔ کھلونا، کارٹون، باغ و بہار، میل، شارم، عینی، پھلواری، پھول، کلیاں، ٹافی اور چند انگریزی وغیر اردو رسائل نے بچوں کی ذہنی اور فکری نشو و نما اور شخصیت سازی میں نمایاں طور پر حصہ لیا، تاہم یہ رسائل بہت دنوں تک اپنا وجود بحال رکھنے میں ناکام رہے۔ ادب اطفال کے فروغ میں ادارہ شمع کا رسالہ 'کھلونا' سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود بھی کسی نہ کسی علت کے سبب یہ رسالہ بھی بند ہوگیا۔ سردست وہ رسائل جو بچوں میں ہندستان کے مختلف گوشوں سے شائع ہورہے ہیں، گفتگو کا محور ہیں۔ ان کی تفصیل یوں ہے:

(1) گل بوٹے (ماہنامہ)، مدیر: فاروق سید، کیڈی شاپنگ سینٹر 25 گراؤنڈ فلور، ناگپاڑہ، جنکشن، ممبئی 8

(2) صدائے اطفال (ماہنامہ)، مدیر: ایس مرزا عظمت اللہ، کرناٹک اردو اکادمی، کنڑا بھون، جے سی روڈ، بنگلور 560002

(3) فنکار (ذولسانی ماہنامہ)، مدیر: مسعود جاوید ہاشمی/ قبول رضوی، 13-6-431/C/25، مغل نگر حیدر آباد، 67

(4) غبارہ (دو ماہی)، مدیر: قدسیہ واجد، گورنمنٹ کوارٹرس، 105 سی، آٹھواں مین، چھٹواں کراس، وسنت نگر، بنگلور

(5) ہلال (ماہنامہ)، عبدالباری وسیم، ادارہ الحسنات، کھنڈسار کہنہ، رامپور 24490 (یوپی)

(6) نور (ماہنامہ)، مدیر: مرتضٰی ساحل تسلیمی، ادارہ الحسنات، کھنڈسار کہنہ، رامپور 24490 (یوپی)

(7) امنگ (ماہنامہ)، مدیر: راغب الدین، اردو اکادمی دہلی، سی پی او بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی 6

(8) پیامِ تعلیم (ماہنامہ)، مدیر: محمد محفوظ عالم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی25

(9) اچھا ساتھی (20 سال)، مدیر: سراج الدین ندوی، سرکڑا، دھام پور، ضلع بجنور، یوپی 246761

(10) گلدستۂ تعلیم (ماہنامہ)، مدیر: مختار احمد قاسمی، کاشانۂ فردوس، K-67، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

ممکن ہے یہ تفصیل ادھوری ہو، تاہم اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہندستان جیسے عظیم ملک میں یہ رسائل کس حد تک اردو قاری کی ضرورتوں کی تکمیل کر پاتے ہوں گے۔ صوبائی اور ریاستی اکادمیوں کے علی الرغم ان میں خاصی تعداد ان رسائل کی ہے جو انفرادی طور پر چلائے جارہے ہیں، ان کی شرحِ اشاعت تشویش ناک حد تک کم ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے اس کی طبعی عمر پر قطعیت سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

مکتبہ جامعہ کا 'پیامِ تعلیم' اس حوالے سے قابلِ ذکر ہے کہ جامعہ نے اپنے اوائل ہی سے بچوں پر خصوصی توجہ مرکوز کی اور بچوں کی شخصیت کی تعمیر کو اپنی ترجیحات میں شامل کیا۔ 1926 میں ڈاکٹر حسین کی قیادت (وی سی شپ) میں جامعہ نے جب اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کیا تو اس وقت ادب اطفال کا شعبہ تہی دامن تھا، بچوں کی تعلیم اور اس کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کی بڑی کمی تھی، بچوں کے لیے نظمیں تو لکھی جارہی تھیں لیکن نثر کا میدان توجہ طلب تھا، اِس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بچوں کے ادب کی ترویج و اشاعت کو ایک اہم تعلیمی ضرورت قرار دیا گیا۔ رسالہ 'پیامِ تعلیم' کا اجرا اسی سال عمل میں آیا جو جامعہ کا اسی منضبط تعلیمی اور فکری لائحہ عمل کا حصہ ہے، اشاعت کے وقت یہ جامعہ کا تعلیمی آرگن تھا مگر جلد ہی یہ بچوں کا پیامِ تعلیم ہوگیا۔ پیامِ تعلیم کا اس وقت سے اب تک کا یہ سفر بحسن وخوبی جاری ہے۔ مشنری ویژن رکھنے والا یہ رسالہ بچوں کی ذہنی وفکری تعمیر میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اس کے مشمولات، نظمیں، قسط وار دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں، معلوماتی مضامین اور بچہ قاری کی نگارشات میں سیرت سازی، فرض شناسی، شجاعت، حق کی عظمت، فرض سے محبت اور روشن ضمیری جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں، اقوال زریں، پسندیدہ اشعار، معلومات، گدگدیاں جیسے کالم کے ساتھ قلمی دوستی اور آدھی ملاقات بچوں کو براہِ راست رسالے کا حصہ بناتے ہیں اس سے نفسیاتی طور پر بچوں کے ذہن پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ان میں اپنا نام اونچا کرنے کی تگ و دو اور للک پیدا ہوتی ہے اور یہی مقصود ہے۔

'امنگ' زائد از دو دہائیوں سے شائع ہونے والا بچوں کا ایک کامیاب رسالہ ہے جسے دہلی اردو اکادمی نکالتی ہے، دورِ حاضر میں یہ بچوں کا ایک پسندیدہ رسالہ ہے۔ اس کے مضامین، کہانیاں اور شاعری کے تحت شائع ہونے والی تحریریں بچوں کو تازہ دم کرتی ہیں۔ کامکس کے ذریعے تصویری کہانیاں کبھی تو بچوں میں انبساط، کبھی تحیر اور کبھی تخیل کو مہمیز لگاتے ہیں، بچوں میں قنوطیت، ملال اور اُس سے اُبرنے کا جذبہ، صداقت کی اہمیت اور لغویات و جھوٹ سے اجتناب جیسے بصیرت افروز

یہ میگزین بچوں کے لیے ادبی ذخائر کی بنیاد میں اہم رول ادا کرتے ہیں، عالمی ادب کے برعکس ادب اطفال کی ضرورتوں کی تکمیل پر جو اردو میگزین شائع ہوئیں ہیں وہ بھی کچھ کم لائق اعتنا نہیں۔ آج سے قبل کھلونا، کارٹون، باغ و بہار، میل، شارم، عینی، پھلواری، پھول، کلیاں، ٹافی اور چندانگری وغیرہ اردو رسائل نے بچوں کی ذہنی اور فکری نشو و نما اور شخصیت سازی میں نمایاں طور پر حصہ لیا، تاہم یہ رسائل بہت دنوں تک اپنا وجود بحال رکھنے میں ناکام رہے۔ ادبِ اطفال کے فروغ میں ادارہ شمع کا رسالہ 'کھلونا' سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود بھی کسی نہ کسی علت کے سبب یہ رسالہ بھی بند ہوگیا۔

مشمولات سے امنگ کا دامن بھرا ملتا ہے۔ کوئز، کھیل، معلومات عامہ، لطائف، پسندیدہ اشعار اور بچہ قاری کے خطوط پر مبنی 'آپ نے لکھا' اچھے کالم ہیں۔ 'میرا پسندیدہ شعر' اور خطوط interactive کالم ہیں، جو رسالے میں بچوں کی contribution کو یقینی بناتے ہیں، مثبت جذبہ یہیں سے پروان چڑھتا ہے۔ 'امنگ' کی حالیہ پیش رفت قابلِ تحسین ہے۔

'صدائے اطفال' کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کے زیر اہتمام شائع ہونے والا بچوں کا ترجمان ہے۔ جو اپنی عمر کا دوسرا سال پورا کرنے جارہا ہے۔ کرناٹک میں اردو میڈیم اسکول کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ درجہ ایک تا سات، 7 لاکھ 67 ہزار طلبہ صرف گورنمنٹ اسکول میں زیرِ تعلیم ہیں جب کہ زائد از 3 لاکھ طلبہ پرائیویٹ اسکول میں پڑھتے ہیں، 500 ہائی اسکول اردو میڈیم میں، صرف امسال 32 ہزار اردو میڈیم کے طلبہ نے میٹرک کا امتحان دیا ہے، اس پس منظر میں 'صدائے اطفال' کی معنویت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ رسالہ کے فہرست والے صفحے پر جو معلومات فراہم کی گئی ہیں اس سے رسالہ کے اغراض و مقاصد سامنے آجاتے ہیں۔

"اس رسالے میں شائع ہونے والی زیادہ تر تخلیقات اردو اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی ہوتی ہیں، 'صدائے اطفال' کا مقصد ہی یہ ہے کہ بچوں میں زبان اردو میں لکھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے، اور ان کی ٹوٹی پھوٹی تخلیقات کو اس رسالے کے ذریعے عام کیا جائے، قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اپنے خطوط کے ذریعے ان معصوم تحریروں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کی تخلیقات پر سیر حاصل تبصرہ کرکے مشورے دیے جائیں۔" (صدائے اطفال صفحہ 2)

'صدائے اطفال' کا نصب العین مذکورہ سیاق میں ایک خوش آئند پہلو ہے اور اس کی انفرادیت بھی۔ اس میں 'رنگ بھرو' کے تحت تقریباً اس کے سبھی شمارے میں متعدد تصاویر ہوتی ہیں جن میں طلبہ اپنی پسند کا رنگ بھرتے ہیں، بچوں کی ذہنی ورزش کے لیے کچھ Puzzles بھی دیے گئے ہیں، جن سے بچے ہدایت کے مطابق گزرتے ہیں۔ کچھ صفحات مستقل بنیاد پر کامک کارٹون کے لیے مختص ہیں، جن میں دانشوری، شجاعت، حیرت، ڈر اور پھر بہادری کی تعلیم ملتی ہے، اس کے 'لطیفے ہی لطیفے' انبساط اور خوشی سے دامن بھرتے ہیں۔ حمد و نعت اور اسلامیات کا توازن بھی برقرار ہے، نظمیں تکدر آمیز نہیں بلکہ فرحت بخش اور تازگی پر مبنی ہیں۔ خوش قسمتی سے اس کی رہنمائی مدیرِ اعلیٰ حافظ کرناٹکی کے ہاتھوں میں ہے جو خود بھی ادب اطفال پہ تحریک کا درجہ رکھتے ہیں اور کرناٹک کے بچہ اردو قاری میں علم و آگہی کی جوت جگا رہے ہیں۔ لیکن اس زبردست اردو خطے میں 'صدائے اطفال' کی بازگشت (Subscription) کا دائرہ محض 1000 کی تعداد تک ہی سمٹا ہو، باعث استعجاب ہے۔

'غبارہ' یہ دو ماہی رسالہ بنگلور کرناٹک سے پچھلے 5 سالوں سے پابندی سے ڈاکٹر فوزیہ چودھری کی لائق قیادت میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ ادب اطفال کا کرناٹک سے پہلا اردو رسالہ ہے جو پرنٹ اور الکٹرانک دونوں صورتوں میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے کا صرفہ کوئی ا

ادارہ نہیں بلکہ انفرادی اور فیملی ذوق وشوق منحصر ہے۔ رسالہ ذاتی خرچ پر نکل رہا ہے۔ کوئی اسٹاف نہیں ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ چودھری اپنی بیٹیوں قدسیہ واجد، فوقیہ واجد اور ماریہ واجد کے ساتھ یہ کارنامہ انجام دیتی ہیں۔ وہ 'ون مین آرمی' ہیں، جو حصول مشمولات سے لے کر ڈسپیچ تک کے تمام مراحل سے اپنی بیٹیوں کے ساتھ شریک رہتی ہیں۔ فون پر ہوئی ان کی بات سے اندازہ ہوا کہ محض انفرادی ذوق وشوق کے جذبے کی آنچ پر کوئی اردو رسالہ کیوں کر نکالا جاسکتا ہے۔ ریاستی، مرکزی ادارہ جاتی تعاون کے سیاق میں راقم ان کے کرب کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ رسالے کی رسائی محض 1000 افراد تک ہی محدود ہو۔ ڈاکٹر فوزیہ نے 'اردو میں بچوں کا ادب آزادی کے بعد' پر ڈاکٹریٹ کیا ہے اور یہ رسالہ اس فکرمندی کا حاصل ہے جس کا احساس دورانِ تعلیم ہر ذی ہوش اور صاحب نظر کے دل میں ہوتا ہے، ڈاکٹر فوزیہ کے بموجب کرناٹک میں میگزین کے ابتدائی دنوں میں انھیں مضمون کے لیے بڑی دقتوں سے گزرنا پڑا۔ ادب اطفال پر لکھنا معیار سے فروتر گردانا جاتا ہے تاہم شکر ہے کہ اب صورت حال پہلی سی نہیں رہی، بدل رہی ہے، اس طرح 'غبارہ' نے ادب اطفال کی شعوری راہیں اختیار کی ہیں۔

'غبارہ' کے مشمولات کے پس پردہ ادب اطفال پر گہری نظر رکھنے والی ایک اسکالر کی حسن نظر ہے جو نظم اور نثر کے مختلف رنگوں سے مزین ہے۔ کہانیاں سبق آموز اور حوصلہ افزا ہیں، سائنس، کھیل کود کی خبریں اور دور حاضر میں انگریزی کی وسعت کے پیش نظر 'آیئے انگریزی سیکھیں' کا ایک کالم بھی ہے جس میں اردو بہ مقابل انگریزی جملوں کی مدد سے انگریزی سیکھنے کی راہ نکلتی ہے۔ 'تم بھی مسکراؤ' سے مسکراہٹ کی افزودگی اور بچیوں کے لیے پکوان کی مختلف ترکیبیں اور مہدی ڈیزائن کا اہتمام بھی ہے۔ مزاحیہ کہانی اور تصویری کہانی کامک 'رنگ بھریے اور تصویر پہچانیے' بچوں میں رنگوں سے فطرتی انسیت کے جذبے کو بیدار کرنے اور 'خیال اپنا اپنا' جیسے خطوط پر مشتمل مستقل کالم ہیں۔ نظمیں بچوں کے فطری جذبہ معصومیت کو اپیل کرتے ہیں، بین السطور ان میں ڈھیر ساری معلومات ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر فوزیہ اور ٹیم کے جذبے کو سلام! رسالہ آن لائن www.ghubbara.com پر پڑھا جاسکتا ہے۔

'اچھا ساتھی' سراج الدین ندوی کی ادارت میں پچھلے دو دہے سے دھام پور بجنور یوپی سے شائع ہوتا ہے۔ یہ ہندستان کا غالباً پہلا اردو رسالہ ہے جو کسی ہندستانی گاؤں 'سرکڑہ' سے نکلتا ہے اور ملکی سرحد عبور کرتے ہوئے عرب اور یورپین ممالک تک پابندی سے پہنچتا ہے۔ اس کی 'دیہی خصوصیت' کا شہرہ اس قدر ہے کہ گزشتہ دنوں امیتابھ بچن نے کون بنے گا کروڑ پتی میں اس پر باقاعدہ سوال کیا۔ فون پر مدیر مسئول سے گفتگو کے دوران انھوں نے رسالے کے سرورق پر تحریر کردہ اس سلوگن پہ متوجہ کیا جو اس رسالے کا Mandate ہے یعنی ''بچوں اور بڑے کے اخلاق وادب کا معمار''— میگزین کے مشمولات بہرکیف نصب الدین کے غماز ہیں، حمد و نعت کے علاوہ 'قرآنی سبق' کے عنوان سے مدیر محترم کی ایک سریز اور باقی مضامین، کہانی، معلوماتی پہیلی، نظم اور دلچسپ خبروں پر مشتمل ہیں، ''بچوں کی تحریریں، بلاعنوان کہانی، مشعلہ، ماہانہ مقابلہ، مرسلہ اشعار، آیا خط اور کوپن'' اس رسالے کا مغز ہیں۔ یہ Interactive تحریریں بچوں کو میگزین کی سرگرمیوں میں عملاً شرکت پر اکساتی ہیں اور ان میں حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔ یہ پہلو اس رسالے کا بہ نسبت دیگر اور سائل کے توانا ہے۔ 'لفظ و معانی' کا کالم بھی اس کا امتیازی وصف ہے، کارٹونی کہانی، لطائف جو عام طور پر دوسرے اردو رسائل میں دیکھنے کو ملتے ہیں، اس سے بھی اس کا دامن خالی نہیں۔

'نور' کو بچوں کے رسائل میں قائد اور مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے، زائد از چار دہے سے اس کی شعائیں رام پور یوپی سے نکل کر ملک و بیرون ملک کے نونہالوں کو منور کر رہی ہیں۔ نور اس حیثیت سے خوش بخت رسالہ ہے کہ اب اس کی پروردہ نسل دادا کی سرحد میں داخل ہوچکی ہے۔ تاہم معیار ومقدار اور مشمولات جو پہلے تھے وہ اب بھی برقرار ہیں۔ بچوں کی نفسیات اور طبعی میلان کا پاس بڑی حد تک اس رسالے نے ملحوظ رکھا ہے۔ رسائل میں اس کا اپنا ایک منفرد مزاج اور رنگ ہے۔ یہ راہیں اس کی خود کی پیدا کردہ ہیں۔ 'ریڈیو نورستان' کی نشریات کی جاذبیت اور 'نوری محل' کی تازگی میں اب بھی کمی نہیں آئی ہے۔ بچوں میں تحریری صلاحیت پروان چڑھانے کے لیے 'ننھی کلیاں' کے نام سے اس میں بچوں کی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔

نور کے مضامین، کہانیوں اور منظوم فن پارے کے بین السطور بچوں کو اعلیٰ معاشرتی اور دینی عادات واطوار اور قدروں سے مزین کرنا ہوتا ہے۔ 'سیر و سیاحت' اور 'شکاریات'، 'بزم دوستاں' اور 'بزم نور' اس رسالے کی امتیازی شناخت ہے۔ دینی قدروں کو بھی غیر محسوس طور پر 'نور' نے بچوں میں جاں گزیں کیا ہے۔ وہ بھی نور کا امتیازی پہلو ہے۔

'ہلال' کی عمر بھی 'نور' کی طرح زائد از چار دہے پر مشتمل ہے اور رامپور یوپی سے اب تک پابندی سے نکل رہا ہے۔ یہ 'نئی نسل کے لیے روشنی کا پیغام' ہے۔ مستقل کالم کے تحت اس میں ''پیارے نبی کی پیاری کہانیاں، میری پسند، ہنسنا منع ہے، بچوں نے خط لکھا اور بچوں کی لغت' شائع ہوئے ہیں جب کہ نظمیں، کہانیاں، تاریخ اسلام، معلومات، مشغلے اور کامکس کے تحت بھی بچوں کی دلچسپی کا بھرپور سامان مہیا کیا گیا ہے۔ کالم نظمیں اور کہانیاں کے مشمولات متنوع اور دلچسپ ہیں جو عام زندگی کی اخلاقی اور معلوماتی ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہیں، ان میں تخیل اور تجسس کا پاس بھی ہے اور دینی توازن بھی، ہلال میں کامکس کا کالم بچوں میں فرحت اور خوشی کا ذریعہ ہے۔ رسالے کا مجموعی تاثر خوشگوار اثر ڈالتا ہے۔

'فنکار' حیدرآباد سے نکلنے والا بچوں کا دو لسانی رسالہ ہے، اس کی اشاعت کا یہ پانچواں سال ہے۔ یہ رسالہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ بچوں میں انگریزی استعداد بھی پروان چڑھانے کا مقصد رکھتا ہے۔ لہٰذا اردو کے بیشتر مشمولات کے ساتھ تقریباً دس بارہ صفحات محض ہلکے پھلکے دینی اقدار پر مبنی انگریزی مضامین کے لیے بھی مختص ہیں، رسالہ دینی انداز میں بچوں میں شعوری بیداری کا خواہاں ہے، اس کے بعض مندرجات بچوں کی ذہنی صلاحیت کے فروغ دینے میں معاون ہیں۔ اوّلاً اس کی اشاعت 500 کاپیوں پر مشتمل تھی، وقت کی رفتار نے اس کی تعداد اب دوگنی کردی ہے، انفرادی کوشش اس کا محرک ہے— بچوں کے لیے اردو رسائل کی دنیا میں اس کی ذولسانیت ہی اس کی نمایاں خوبی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو طبقہ نئی نسل کے لیے کن کن زاویوں سے فکرمند ہے۔

'گل بوٹے' عروس البلاد ممبئی مہاراشٹر سے نکلنے والا بچوں کا ماہنامہ ہے، جو گزشتہ بیس سالوں سے پابندی سے نکل رہا ہے۔ رسالے کے منیجر کوثر احمد اور مدیر صاحبان سے فون پر ہوئی باتوں سے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ 'بچوں کی ذہنی اور اخلاقی نشو ونما' کا نقیب یہ رسالہ 18 ہزار کی تعداد میں چھپ رہا ہے، یہ نیک فال ہے اور اردو رسائل کے لیے قابل تقلید بھی۔ اس کی بنیادی وجہ غالباً بچوں سے رسالے کا براہِ راست رابطہ (Direct Interaction) ہے۔ ذمے دارانِ رسالہ بلاواسطہ اسکول کو اپروچ کرتے ہیں اور بچے براہ راست میگزین کے خریدار بنتے ہیں، یعنی پروڈکٹ اپنے ہدف تک بغیر کسی ذریعہ اور رکاوٹ کے پہنچ رہا ہے، یہ سب سے توانا

پہلو ہے، یہ رسالہ کسی ادارے کا ترجمان بھی نہیں بلکہ اس کا محرک بھی انفرادیت بردار ہے۔

'گل بوٹے' کے پلیٹ فارم سے ذمے دارانِ رسالہ بچوں کے نصاب پر مبنی ایک صوبائی سطح کا مقابلہ جاتی ٹیسٹ کرواتے ہیں اور پاس ہونے والے طلبہ کو 1000 روپیہ کا وظیفہ بھی دیتے ہیں اس کا مقصد نسل نئی کو صوبائی یا مرکزی سطح پر کریئر کے مقابلہ جاتی امتحانات میں درپیش مسائل اور امتحان کے منہج (Pattern) کی عملی تربیت بھی دینا ہے، اس طرح یہ رسالہ عملی طور اپنے ریڈر کے مسائل اور ان کی ضرورتوں کی بھرپائی کررہا ہے، رسالے کے سرورق پر بچوں یا کسی ایک بچے کی تصویر اندرونِ خانہ کا اعلامیہ ہے کہ رسالے کا نصب العین اور ہدف محض وہ ہیں جن کے ہاتھوں میں مستقبل کی باگ ڈور سونپی جانی ہے۔ مشمولات بلاشبہ نئی نسل کی ذہنی اور اخلاقی ضروریات کا احاطہ کرتے ہیں، ایک کالم 'کریئر گائڈنس' کے لیے مختص ہے جو اس کی اضافی انفرادیت بھی کہی جاسکتی ہے۔

'گلدستۂ تعلیم' اردو رسائل کی دنیا کا بالکل نوزائیدہ ہے۔ فروری 2013 میں اس نے آنکھ کھولی ہے اور صرف چار شمارے ہی اب تک نکل پائے ہیں، تاہم مدیر اعلا، مختار احمد قاسمی پرعزم ہیں اور بچوں کی دنیا میں صالحیت کو یقینی بنانا چاہتے ہیں، یہی دیرینہ خواہش اس کی اشاعت کا محرک بھی ہے، رسالہ انفرادی طور پر نکل رہا ہے۔ تاہم اس کا مقصد مادری زبان میں بچوں کی ذہنی، سماجی، سائنسی اور اسلامی ضروریات پر وافر مواد کی فراہمی ہے۔ سردست اس کے مشمولات اس کے بنیادی اغراض و مقاصد سے بے میل نہیں تاہم ابھی کئی مراحل اور ہیں جن پر مدیر گرامی کی نظر ہے اور وہ فعال بھی ہیں، یہ خوش آئند بات ہے کہ اپنے شروعاتی دور میں ہی اس کا سرکولیشن 1500 ہے۔

عصر حاضر میں بچوں کے لیے شائع ہونے والے اردو رسائل کے اس اجمالی جائزہ میں یہ امر باعث تشویش ہے کہ ہندستان جیسے وسیع و عریض ملک میں بچوں کی ضروریات کی تکمیل پر اردو زبان کے رسائل کی موجودہ صورتِ حال تشفی بخش نہیں ہے، جو رسائل نکل رہے ہیں وہ کس حد تک بچوں کی ذہنی، اخلاقی اور مقابلہ جاتی ضرورتوں کی تکمیل کر پارہے ہیں، قابل غور پہلو ہے، اردو رسائل کا عمومی مزاج دینی ہو یا سیکولر ہو یہ پہلو بھی غور طلب ہے، کیا موجودہ رسائل کا مزاج ایسا ہے کہ ایک عام انسان مسلم، ہندو اور دیگر مذہب والے اسے ترجیحی بنیاد پر مستقل پڑھتے ہوں؟ 'کھلونا' کی مقبولیت کا راز کیا تھا، رسائل جوش و خروش سے عالمِ وجود میں تو ضرور آتے ہیں مگر جلد ہی اس کی طنابیں ٹوٹنے لگتی ہیں ایسا کیوں ہے؟ کیا ہم پروڈکٹ اور مارکیٹ کا توازن بحال رکھ پاتے ہیں؟ معاصر ہندی زبان میں شائع ہونے والی بچوں کی میگزین کا دائرۂ کار کیا ہے؟ اس کے مشمولات اور دیگر کوائف سے کبھی اردو رسائل کے مدیر اپنا موازنہ کرتے ہیں؟ الکٹرانک بطور خاص سوشل میڈیا کی یلغار کے عہد میں کیا کوئی رسالہ محض اخلاقی قدروں کے نعرے پر زندگی بسر کرسکتا ہے؟ وہ بچے جو ان رسائل کے مخاطب ہیں ان کے لیے کیا ''امرود بادشاہ'' جیسی کہانی باسی نہیں ہوگئی؟ جب کہ بچوں کے پاس انٹرنیٹ کا وسیع میدان اور دلچسپی کے وسیع اسباب مہیا ہیں؟ کیا اردو کا کوئی بچوں کا رسالہ ہندی کے 'چمپک' کا مقابلہ کرسکتا ہے؟ اگر نہیں تو اس کے اسباب وعلل کیا ہیں؟ میں نے ان وجوہات پر غور کرنے کے لیے جب ''چمپک'' خریدا تو حیرت ہوئی کہ اس کے ساتھ ایک سی ڈی بھی منسلک تھی، جس میں دلچسپ کارٹون اور ذہن افزا بچوں کے کھیل (Games) ہیں جنھیں بچے کمپیوٹر پر کھیل سکتے ہیں، جاذب نظر کارٹون اور آلودگی، ٹریفک نظام اور دیگر زندہ موضوعات پر مضامین تھے۔ اس تحریر کا مدعا مرعوبیت نہیں تاہم محاسبہ تو ضروری ہے۔ جس سرعت کے ساتھ نئی نسل کو انگریزی میڈیم کے ساتھ جوڑا جارہا ہے اس میں اردو رسائل کا رول اور اس کے تقاضے دوچند ہوجاتے ہیں۔

اردو رسائل کے جائزے میں یہ دیکھنا اہم ہے کہ کس طرح مدیران اپنے رسالے کی کوئی امتیازی شناخت قائم کرسکتے ہیں۔ 'فنکار' کا ذولسانی کیرکٹر اس کی ایک مثال ہے، اسی طرح 'گل بوٹے' کا 'بچے قاری تک براہ راست اپروچ' اور 'کریئر گائڈنس' اس کی نمایاں خوبی کہی جاسکتی ہے۔ 'الفاظ و معانی' کا مستقل کالم 'اچھا ساتھی' کا امتیازی وصف ہے۔ میڈیا کے عہد میں کمپیوٹر اور سوشل میڈیا کا متبادل اگر کوئی رسالہ کچھ فروغ دے پائے تو وہ قابل قدر چیز ہوگی، نصابی ضرورتوں پر مبنی اگر چند کالم ہوں تو اس کا دوررس اثر ہوسکتا ہے، کوئی ضروری نہیں کہ ایک رسالے میں بچوں کی ساری چیزیں پیش کردی جائیں، اس صورت میں رسالے کا وہ پہلو جسے وہ پیش کررہا ہے توانا ہو۔ اگر کچھ رسائل رنگین تصاویر کا اہتمام کریں، رسالے کا مجموعی Get-up درست کریں اور مجموعی طور پر معلوماتی بنائیں اور مارکیٹ کی نبض کو سمجھ لیں تو پھر اس رسالے کی لمبی عمر کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں چند نکات غور طلب ہیں۔

(1) بہتر ہے کہ وسیع اطفال اردو آبادی کی ذہنی وفکری، ضروریات کی تکمیل پر رسالے کی ذمے داری جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرح اے ایم یو، مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور دیگر صوبائی اور مرکزی اکادمیاں لیں۔ یہ خوش آئند خبر ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی حالیہ قیادت نے بچوں کے لیے رسائل کی ناگزیریت کا احساس کیا اور اپنے پلیٹ فارم سے بچوں کا ایک رسالہ نکالنے جارہی ہے۔ ادب اطفال کی دنیا میں کونسل کا یہ قدم ایک نیک شگون ہے۔

(2) انفرادی طور پر چلنے والے رسائل کو فروغ اردو کے ریاستی اور مرکزی حکومتی ادارے نہ صرف اشتہار دیں بلکہ ان کے لیے فنڈ بھی مختص کرے۔

(3) اردو رسائل 'گل بوٹے' کے طرز پر خود کو براہِ راست بچوں سے جوڑیں، ان کے مقابلہ جاتی امتحانوں اور دیگر سرگرمیوں کو sponsor کریں، اسکول کے پروگراموں میں حصہ لیں، انھیں وظیفہ آفر کریں، اور اعلیٰ کارکردگی رکھنے والے بچوں کو سال بھر مفت رسالہ فراہم کریں، کبھی گارجین کی میٹنگ کریں اور معلوم کریں کہ ان کے بموجب بچوں کے لیے رسائل میں اور کیا تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں وغیرہ۔ اس نوعیت کی پرموشنل سرگرمیاں اور پرموشنل میلہ رسالے کو معاشی طور پر مضبوط کرے گا۔

(4) بچوں کی ضروریات اور متعلقات پر خصوصی شمارہ نکالیں مثلاً سائنس نمبر، اردو زبان نمبر، 'ماں کی عظمت نمبر۔ لیبر ڈے کے موقعوں پر 'بچہ مزدوری'، حکومتی تعلیم مہم 'آؤ اسکول چلیں'، حکومتی اسکیمیں اور متعلقہ پہلو پر معلومات کی فراہمی کو یقینی بنائیں'۔

(5) ریاستی اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں ریاستی اردو اکادمیوں کے پرچے یا حکومتی رسالوں کو وہاں کے شعبے اور اساتذہ کے لیے رسائل کی خریداری لازمی بنائی جائے، اور یہ بھی کہ متعلقہ مضمون کے اساتذہ ان رسائل میں سال میں کم ازکم تین مضامین ضرور تحریر فرمائیں اور اس کو پرموشن سے مشروط کیا جائے۔

یہاں اس اعادے کی چنداں ضرورت نہیں کہ رسائل بچوں کے مطالعاتی ذوق کو پروان چڑھانے، ان کی منطقی ذہن سازی اور مسائل کا حل ڈھونڈنے جیسے اوصاف پیدا کرتے ہیں، ان میں تنقیدی شعور پیدا کرتے ہیں، معاشرہ، ملک اور دنیا کے تئیں ان میں خود اعتمادی کو فروغ دیتے ہیں، ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں، جدوجہد کی للک پیدا کرتے ہیں، گھر اور اسکول کے مابین ربط باہمی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ رسائل اپنی فطرت میں مربی ہیں، ایک اچھا مربی ہی اچھی نسل کی تعمیر کرسکتا ہے۔

■

Dr. Imtiyaz Waheed
D-50,17, Hijab Islami, Abul Fazal Encalve
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

ادبِ اطفال کی تخلیقی ضرورتیں

وکیل نجیب

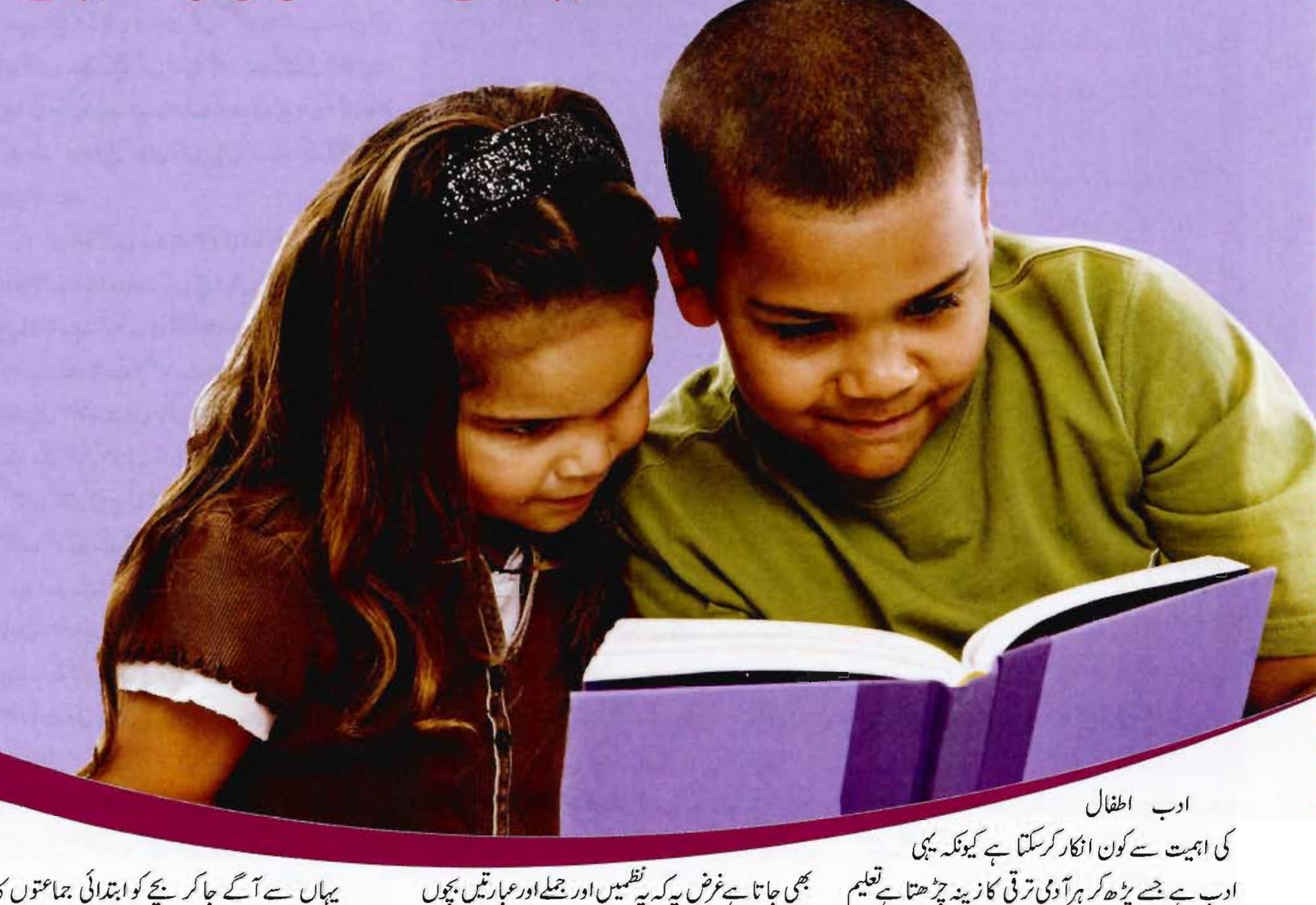

ادب اطفال کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے کیونکہ یہی ادب ہے جسے پڑھ کر ہر آدمی ترقی کا زینہ چڑھتا ہے تعلیم وتربیت حاصل کرتا ہے۔

ادب اطفال کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ صحیح زبان سیکھنے اور بولنے کی تربیت بچوں کو اسی ادب سے ملتی ہے۔ جس زبان کا بچوں کا ادب جتنا مستحکم، موثر اور متمول ہوگا اس زبان کو بولنے والے بچے اسی تیزی اور تندہی سے زندگی میں آگے نکلنے کی طرف مائل ہوں گے۔

بچوں کے ادب کا آغاز بچوں کے بالکل ابتدائی زمانے سے ہو جاتا ہے۔ مونٹیسری اور کنڈرگارٹن جماعتوں کے لیے بچوں کے لیے سلیس نظمیں اور دو حرفی سہ حرفی لفظوں سے بنی ہوئی عبارتیں ترتیب دی جاتی ہیں۔ ان نظموں اور جملوں سے بچے کو لفظوں کے ادا کرنے کا سلیقہ آجاتا ہے وہ کچھ بولنے کے ساتھ ہی سیکھتا بھی جاتا ہے غرض یہ کہ یہ نظمیں اور جملے اور عبارتیں بچوں کے ادب کا آغاز ہوتی ہیں۔ ان جماعتوں کے لیے ادب تخلیق کرتے وقت خاص طور سے بچوں کی گذشتہ معلومات اور وہ کتنا کچھ سیکھ سکتے ہیں ان باتوں کو ملحوظ رکھ کر ادب تخلیق کیا جاتا ہے بچے کتنے لفظ سیکھ چکے ہیں اس سے آگے ان کو کون سے الفاظ سکھائے جاسکتے ہیں اس بات کو ملحوظ رکھ کر ادب تخلیق کیا جاتا ہے اور پھر انھیں رنگین تصویر والی کتابوں پر بچوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

اس طرح بچہ زبان سے واقف ہوتا ہے حروف اور جملوں کی شناخت کے ساتھ ہی وہ اشیا جنھیں وہ اپنے سامنے دیکھتا رہتا ہے۔ ان کے نام معلوم ہوتے ہیں اور انھیں لکھنے کا شعور آجاتا ہے۔ اس طرح ان ابتدائی جماعتوں میں لفظوں کی آواز اور ان کی پہچان کرائی جاتی ہے بچہ اپنی استطاعت کے مطابق سیکھتا چلا جاتا ہے۔

یہاں سے آگے جاکر بچے کو ابتدائی جماعتوں کا سامنا ہوتا ہے ان جماعتوں کے لیے زبان کے مکمل حروف کی شناخت اور چھوٹے چھوٹے جملے بنانے والی عبارتوں اور نظموں کا سہارا لیا جاتا ہے اس لیے ان جماعتوں کے لیے تخلیق کیا جانے والا ادب ایسا ہو جس میں مشکل الفاظ نہ ہوں۔ سہ حرفی اور چہار حرفی سے زیادہ حروف والے لفظوں کو شامل نہ کیا جائے ایسی چیزوں کا بیان ہو جنھیں بچہ اپنے سامنے دیکھتا ہے۔ شکلوں کے ذریعے سے ان کے نام بتائے جاتے ہیں۔ پرائمری جماعتوں کی اونچی جماعتوں میں ادب کی مختلف قسموں کی معلومات آسان لفظوں میں دی جاسکتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی عام فہم نظمیں، حمدیہ اشعار، نعت اور منقبت کے اشعار قدرتی مناظر، موسم، تہوار اور مختلف اشیا کے متعلق چھوٹی چھوٹی نظمیں دی جاتی ہیں جن کے پڑھنے اور گنگنانے سے بچے بہت

سے نئے نئے الفاظ سیکھتے ہیں اس لیے ان درجات کے لیے ادب کی تخلیق کرتے وقت بچوں کی ذہنی استطاعت اور اکتساب کی صلاحیت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

پرائمری درجات کی کتابوں میں جو ادب دیا جاتا ہے وہی بچے کی زبان میں سدھار اور دماغ میں شعور پیدا کرتا ہے۔ ان درجات کی اہمیت بہت زیادہ ہے یہی ادب بچے کو زبان و بیان میں مستحکم بناتا ہے۔ ان ہی جماعتوں سے بچے میں اپنے طور سے لکھنے کی صلاحیت پیدا کی جاتی ہے۔ بچہ نہ صرف بہت سی چیزوں کو سمجھ جاتا ہے بلکہ اسے اپنی زبان میں بیان کرنے کے قابل بھی ہوجاتا ہے۔

ان جماعتوں کے بعد ثانوی جماعتوں کا دور شروع ہوجاتا ہے ان درجات میں بچہ زبان پر بہت حد تک قابو پاچکا ہوتا ہے۔ حروف کی شناخت ہوچکی ہوتی ہے چھوٹے چھوٹے جملے بنانے کا علم اسے ہوجاتا ہے۔ اب اسے دنیا جہان کی معلومات دی جاتی ہیں۔ ان درجات کے بچوں کے لیے مترنم بحروں میں چھوٹے چھوٹے مصرعوں کی نظمیں تخلیق کی جاتی ہیں ان نظموں میں قدرتی مناظر، مختلف طرح کے پھلوں اور چیزوں کی معلومات اسے دینے کے لیے ادب تخلیق کیا جاتا ہے اسی طرح نثر میں تاریخ، جغرافیہ، سائنس، مناظر قدرت، جانور، ندی، پہاڑ، ریگستان اور پرندوں کی عادتوں اور اقسام کی معلومات دی جاتی ہیں۔ ان درجات کے لیے تخلیق کیا جانے والا ادب ایسا ہو کہ بچے اسے دلچسپی سے پڑھیں اور پڑھنے کے ساتھ ہی زبان پر انھیں عبور حاصل ہو اور چیزوں کی معلومات بھی ہوتی چلی جائے۔ ان درجات کے لیے تخلیق کیے جانے والے ادب پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے ذرا سی بد احتیاطی سے بچے کا ذہن کہیں سے کہیں چلا جائے گا۔

ثانوی جماعتوں کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بچے کو زبان کی اور جملے میں لفظوں کے رکھ رکھاؤ کی بہت ساری معلومات ہوجاتی ہیں اس لیے یہاں سے بچے کو ایسے ادب کی ضرورت ہوتی ہے جس کے مطالعے میں وہ دلچسپی لے اور جن کے مطالعے سے اس کی معلومات بڑھتی چلی جائے اور بچوں کے ادب کی یہی سب سے اہم سیڑھی ہے۔ اسی کے ذریعے وہ ادب کی تمام اصناف سے کما حقہ واقف و آگاہ ہوتا جاتا ہے۔ نظم میں حمد، نعت، منقبت، مناظر قدرت، تہوار، دینیات، قطعہ، رباعی، مرثیہ، قصیدہ، غزل، مثنوی وغیرہ اصناف سے واقف ہوتا جاتا ہے۔ درسی کتابوں میں ان چیزوں کی معلومات درجہ بدرجہ دی جاتی ہے۔ ان ہی درجات میں بچوں کے لیے تخلیق کیا ہوا نثری ادب ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ نثری ادب میں کہانیاں، افسانے، سفرنامے، تبصراتی مضامین سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ ان نثری مضامین کے مطالعے سے بچے کو نہ صرف ان اصناف کی معلومات ہوجاتی ہے بلکہ وہ اپنے طور پر اپنے پسندیدہ موضوعات پر طبع آزمائی بھی کرنے لگتا ہے۔ بچوں کو مضمون نویسی کا موقع جماعتوں میں انھیں مقاصد کے حصول کے لیے دیا جاتا ہے اس پر عبور ہوجانے سے ایک بچے کی ادبی منزل کا تعین ہوجاتا ہے کہ آگے چل کر وہ کس صنف میں اپنے لیے جگہ بنا پائے گا۔

بچوں کے ادیبوں کی یہ ذمے داری ہے کہ ادب تخلیق کرتے وقت بچوں کی عمر کا تعین کرلیں کہ وہ کس عمر کے بچے کے لیے ادب تخلیق کر رہے ہیں جب تک یہ نہ ہوگا بچوں کا ادب بچوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہل نہ ہوگا۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنے والے شاعر جب نظموں کی تخلیق کرتے ہیں تو بچوں کی عمروں کو ملحوظ رکھ کر نظمیں تخلیق کریں۔ ان میں ایسے لفظوں کا استعمال کریں جو بچے سیکھ چکے اور ساتھ ہی کچھ مشکل الفاظ اس میں استعمال کرلیے جائیں کہ بچہ اپنے سے بڑوں سے ان کے معنی و مطلب پوچھ لے اور اس کے دماغ میں نئے لفظوں کا اضافہ ہوتا جائے۔ جہاں تک نصابی کتابوں کا تعلق ہے ان کتابوں میں مختلف ادوار میں تخلیق کیے ہوئے بچوں کے ادب کا نصابی کمیٹی کے اراکین مطالعہ کرتے ہیں اور ان میں سے کون سا مضمون یا نظم کس درجے کے طلبا کے لیے مناسب ہوگی اسے منتخب کیا جاتا ہے اس طرح بچوں کے ادب میں سے اچھا مواد جمع کیا جاتا ہے اور اسے نصابی کتب کے لیے ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے۔

جہاں تک اسکولی نصاب کا تعلق ہے دانشوروں کی رائے میں ہر پانچ سال کے بعد نصاب تبدیل ہوتے رہنا چاہیے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ پانچ سال میں نہ

صدیق الرحمن قدوائی

صدیق الرحمٰن قدوائی

بچوں کے ادب کی تاریخ ہمارے ملک اور ہماری زبان میں اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ زبان و ادب کی روایت۔ کہانیاں، گیت، لطیفے، چٹکلے وغیرہ ہر زمانے میں بچوں کی تربیت کے لیے وضع کیے جاتے رہے اور ان کے ذریعے ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاق و آداب کی تربیت بھی ہوتی رہی مگر وقت گزرنے کے ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس ہونے لگی کہ بچوں کی تعلیم و تربیت محض بڑوں کے من کی موج ہی نہیں ہے بلکہ خود بچے اپنی ذات اور اپنی شخصیت کے ساتھ ایسے ذہن اور مزاج کے مالک ہیں جو بڑوں سے مختلف ہیں اور ہر علاقے میں وہاں کی ثقافت کی ضروریات کے مطابق خاص تقاضے ہیں۔

ہمارے یہاں اردو میں بچوں کے لیے خصوصی طور پر زیادہ توجہ انیسویں صدی سے دی جانے لگی۔ جیسے جیسے نئی تعلیم گاہوں کی بنیادیں پڑتی گئیں، ویسے ہی نصاب کی کتابوں، تدریس کے طریق کار مختلف عمر کے لوگوں کے لیے زبان و ادب کے محرکات کی طرف خصوصی توجہ دینے والے مصنفین بھی نمایاں ہونے لگے۔ اردو میں بچوں کے لیے خصوصی رسالے شائع ہونے لگے۔ مختلف عمر کے بچوں کے ذہن اور دلچسپیوں کو پیش نظر رکھ کر کتابیں لکھی جانے لگیں۔ بچوں کے لیے کہانیوں، نظموں، کارٹونوں اور تصویروں کے ذریعے ملکی اور عالمی ادب کے کلاسیکی نمونوں کو پیش کیا جانے لگا۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ جس رفتار کے ساتھ بڑھنا چاہیے اس رفتار سے نہیں بڑھا بلکہ اگر غور کیا جائے تو گزشتہ پچاس برس میں رفتار کچھ دھیمی ہوگئی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ بھی اس تعداد اور مقدار میں سامنے نہیں آ رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بچوں تک اس کی رسائی ہوسکے۔ پھر آج کل کی زندگی میں بڑوں اور چھوٹوں، سب کو ایک اور مسئلہ درپیش ہے اب ایسے نئے وسائل سامنے آ گئے ہیں جنھوں نے کتاب کی طرف سے دھیان ہٹا دیا مثلاً، ریڈیو، ٹی وی، سینما موبائل فون وغیرہ۔ پھر اسکولوں کے نصاب اور اس کے ساتھ روزمرّہ کی درسی سرگرمیوں نے بچوں کے لیے اتنا وقت ہی نہیں چھوڑا کہ کتابوں کی طرف توجہ دیں۔

آج ہم سب کو انفرادی طور پر اور اداروں کو خاص طور سے یہ غور کرنا ہوگا کہ موجودہ زندگی کی افرا تفری میں بچوں کے لیے خصوصی طور پر ایسا کچھ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی رسمی تعلیم اور کھیل کود کے ساتھ کتابوں کے لیے بھی وقت نکال سکیں۔

بچوں کے ادیبوں کی یہ ذمے داری ہے کہ ادب تخلیق کرتے وقت بچوں کی عمر کا تعین کر لیں کہ وہ کس عمر کے بچے کے لیے ادب تخلیق کر رہے ہیں جب تک یہ نہ ہوگا بچوں کا ادب بچوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہل نہ ہوگا۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنے والے شاعر جب نظموں کی تخلیق کرتے ہیں تو بچوں کی عمروں کو ملحوظ رکھ کر نظمیں تخلیق کریں۔ ان میں ایسے لفظوں کا استعمال کریں جو بچے سیکھ چکے اور ساتھ ہی کچھ مشکل الفاظ اس میں استعمال کر لیے جائیں کہ بچہ اپنے سے بڑوں سے ان کے معنی و مطلب پوچھ لے اور اس کے دماغ میں نئے لفظوں کا اضافہ ہوتا جائے۔ جہاں تک نصابی کتابوں کا تعلق ہے ان کتابوں میں مختلف ادوار میں تخلیق کیے ہوئے بچوں کے ادب کا نصابی کمیٹی کے اراکین مطالعہ کرتے ہیں اور ان میں سے کون سا مضمون یا نظم کس درجے کے طلبا کے لیے مناسب ہوگی اسے منتخب کیا جاتا ہے اس طرح بچوں کے ادب میں سے اچھا مواد جمع کیا جاتا ہے اور اسے نصابی کتب کے لیے ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے۔

صرف بچوں کے ادب کی قدر و قیمت میں ترقی ہو جاتی ہے بلکہ جو نئی نسل پانچ سال بعد اسکولوں میں آتی ہے ان کی ذہنی اور اکتسابی صلاحیتوں میں بھی تبدیلی آ جاتی ہے۔

اردو زبان میں شروع میں بچوں کا ادب صرف نصابی کتب کی تربیت دینے کے لیے تخلیق کیا گیا۔ اس کام کے لیے اردو زبان اور شعر و ادب کے ماہرین کو یہ ذمے داری دی گئی۔ وہ اپنی دانست میں بچوں کی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر بچوں کے لیے ادب تخلیق کرتے تھے اور انھیں نصابی کتابوں میں ترتیب دے لیتے ہیں یہ کام یا تو فرد واحد کرتا تھا یا پھر ایک سے زائد لوگ اس کام کو انجام دے لیتے تھے اور ایک بار جو کتاب ترتیب دے دی جاتی تھی وہ برسوں برس میں اسکولوں میں چلتی رہتی تھی۔ آزادی سے قبل اسی قسم کا بچوں کا ادب ظہور میں آتا رہا اور بچوں کے سامنے پروسا جاتا رہا ہے۔

آزادی کے بعد تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو شدت سے محسوس کیا گیا اور نتیجے میں ہماری مرکزی حکومت میں ساتھ ہی صوبائی حکومتوں میں وزارت تعلیم کے شعبے قائم کیے گئے اس شعبے کے لیے ذیلی کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی اور ان کمیٹیوں نے پرائمری درجات سے لے کر ہائی اسکول اور کالج تک کے نصاب کی تیاری کا لائحہ عمل تیار کیا۔ اردو زبان میں جب ہم بچوں کے ادب کی بات کرتے ہیں تو نصاب کے اس حصے کا ذکر کرتے ہیں جس کے تحت ادب کی معلومات بچوں کو دی جاتی ہے۔ فی زمانہ نصاب نے بڑی وسعت اختیار کر لی ہے اس میں سائنس، تاریخ، جغرافیہ، سوشل سائنس، حساب، ڈرائنگ، نیشنل، انٹر نیشنل اور صوبائی زبانوں کی تعلیم وغیرہ شامل ہے۔ اس میں ایک کتاب ہوتی ہے جو بچوں کو ادب کی معلومات دی جاتی ہے اس ایک کتاب میں اچھی نثر اچھی نظم کو جگہ دی جاتی ہے نصابی کتاب کو ترتیب دینے والی کمیٹی مختلف ادوار میں چلنے والی کتابوں میں سے دور حاضر کی ضرورت کے مطابق مضامین اور منظومات اخذ کرتے ہیں اور انھیں درجہ بدرجہ ترتیب دیے جانے والے نصاب میں شامل کر دیتے ہیں۔

بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے والے اس سلسلے میں کوشاں رہتے ہیں اور اپنی تخلیقات بچوں کے رسائل ہفت روزہ اخبارات اور روزناموں کے بچوں کے ضمیموں میں شائع کرواتے رہتے ہیں۔ نصابی کمیٹی کے اراکین ان رسائل اور اخبارات کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور نثر یا نظم میں جو بہتر چیز انھیں نظر آتی ہے اسے منتخب کر کے رکھ لیتے ہیں اور جب نئے نصاب کی تیاری کا عمل شروع ہوتا ہے ان چیزوں کو کمیٹی کے دانشوروں کے سامنے رکھا جاتا ہے اس طرح قدیم اور جدید ہر طرح کا ادب نصابی کتابوں میں پیش کیا جاتا ہے۔

ادب اطفال ہمارے لیے اس وجہ سے اہم ہے کہ ہم آنے والی نسل کو زبان اور ادب کے تعلق سے تیار کرتے ہیں پچھلے زمانے میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے کیا کچھ کیا ہے اور دور حاضر میں کیا کچھ کیا جا رہا ہے ان سب کی معلومات اسے دی جاتی ہے۔ بچوں کی ضرورت کے لحاظ سے بہت سے ادیب اور شاعر بچوں کے ادب پر خاص توجہ دیتے رہتے ہیں۔ رسائل اور اخبارات میں ان کی تخلیقات متواتر شائع ہوتی رہتی ہیں اور ان تخلیقات سے عصری زمانے کے بچے اپنی زبان اور ادب سے اور ادب کی مختلف اصناف سے واقف ہوتے رہتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ اردو میں بچوں کے ادب کو دوسرے درجے کی چیز سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا لیکن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ریاستی اکادمیوں نے بچوں کے ادب کو خاصی اہمیت دی جس کی وجہ سے اردو ادب کے بڑے لکھنے والے اس جانب متوجہ ہوئے انھوں نے اردو زبان میں بچوں کے ادب کی اہمیت و افادیت کو محسوس کیا اور نتیجے میں بچوں کے ادب میں ان کی تخلیق جلا پانے لگی۔ بچوں کے ادب کی اہمیت اور افادیت کو اساتذہ اور معلمات سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنے والوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہیں نصابی کتابوں میں بچوں کا ادب پڑھتے اور پڑھاتے ہیں اور پھر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بچوں کے لیے اچھا اور شاندار ادب تخلیق کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ان سب ادیبوں اور شاعروں کی جملہ کاوشوں سے بچوں کے ادب میں متنوع چیزیں شامل ہوتی جا رہی ہیں اور بچوں کے ادب کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں بچوں کے ادب کو فروغ دینے میں بچوں کے ماہنامے ہفت روزہ اخبار اور روزنامے خاصے مددگار ہیں۔ بچوں کے رسائل کی بڑھتی ہوئی تعداد اور مختلف اخبارات میں باقاعدگی سے بچوں کے ادب کی اشاعت بھی بچوں کے ادب کی اہمیت اور افادیت کو ظاہر کرتی ہے ان اخبارات اور رسائل میں باقاعدگی سے نئے لکھنے والوں کو جگہ دی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان میں حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور ادھر ادھر سے ادب کے اچھے شہ پارے تلاش کر کے اخباروں اور رسالوں میں شائع کرواتے ہیں اور اس طرح غیر محسوس طریقے سے وہ بچوں کے ادب کی تخلیق بنتے چلے جاتے ہیں۔

اردو زبان میں بچوں کا ادب گو کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں کمزور ہے لیکن اب دھیرے دھیرے اس طرف رجحان بڑھ رہا ہے امید کی جاتی ہے کہ اردو میں بچوں کے ادب کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کرتے ہوئے مزید گرانقدر طبع زاد بچوں کا ادب عالم وجود میں آئے گا۔

□

Wakil Najeeb, Najeeb Manzil, Near Lal School, Mominpura, Nagpur - 440018 (MS)

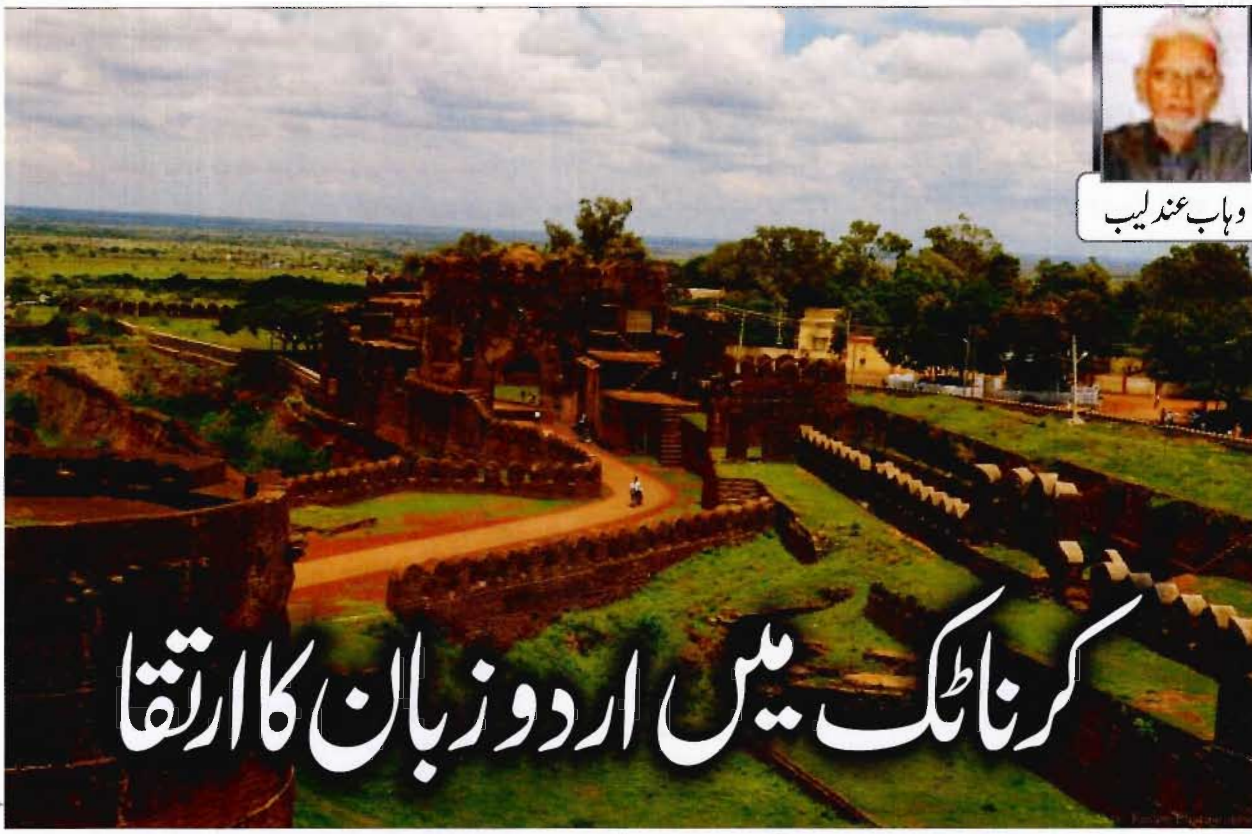

کرناٹک میں اردو زبان کا ارتقا

وہاب عندلیب

کرناٹک جنوبی ہند کی ایک ریاست ہے۔ اس کا علاقہ شمال میں دریائے تنگ بھدرا سے لے کر جنوب میں دریائے کاویری تک پھیلا ہوا ہے۔ اس ریاست کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ اس سرزمین پر مسلمانوں کی آمد سے پہلے کئی ہندو خاندانوں کے راجاؤں نے حکومت کی ہے، جن کے عروج و زوال کے نقوش تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

1325 میں علاء الدین خلجی کی فتوحات دکن سے مسلمانوں کا سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ 1799 میں حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کی سلطنت خداداد کے خاتمہ تک یہ سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس دوران یہاں کی زبانوں، ان کے ادب اور تہذیب کو ترقی کرنے کے مواقع ملے۔ یہاں کی علاقائی زبان کنڑ ہے۔ اس کے علاوہ اردو، تامل، تلگو، ملیالم اور مرہٹی زبان بھی یہاں بولی جاتی ہے۔ 1981 کی مردم شماری کے مطابق ریاست کرناٹک کی آبادی 3 کروڑ 71 لاکھ 35 ہزار سات سو چودہ (3,71,35,714) اور اردو بولنے والوں کی تعداد 41,63,691 بتائی گئی تھی۔ 1991 کے مردم شماری کے لحاظ سے کرناٹک کی آبادی 5 کروڑ 27 لاکھ تو اردو بولنے والوں کی تعداد 44,70,645 ظاہر کی گئی ہے۔ ہنوز 2011 کی مردم شماری جاری ہے اب یہ تعداد 50 سے 55 لاکھ تک بڑھ جائے گی۔ ہماری ریاست دیگر اور ریاستوں کی طرح یک لسانی Mono Lingual نہیں ہے۔ ایک سے زیادہ زبانیں بولنے کی وجہ سے عملی طور پر اردو رابطے کی زبان کا کام انجام دیتی رہی ہے اور دے گی۔ خاص طور پر حیدرآباد کرناٹک کا علاقہ اردو کا علاقہ سمجھا جاتا ہے جہاں انضمام سے قبل اردو سرکاری زبان رہی ہے۔ بمبئی کرناٹک کے علاقے اور قدیم میسور کے علاقے میں بھی اردو بولنے والے قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔ 1944 میں آزادی کے بعد سارے کرناٹک کو ایک لسانی تنظیم کے تحت متحد کرنے کی تحریک چلی جو 1956 کی لسانی تقسیم کے بعد میسور کے آٹھ اضلاع کے بجائے 19 اضلاع ہوگئے اور 29 ہزار مربع میل رقبہ کے بجائے تہتر 73 ہزار میل مربع کا وسیع رقبہ ہوگیا۔ آبادی کے اضافہ کے باعث اس وقت کرناٹک 28 اضلاع پر مشتمل ہے۔ یہ خطہ زمانہ دراز سے تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے یہاں سے علم و عمل کے سرچشمے پھوٹے۔ ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں جن پر ناز کیا جاسکتا ہے۔ عہد وسطیٰ میں بھکتی نام کی تحریک نے اس خطہ سے انسانیت کا پیغام ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچایا۔ کتور کی رانی چنما، حیدرعلی خان اور ٹیپو سلطان شہید نے ملک کو اغیار کے پنجوں سے بچانے کی جو سعی کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔

کرناٹک میں اردو: کرناٹک میں اردو کا ظہور کب ہوا؟ اردو زبان کی تشکیل، تعمیر ترقی و ترویج کس طرح عمل میں آئی؟ ایک اہم سوال ہے۔ جس پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ جس زبان کو ہم اردو کہتے ہیں وہ جدید ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اگرچہ وہ 1100 میں پیدا ہوئی مگر اس کا نام اردو 700 برسوں بعد ظہور میں آیا۔ ابتدا میں اسے ہندوی اور ہندی ہی کہا گیا اس کا نام زبان دہلی یا دہلوی بھی رہا۔ لاہور میں لاہوری تو یوپی اور راجستھان میں گجری یا گورجری کے نام سے موسوم ہوئی جب اس نے نربدا پار کیا تو جنوب میں عام طور سے بولی جانے لگی۔ خاص طور پر موجودہ مہاراشٹر، آندھرا پردیش، کرناٹک اور تامل ناڈو میں اس کا نام ہندوی، ہندی، گجری یا دکنی رہا۔ ولی کے دور میں وہ ریختہ بھی کہلائی مگر آج وہ صرف اردو ہی ہے۔ محمد بن قاسم نے 712 میں سندھ اور ملتان فتح کیا۔ مفتوحہ علاقے میں جو زبان بولی جاتی تھی وہ شورسینی اَپ بھرنش اثرات رکھتی تھی۔ سندھ کو فتح کرنے والے لشکر میں فارسی و عربی بولنے والے لوگ شامل تھے تقریباً 300 سال تک فاتحین کی زبانیں، تہذیب و معاشرت یہاں کی تہذیب و زبان کو متاثر کرتی اور خود بھی متاثر ہوتی رہی۔ گیارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں پہلے سبکتگین نے اور پھر محمود غزنوی نے شمال مغرب سے ہندوستان پر حملے کیے اور سندھ ملتان اور

پنجاب سے لے کر میرٹھ اور نواح دہلی کے علاقوں کو اپنے قلمرو میں شامل کیا اور تقریباً پونے دو سو سال تک آل محمود یہاں حکومت کرتے رہے جب غوریوں نے غزنی پر قبضہ کر کے محمود کے جانشینوں کو نکال باہر کیا تو آل محمود نے پنجاب کو اپنا مستقر اور لاہور کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ علاء الدین خلجی نے 1315 میں گجرات فتح کیا جو سو سال تک سلطنت دہلی میں شامل رہا۔ فتح گجرات کے بعد علاء الدین خلجی نے اپنے لشکر جرار کو دکن کی مہم پر روانہ کیا جس نے سارے دکن و مالوہ کو فتح کر کے سلطنت دہلی میں شامل کیا۔ اس نے سارے علاقے کو سو سو مواضعات میں تقسیم کر کے انتظامی حلقے بنا دیے اور ہر حلقے پر ایک ایک ترک افسر کو مقرر کیا۔ یہ ترک افسر امیر صدر کہلاتے تھے۔ اس انتظامی ضرورت کے تحت بے شمار ترک خاندان اپنے متوسلین کے ساتھ دکن میں آباد ہو گئے اور انھوں نے اظہارِ خیال کے لیے ایک مشترک زبان کو پروان چڑھایا۔

خلجیوں کے زوال کے بعد تغلقوں کی سلطنت قائم ہوئی اور محمد تغلق کا دورِ حکومت (1325-1351) آیا اس بادشاہ نے 1327 میں دولت آباد (دیوگری) کو پایۂ تخت بنایا۔ عام شہریوں اور فوجیوں کے ساتھ اولیائے کرام اور صوفیہ بھی دولت آباد چلے آئے۔ ان زاہدوں میں حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے والد حضرت سید یوسف حسینی راجو قتالؒ، حضرت امیر حسین سنجریؒ، شیخ زین العابدینؒ اور دیگر کئی بزرگان شامل تھے۔ ان بزرگوں نے عوام میں اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے مقامی زبان کا استعمال کیا۔ محمد تغلق نے بھی امیرانِ صدہ کے نظام کو باقی رکھا۔ کچھ عرصہ بعد امیرانِ صدر نے محمد تغلق کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے سارے دکن پر قبضہ کر لیا۔ امیرانِ صدر شمالی ترک ہونے کے باوجود خود کو دکنی کہنے پر فخر کرتے تھے اور وہ جو زبان شمالی ہند سے ساتھ لائے تھے سرزمین دکن کے لسانی و تہذیبی اثرات قبول کرتی ہوئی آزادانہ طور پر نشو و نما پاتی رہی یہی وہ زبان ہے جسے ہم دکنی اردو کہتے ہیں۔ بالآخر امیرانِ صدر نے اپنے ایک امیر علاء الدین حسن کو 1347 میں اپنا بادشاہ منتخب کیا جس نے سکندر ثانی علاء الدین حسن گنگو کا لقب اختیار کر کے گلبرگہ میں بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

بہمنی سلطنت میں اردو

سلاطین بہمنیہ نے گلبرگہ میں 1347 تا 1429 اور بیدر میں 1429 تا 1525 حکومت کی۔ ان سلاطین کی سرپرستی سے دکنی زبان بحرعرب سے خلیج بنگال تک پھیل گئی۔ گلبرگہ، بیدر، گوگی گولکنڈہ، احمد نگر، قندھار، بیجاپور، بودھن، چنن پٹن، میسور، کڑپہ، کرنول، ویلور، مدراس، اورنگ آباد اور برہان پور دکنی زبان اور ادب کے اہم مرکز بن گئے۔ چودھویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی عیسوی تک 350 برس میں اس زبان کا دکن میں نشو ونما ہوا۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ گلبرگہ اور بیدر کا علاقہ ہی اردو ادب کا مولد ہے۔ جہاں اردو نثر و نظم کے اولین نمونے تحریر کیے گئے۔

سلاطِ بہمنیہ میں بہ لحاظ علم و دانش فیروز شاہ کا پایہ نہایت بلند تھا وہ کئی زبانیں جانتا تھا فارسی کے علاوہ دکنی میں شعر کہتا تھا۔ عروجی اور فیروزی تخلص کرتا تھا۔ دکنی کی یہ رباعی اس سے منسوب ہے:

تجھ مکھ چندا جوت دسے سارا جیوں
تجھ کان پہ موتی جھمکے تارا جیوں
فیروزی عاشق کوں تک یک چاکن دے
تج شوق ادھر لب اھے شکر پارا جیوں

قطب شاہی گولکنڈہ

فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ 1400 میں گلبرگہ تشریف لائے حضرت کا شمار دکنی کے اولین شاعروں میں ہوتا ہے انھوں نے رباعیوں، راگ راگنیوں، لوریوں اور گیتوں و چکی ناموں کی صورت میں تصوف کے مسائل پیش کیے۔ حضرت نے اپنی ایک رباعی میں خدا سے قربت اور ہم آہنگی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

پانی نمک ڈال بساں دیکھنا اُسے
جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
یوں گھولے خودی اپنی خدا ساتھ مصطفیٰ
جب گھل گئی خودی تو خدا بولنا کسے

ابتدائی محققین نے بعض نثری رسائل حضرت سے منسوب کیے تھے مگر بعد کے محققین نے اس ادعا کو مشکوک قرار دے کر مسترد کر دیا ہے جب پائے تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل ہوا تو زبان و ادب کے شیدائی بیدر میں اکٹھا ہوئے۔ ایرانی شاعر شیخ آذری نے سلطان احمد شاہ بہمنی کے دور میں بہمنی خاندان کی منظوم تاریخ بہمن نامہ دکنی میں قلم بند کی تھی۔ نظامی بیدری بھی سلطان احمد شاہ بہمنی کا درباری شاعر تھا۔ اُس نے پندرھویں صدی کے آخر میں رومانی موضوع پر ایک مثنوی کدم راؤ پدم راؤ لکھی۔ اس مثنوی کو جمیل جالبی نے مرتب کر کے انجمن ترقی اردو پاکستان سے 1973 میں شائع کیا ہے۔ اس میں جملہ 1032 اشعار موجود ہیں۔ یہ مثنوی ہندوستان کی اس تہذیب کی ترجمانی کرتی ہے جس کا خمیر دو قوموں کی روایات کے امتزاج سے اُٹھا ہے۔ اس عہد کے دیگر شعرا میں ملا داودی، مشتاق، لطفی، محمود، فیروز اور اشرف اہمیت رکھتے ہیں۔ مشتاق محمد شاہ بہمنی متوفی 1482 کے عہد کا شاعر ہے۔ اس نے دکنی میں قصائد اور غزلیں لکھیں۔ مشتاق کے ہمعصر لطفی نے بھی قصائد اور غزلیں لکھیں۔ ان دونوں کا ہم عصر فیروز تھا۔ ابراہیم قطب شاہ کی دعوت پر فیروز گولکنڈہ منتقل ہوا۔ گولکنڈہ کے ممتاز دکنی شعرا وجہی، ابن نشاطی نے فیروز کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔ ابن نشاطی اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے:

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد
جو دیتے شاعری کا کچھ میرے داد

تازہ تحقیق انکشافات (محمد علی اثر) کے مطابق دکنی کے ممتاز مثنوی نگار غواصی کا وطن بھی بیدر ہی تھا۔ جسے دو مثنویوں 'سیف الملک و بدیع الجمال، اور طوطی نامہ' کی وجہ سے شہرت حاصل ہے۔

برید شاہی دور میں اردو

بہمنی سلطنت کا زوال کے بعد دکن میں پانچ آزاد سلطنتیں قائم ہوئیں جن میں دو برید شاہی اور عادل شاہی کا تعلق کرناٹک سے ہے۔ اکثر مورخین کی نظر میں برید شاہی سلطنت کی ابتدا 1492 سے شمار کی جاتی ہے کیونکہ بہمنیوں کے آخری بادشاہ محمود شاہ بہمنی ثانی اور کلیم شاہ بہمنی نہایت کمزور بادشاہ تھے۔ محمود شاہ بہمنی کے دور میں قاسم برید نے خود مختاری کا اعلان کیا مگر مصلحتاً محمود شاہ بہمنی کو برائے نام بادشاہ رکھا۔ 1504 میں قاسم برید کی وفات ہوئی۔ اُس کا جانشین امیر برید بھی کلیم اللہ شاہ بہمنی (جس نے 1525 تک حکومت کی) کے عہد میں اپنے باپ ہی کی طرح اقتدار پر اثر انداز ہوا۔ آخری بادشاہ کلیم اللہ شاہ بہمنی کی وفات کے بعد برید شاہی حکمرانوں

نے بےخوف وخطر بادشاہت کی۔ امیر برید نے 1542 تک حکومت کی۔ اس کے بعد علی برید نے بیدر پر 38 سال حکومت کی۔ اس خاندان کے بادشاہوں نے 1616 تک حکومت کی۔ آخری بادشاہ مرزا علی تھا جس کی سلطنت محمد عادل شاہ کی فوج کشی کی وجہ سے باقی نہیں رہی۔ اس دور کے شعرا میں اشرف، اور قریشی بیدری کو امتیاز حاصل ہے۔ اشرف نے 1553 میں کربلا کے موضوع پر ایک مثنوی نوسرہار لکھی۔ اشرف کی یہ مثنوی دکنی زبان میں ہے مگر اس نے اس زبان کو ہندوی کہا ہے۔ قریشی بیدری کا نام محمد بن عیسیٰ خان تھا۔ نصیرالدین ہاشمی نے قریشی کو امیر برید کے زمانے کا شاعر قرار دیا ہے۔ قریشی بیدری نے فارسی سے ترجمہ کرکے ایک مثنوی لکھی جو جنسیات پر پہلی مثنوی ہے۔

عادل شاھی دور میں اردو:

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد بیجاپور دکنی کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ سلسلہ بندہ نواز کے صوفی حضرت شاہ میران جی شمس العشاق نے بیجاپور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ دکنی نثر و نظم میں کئی رسائل اُن کی یادگار ہیں۔ حضرت نے بھی اپنی زبان کو ہندوی کہا ہے۔ حضرت کے صاحبزادے برہان الدین جانم کا دکنی رسالہ کلمۃ الحقائق ہی وہ مستند رسالہ ہے جسے اردو نثر کا اولین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ حضرت برہان الدین کے فرزند حضرت امین الدین اعلیٰ نے بھی بعد دکنی میں منظوم ونثری رسائل مرتب کیے۔ عادل شاہی دور کے اہم شعرا میں ابراہیم عادل شاہ ثانی، عبدل (ابراہیم نامہ) مقیمی (چندر بدن و مہیار) صنعتی، حسن شوقی، ملک خوشنود (محبت سنگھار) علی نامہ (تاریخ سکندری) ہاشمی (یوسف زلیخا) رستمی، نصرتی (گلشن عشق) مومن وغیرہ نے اپنی شعری تخلیقات سے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا۔ اب دکنی شاعری مثنویوں تک محدود نہیں تھی۔ دیگر اصناف سخن مثلاً غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی میں طبع آزمائی کی جانے لگی تھی۔ سیوا گلبرگہ کا باشندہ تھا۔ وہ علی عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور منتقل ہوا۔ اُس نے فارسی مثنوی روضۃ الشہدا کا اردو نظم میں ترجمہ کیا۔ حضرت محمود بحری، سترھویں صدی کے ممتاز صوفی شاعر تھے وہ گوگی تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ کے متوطن تھے۔ دکنی شاعری میں مثنوی من لگن مثنوی بنگاب نامہ اور غزلیات کا ایک دیوان ان کی یادگار ہیں۔ زوالِ سلطنتِ بیجاپور کے موقع پر رائچور میں صوفی بزرگ سید محمود نوردریاؒ نے دکنی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ گلبرگہ، بیدر اور

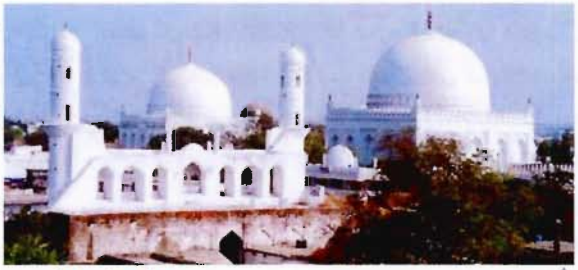

خواجه بنده نواز

رائچور 1686 تک مملکتِ بیجاپور میں شامل رہے۔ عادل شاہی دور کو اس لیے بھی امتیاز حاصل ہے کہ شاہی دفتروں کی زبان فارسی کے علاوہ ہندوی یعنی دکنی بھی تھی جس کی تصدیق تاریخ فرشتہ اور خافی خاں سے بھی ہوتی ہے۔

سلطنتِ خداداد میں اردو:

ایک اور سلطنت خداداد میں بھی دکنی اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ یہ سلطنت 1761 سے 1799 تک قائم رہی۔ حیدر علی خاں بہادر کے ہاتھوں 1761 میں سلطنتِ خداداد کی تاسیس ہوئی۔ حیدر علی اور ان کے فرزند ٹیپو کے عہد میں اس سلطنت کے حدودِ اربعہ موجود کرناٹک تک پھیل گئے تھے۔ اس سلطنت میں دکنی اردو کو ادبی زبان کی حیثیت سے عروج حاصل ہوا۔ سقوط عادل شاہی سلطنت کے بعد بیجاپور سے علما اور صوفیا کرام سلطنتِ خداداد کے پائے تخت سری رنگا پٹم میں سکونت پذیر ہوئے اور اردو زبان کی ترقی میں حصہ لیا۔ حیدر علی کے عہد میں شاہ محمد صدرالدین کا نام پیش پیش ہے۔ من لگن، سراۃ الاذکار اور مصباح النور نامی تین رسالے ان کی یادگار ہیں۔ محمد سعید مہکری جن کا تخلص عاصی تھا اس دور کے اہم شاعر تھے جن کا 1167 میں انتقال ہوا۔ دیگر شعرا میں خیراللہ قادری خادم، فضل اللہ فقیر، سید حسین علی شہباز، میر حسین علی، محمود خان شیرانی، محمد مخدوم شاکر اور شاہ کمال الدین کمال اہمیت کے حامل ہیں۔ 1782 میں حیدر علی کی وفات کے بعد ٹیپو سلطان نے زمامِ حکومت سنبھالی تو دکنی اردو کی ترقی کے لیے زیادہ مواقع حاصل ہوئے۔ اس دور میں زین العابدین (فتح المجاہدین) حسن علی عزت (مفرح القلوب) طرب (فتح نامہ) محمد اسحاق (ریاض العارفین)، ذٹل (ہجوگو) اور نشانِ حیدری کے مصنف سید حسین کرمانی کو خصوصیت حاصل ہے۔ اس عہد میں میسور کی شاعری پر شمالی ہند کا رنگ غالب آرہا تھا اور اردو عام طور پر مروج تھی۔ ٹیپو سلطان نے فوج کے لیے جو قواعد وضوابط بنائے اس میں اردو نغمے شامل تھے۔ اسی طرح شادی بیاہ کے لیے قانونچہ مرتب کیا اس میں بھی اردو گیت شامل تھے۔

> ابتدائی اردو زبان کے بڑھنے، پھیلنے، پروان چڑھنے اور رابطے کی زبان اختیار کرنے میں کرناٹک کا بھی ایک اہم رول ہے۔ جہاں 1350 تا 1799 سلطنتِ بہمنیہ، عادل شاہیہ، برید شاہیہ اور سلطنتِ خداداد کے قیام استحکام اور اختتام تک یہ مشن جاری رہا۔ یقینا اس دور کو ہم دکنی اردو کے فروغ کا سنہرا دور کہہ سکتے ہیں۔

ابتدائی اردو زبان کے بڑھنے، پھیلنے، پروان چڑھنے اور رابطے کی زبان اختیار کرنے میں کرناٹک کا بھی ایک اہم رول ہے۔ جہاں 1350 تا 1799 سلطنتِ بہمنیہ، عادل شاہیہ، بریدشاہیہ اور سلطنتِ خداداد کے قیام استحکام اور اختتام تک یہ مشن جاری رہا۔ یقیناً اس دور کو ہم دکنی اردو کے فروغ کا سنہرا دور کہہ سکتے ہیں۔ دکنی کے ممتاز شاعر صنعتی نے 1645 میں مثنوی 'قصہ بے نظیر' لکھی جس کے دو شعر ہیں جن سے سترھویں صدی عیسوی کی فکر واسلوب کا پتا چلتا ہے۔ یہ اشعار سخن کی تعریف میں ہیں:

سخن کا عجب کچھ قوی باز ہے
ازل تا ابد جس کوں پرواز ہے
عجب ہے سخن کا شجر سربلند
عجب ہے سخن کا سمند ارجمند
سخن کا سداسبز گلزار ہے
سخن کا سدا گرم بازار ہے

آیئے ہم سب بھی کچھ کریں تا کہ سخن کا بازار گرم رہے۔

ماخذات:

1. تاریخ ادب اردو، جلد اوّل، جمیل جالبی
2. تاریخ ادب اردو، مرتبہ ادارہ ادبیات اردو
3. تاریخ ادب اردو کرناٹک (کرناٹک اردو اکادی، بنگلور)
4. تاریخ سلاطین بہمنیہ و بریدیہ: عبدالقدیر عالم شرفی
5. میسور میں اردو: محمد سعید عبدالخالق
6. تحقیق و تجزیہ: وہاب عندلیب
7. انکشافات (2009): ڈاکٹر محمد علی اثر

2 مارچ 2011 کو بیدر کی تہذیبی تنظیم 'پریوگ' اور نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان دھلی کے اشتراک سے منعقدہ سیمینار میں پڑھا گیا۔)

■

Wahab Andaleeb Kunj-e-Naseem, No-11, KHB Colony, Court Road, Gulbarga - 585102 (Karnataka)

سید معین الدین علوی

گم شدہ مصرعوں کی تلاش

ایک یا چند جملے جو عرصۂ دراز سے کسی خاص موقع پر بطور مثال بولے یا لکھے جاتے ہوں اور اپنے لفظی معنوں سے گزر کر کچھ اور معنی ادا کرتے ہیں اُن کو ضرب المثل کہتے ہیں۔ حقیقت کے بیان کا وہ بے ساختہ تمثیلی اسلوب بیان جو کم از کم الفاظ میں حقیقت حال کا اظہار کر دیتا ہے، ضرب المثل کہلاتا ہے۔ ضرب الامثال اور روز مرّہ محاورہ انسانی خیالات کی ترسیل کے وہ مخصوص لسانی حربے ہیں جو خیالات کو زیادہ قابلِ فہم اور سریع الفہم بنانے میں مہمیز کا کام کرتے ہیں۔ ایسے الفاظ جو کسی واقعے یا چیز کے مشاہدے یا طویل انسانی تجربوں سے ذہن میں پیدا شدہ تأثر کا ذریعۂ اظہار ہوتے ہیں جب زبان زد خاص و عام ہو جاتے ہیں تو ضرب المثل کہلانے لگتے ہیں۔ یعنی مختصر یہ کہ ضرب المثل وہ کہاوت ہے جس کو اہلِ زبان نے استعمال کیا ہو اور جو زبان زد خاص و عام ہو جائے۔ مثلاً 'ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے'، 'یہ منہ اور مسور کی دال'، 'نیم حکیم خطرۂ جاں'، 'مدعی سست گواہ چست'، 'سو سنار کی نہ ایک لوہار کی' اور 'ایک پنتھ دو کاج' وغیرہ۔ انھیں خیالات و احساسات کو اگر نظم کی شیلی میں باندھ دیا جائے تو ان کی خوبصورتی دو آتشہ ہو جاتی ہے۔

یہاں محاورے اور ضرب المثل کے فرق کو واضح کرنا بھی غیر ضروری نہ ہوگا۔ محاورہ جملوں میں استعمال کا محتاج ہوتا ہے جب کہ ضرب المثل خود اپنی جگہ ایک مکمل بات ہے جو اپنے حسنِ بیان کی بدولت ذہنوں میں محفوظ ہو جاتی ہے۔

اس مختصر مضمون میں جہاں تک ممکن ہو سکا ہے اُن معروف مصرعوں کو یکجا کر دیا ہے جو ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ اُن مصرعوں کو بھی تلاش کر کے فراہم کیا ہے جن سے شعر مکمل ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی محض تخلص شاعر کی شناخت کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ مقامی نسبت کے باوجود بھی تفریق مشکل ہو جاتی ہے۔ سالک ہی کی مثال لے لیجیے۔ یہ تخلّص کم و بیش پانچ شعرا نے مختلف ادوار میں استعمال کیا ہے جیسے عبدالمجید سالک، سالک دہلوی، قربان علی سالک، غلام قادر صدیقی سالک اور محمد حسین سالک لکھنوی۔ لہٰذا ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ تخلص کے ساتھ شاعر کا پورا نام بھی دے دیا جائے تا کہ کسی شبہ کی گنجائش نہ رہے۔

'سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے': خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی کا شعر اس مصرعِ ثانی سے مکمل ہوتا ہے: 'ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے'۔ اور 'کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا' کا مصرعِ اولیٰ ہے 'سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا'۔ اسی طرح 'زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا' کا 'مصرعِ اولیٰ ہے 'لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب'۔ اور 'بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا'، 'غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں'، 'ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے'۔ مزید بر آں 'مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے' والے ضرب المثل مصرعے کا شعر اِس مصرعِ اولیٰ سے مکمّل ہوتا ہے: 'نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا'۔

امیر احمد امیر مینائی نے بھی اسی بحر میں یہ شعر باندھا ہے:

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

ان ہی کے مزید اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
زیست کا اعتبار کیا ہے امیر
آدمی بلبلہ ہے پانی کا
قریب یارو ہے روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا
تھا مسلماں جب تلک مشتاق کافر تھا وہ بت
میں ہوا کافر تو وہ ضد سے مسلماں ہو گیا

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی نے مشہورِ زمانہ کہاوت 'بد اچھا بدنام برا' کو شعر میں یوں باندھا ہے:

بد کی صحبت میں مت بیٹھو اس کا ہے انجام برا
بد نہ بنے تو بد کہلائے بد اچھا بدنام برا

اِن ہی کے ایک اور شعر کے مصرع ثانی 'دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی' کا مصرع اولیٰ ہے 'الفت کا تب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بیقرار'۔

یہی شعر سید اظہر الدین ظہیر دہلوی کے دیوانِ میں کچھ اس طرح شامل ہے:

چاہت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

نواب اصغر علی اصغر کا یہ مصرعِ ثانی ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے'' کا مصرعِ اولیٰ یوں ہے ''اگر بخشے زہے قسمت نہ بخشے تو شکایت کیا''

آفتاب الدولہ شمس جنگ بہادر قلق کا یہ شعر ''سچ تو یہ ہے حضرت انساں ہے عجب خود طلب   جب دیے رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا''۔ یہی شعر مومن کے نام سے یوں مشہور ہے: ''چل دیے سوئے حرم کوئے بتاں سے مومن جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا''۔

علامہ اقبال کا یہ مصرعِ ثانی ''ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بہت زرخیز ہے ساقی'' کا استعمال بہت ہوتا ہے لیکن مصرعِ اولیٰ ''نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے'' وہ شہرت نہ پا سکا۔ اسی طرح ان کا یہ مصرع ''برق گرتی ہے

تو بیچارے مسلمانوں پر'' کا مصرعِ اولیٰ ہے ''رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر'' اور '' آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے'' کا مصرع ثانی ہے ''سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے''۔ علامہ کے ایک شعر کے اس مصرع ثانی ''شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات'' کا مصرع اولیٰ ہے ''اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے''۔

''ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو'' کا مصرع ثانی ہے ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو''۔

''آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار'' کا مصرع اولیٰ ہے ''ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس''۔

''آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں'' کا مصرع ثانی ہے ''محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی''۔ علامہ اقبال کے کچھ اور اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

زندگی جزو کی ہے کل میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اس شعر کا مصرع ثانی مرزا غالب کے اس شعر میں بھی شامل ہے

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

علامہ اقبال کا ایک اور شعر:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

بھی ضرب المثل کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ شعر علامہ اقبال نے کوی بھرتری ہری کے ایک سنسکرت اشلوک سے متاثر ہو کر تشکیل کیا تھا۔

سیّد اکبر حسین اکبر الہ آبادی کا مشہور مصرع ''جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی'' کے اس مصرع اولیٰ سے شعر مکمل ہوتا ہے ''پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی''۔ ''گزر چکی ہی یہ فصلِ بہار ہم پر بھی'' کا مصرع اولیٰ ہے ''بہت رہا ہے کبھی لطفِ یار ہم پر بھی'' اور سر سیّد احمد خاں کی تعریف میں اُن کا یہ مصرع ''یہ دنیا چاہے جو کہے اکبر یہ کہتا ہے'' اُن کے ضرب المثل شعر کو یوں مکمل کرتا ہے: ''خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں''۔

اسی شعر کا پہلا مصرع داغ دہلوی نے یوں لگایا ہے: ''خبر سن کر مرے مرنے کی وہ بولے رقیبوں سے خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں''۔

نوٹ: شعرا کے ضرب المثل مصرعوں کو جلی حروف میں دکھایا گیا ہے:

جسٹس شاہ دین ہمایوں:

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

میر ببر علی انیس:

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں

شیخ شجاع الدّین انور دہلوی:

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

لالہ رام رکھا مل برق:

کیا خوب برق تو نے دکھایا ہے زورِ طبع
کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

مرزا ذاکر حسین ثاقب لکھنوی:

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

مادھو رام جوہر فرخ آبادی:

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

نالۂ بلبلِ شیدا تو سنا ہنس ہنس کے
اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

ان ہی کے شعر

اب عطر بھی ملو تو تکلّف کی بو کہاں
وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

سے بہت سے قارئین شاید ہنوز نا آشنا ہوں گے۔

جہاندار شاہ:

آخر گِل اپنی صرفِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

رفیع احمد سودا سے بھی یہ شعر کہیں کہیں منسوب ہے لیکن اس کے اصل خالق جہاندار شاہ ہی ہیں۔

نواب مرزا خاں داغ دہلوی:

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

اور ہوں گے تری محفل سے ابھرنے والے
حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

خط ان کا بہت خوب عبارت بہت اچھی
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

مصرع ثانی داغ کے دیوان میں یوں ملتا ہے ''اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ''۔ لیکن جس مصرعے نے شہرت پائی اُس میں قدرے تصرف ہے۔ یہ تصرف کس نے کیا معلوم نہیں ہو سکا۔

مہتاب رائے تاباں:

شعلہ بھڑک اٹھا تھا مرے دل کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

سیّد ضامن علی جلال لکھنوی:

شب کو مئے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

خواجہ میر درد:

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

مرزا علی بیگ عشرتی:

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی:

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

اے ذوق تکلّف میں ہے تکلیف سراسر
آرام میں وہ ہے جو تکلّف نہیں کرتا

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

آدمیّت اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شئے
لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

اے ذوق دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

نازک خیالیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

موذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکّے اور مدینے

سیّد محمد خاں رند:

کیا ملا عرضِ مدعا کر کے
بات بھی کھوئی التجا کر کے

خوش وقت علی خاں خورشید:

پیری میں ولولے وہ کہاں ہیں شباب کے
اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

سیّد انشاء اللہ خاں انشا:

اس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی
اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی

بڑھائی شیخ نے داڑھی اگرچہ سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اس شعر کو گاہے گاہے اکبرالہ آبادی سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ شعر کلیاتِ اکبرالہ آبادی میں نہیں ہے۔ 'خم خانۂ جاوید' میں یہ شعر انشا سے منسوب ہے۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ:

ہم طالبِ شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لیے

منشی منّو لال صفا:

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

سراج الدّین بہادر شاہ ظفر دہلوی:

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل، کوئی کیوں کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

مجروح سلطان پوری:

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

مولانا ظفر علی خاں:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی:

بازیٔ عشق ہرے بیٹھے ہیں
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

مظفر رزمی:

یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

مرزا اسداللہ خاں غالب کے کلام کے تو بہت سے اشعار ضرب المثل ہیں۔ اِن کے بہت سے مصرعے بھی ضرب المثل ہیں جیسے یہ مصرع ''درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا''، جس کا مصرع اولیٰ ہے ''عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا''۔ اور ''کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا''، جس کا مصرع اولیٰ ہے ''بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل''۔ مرزا غالب کے مزید اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ، قبلۂ حاجات ! چاہیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

نینداس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

اِس شعر کے دوسرے مصرع کو 'یادگارِ غالب' طبع دوم میں مولانا حالی نے یوں لکھا ہے:

''جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں''

مرزا بھجو فدوی شاہجہاں پوری:

چل ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

('نیا دور' لکھنؤ اکتوبر 1978 کے ایک مضمون میں یہ شعر لالہ سیوک رام فدوی عظیم آبادی کے نام سے بلا تحقیق منسوب ہے)۔ اس شعر کو رئیس امروہوی اور ثاقب لکھنوی سے بھی منسوب کیا گیا ہے لیکن یہ 'کلیات مرزا محمد علی فدوی' میں درج ہے۔

فیض احمد فیض:

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

قیام الدّین قائم چاند پوری:

قسمت تو دیکھیے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

(یہ شعر میر کی طرف بھی بلا تحقیق منسوب ہے۔ ویسے عطاء کاکوی کی تحقیق کے مطابق یہ شعر قائم چاند پوری کا ہی ہے۔ ملاحظہ ہو 'تحقیقی مطالعے' از عطا کاکوی اور 'نگار' اکتوبر 1952)۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفی:

دلّی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی
میں رہنے والا ہوں اُسی اجڑے دیار کا

یہ شعر ''انتخاب کلامِ میر (مرتبہ نورالحسن نقوی۔ خدا بخش لائبریری، پٹنہ) میں اس طرح درج ہے۔ اس شعر کو ایک مختلف انداز میں اِس طرح نے میر تقی میر سے بھی منسوب کیا جاتا ہے

ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

ماہنامہ 'آج کل' کے مدیرِ محترم ابرار رحمانی صاحب نے ایک مختصر مضمون 'لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام' (11 جون 2010 راشٹریہ سہارا) میں اسے میر تقی میر سے منسوب کیا ہے شاید اس لیے کہ مصحفی کا اندازِ کلام کہیں کہیں میر تقی میر اور مرزا غالب سے بھی میل کھاتا ہے۔ بقول مصحفی:

مصحفی میں اِک رہا ہوں یادگارِ رفتگان
جان تو قائم مقام میر اور غالب مجھے

مصحفی کا کمال یہ نہیں کہ انھوں نے اساتذۂ فن

کے رنگ میں اشعار کہے بلکہ ان کی انفرادیت اور امتیاز یہ ہے کہ کہ ان کی شاعری میں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے محاسن جمع ہو گئے ہیں۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ محققین نے اس شعر کو میر تقی میر سے منسوب کر دیا۔ لیکن کلیاتِ میر جس میں میر کا سارا کلام جوان کے چھ دیوانوں پہ مشتمل ہے، موجود ہے۔ اس میں بھی یہ شعر کہیں درج نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو: کلیات میر مع مقدمہ از پروفیسر احتشام حسین۔ پبلشر: رام نرائن لال بنی مادھو، الہ آباد، 1972)

مندرجہ ذیل شعر بھی میر سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن دراصل یہ شعر فکر یزدانی رام پوری کا ہے:

وہ آئے بزم میں اتنا تو فکر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

میر محمد تقی میر کے اس شعر کے دونوں ہی مصرعے اپنی اپنی جگہ پر ضرب المثل ہیں:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

اسی طرح اس شعر کے دونوں مصرعے بھی ضرب المثل ہیں:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

حکیم مومن خاں مومن:

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا
یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

سیّد محمد علی شاد عظیم آبادی:

تمنّاؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

شیخ تراب علی قلندر کاکوروی:

شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے منادی کر دی
کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

پنڈت دیا شنکر نسیم:

لائے اُس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

خواجہ محمد وزیر لکھنوی:

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے ہیں
اکیلے پھر رہے ہیں یوسف بے کارواں ہو کر
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

مرزا واجد حسین یاس یگانہ عظیم آبادی:

ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

مست کلکتوی:

سرخ رو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

اس شعر کو کئی محققین نے مست کلکتوی کے نام سے منسوب کیا ہے جب کہ خلیق الزماں نصرت نے اسے اسیر

دہلوی کا کہا ہے۔ (ملاحظہ ہو ماہنامہ 'شاعر' بمبئی جون 2007)۔ حیرت کی بات ہے کہ اسی شعر کو خلیق الزماں نصرت نے خود اپنے ایک اور مضمون 'مشہور اشعار گمنام شاعر' میں مست کلکتوی سے منسوب کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ماہنامہ بزم سہارا، جولائی 2010)۔

'تندرستی ہزار نعمت ہے' یہ ایک ضرب المثل فقرہ بھی ہے اور ایک ضرب المثل مصرع بھی۔ قربان علی بیگ سالک کا شعر ہے:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

سالک مرزا غالب کے شاگرد تھے لیکن غالب جیسے مشہور نہیں تھے۔ پتہ نہیں کیوں لوگ اس شعر میں سالک کی جگہ غالب پڑھنے لگے اور یہ شعر غالب سے کسی طرح منسوب ہو گیا جبکہ یہ شعر سالک ہی کا ہے اور غالب کے دیوان میں کہیں نہیں ہے۔

دین محمد تاثیر:

داورِ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

خمار بارہ بنکوی:

خدا بچائے تری مست مست آنکھوں سے
فرشتہ ہو تو بہک جائے آدمی کیا ہے

شوکت علی خاں فانی بدایونی:

اک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا
دل کا اجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے
بہلا نہ دل، نہ تیرگی شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

میاں داد خاں سیاح:

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

(ملاحظہ کیجیے ''سن تو سہی۔ مشفق خواجہ کی منتخب تحریریں''، مرتبین: ڈاکٹر انور سدید اور خواجہ عبدالرحمن طارق۔ پورب اکادمی، اسلام آباد۔ صفحہ 166)

تحقیق کو ایک بے حد ذمہ داری کا کام سمجھا جاتا ہے۔ محقق سمندر کی تہہ سے لولوئے بے بہا چن کر لاتا ہے اور مکمل ایمان داری سے ان کی منفی اور مخفی نکات کو نمودار کرتا ہے جس کے سبب تحقیق کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لیے محققین اور مرتبین کو ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ کسی شئے، جگہ، فرد یا واقعہ کا حوالہ دینے سے پہلے اس کی حتی الامکان مکمل تصدیق کر لیں تا کہ آنے والی نسلیں اُن سے استفادہ کر سکیں اور اُن کے گمراہ ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ کیونکہ اگر کسی سبب کسی شعر یا شاعر کا غلط حوالہ دے دیا گیا اور کوتاہیوں کا سلسلہ جاری رہا تو موجودہ نسل غلطیوں کی اتنی خوگر ہو جائے گی کہ وہ انھیں ہی صحیح سمجھ بیٹھے گی۔

□

Syed Moinuddin Alvi. (Alig), 4/507-A, Medical College Rod, Aligarh - 202002

میرانیس کی مصوری

شمشاد حیدر زیدی

میرانیس کا شمار اردو کے چار بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ میرانیس نے جو کچھ کہنا چاہا، اس کے اظہار کا وسیلہ واقعۂ کربلا کو بنایا۔ وہ کسی اور صنف کو بھی اپنے اظہار کا وسیلہ بنا سکتے تھے اور ان کی شعری استعداد اتنی تھی کہ وہ ہر صنف میں اپنی جگہ بنا سکتے تھے، لیکن انھوں نے مرثیہ ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ میرے خیال میں واقعۂ کربلا ایک ایسا سانحہ ہے، جس میں سارے انسانی اصول ٹوٹتے اور بکھرتے نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف صنف مرثیہ میں مختلف اصناف کی خصوصیات بہ یک وقت جمع ہو سکتی تھیں، اور مرثیے کا موضوع زندگی کی اعلیٰ قدروں کا احاطہ کرسکتا تھا۔

انیس کو مذہبی شاعر کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ کی اساس بھی قرآن حکیم پر ہے۔ ان کی شاعری کو مذہب سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا خواہ انھوں نے کتنے ہی فلسفیوں کے خیالات سے فیض حاصل کیا ہو۔ پھر بیچارے انیس کا کیا قصور ہے۔ میرانیس نے ایک مذہبی رہنما کے حوالے سے حیات وکائنات، تقدیر جبر و اختیار کے فلسفے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ میرانیس کو موضوع کی عظمت کی وجہ سے شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ ان کا کمال تو واقعۂ کربلا کی پیش کش میں ظاہر ہوتا ہے۔

میرانیس کی شاعری کو مختلف زاویوں سے دیکھا گیا ہے۔ علامہ شبلی نے جذبات نگاری، منظر نگاری، واقعہ نگاری، محاکات، رزمیہ شاعری وغیرہ عنوانات قائم کر کے ان کی شاعری پر سب سے پہلے 'موازنہ انیس و دبیر' میں روشنی ڈالی اور واضح کیا کہ اردو شاعری دوسری زبانوں کی شاعری کے مقابلے میں کیا درجہ رکھتی ہے۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب، جعفر علی خاں اثر لکھنوی، سید احتشام حسین، سید مسیح الزماں اور اکبر حیدر کاشمیری نے میرانیس کو رزمیہ شاعر تسلیم کیا، لیکن کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے انھیں مغربی اصول تنقید پر پرکھنے کی کوشش کی اور رونے رلانے پر زور دے کر انیس کو رزمیہ شاعر ماننے سے گریز کیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے انھیں عالمی ادب کے پس منظر میں بھی بڑا شاعر تسلیم کیا۔ تبسم کاشمیری کے خیال میں انیس کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کو جذبے کی زبان دے دی، لیکن انیس کی مصوری پر کم ہی مصنفین نے قلم اٹھایا ہے۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اپنی کتاب 'مرثیہ نگاری اور میر انیس' میں جہاں مرثیے میں ہندوستانی رسم و رواج کی شمولیت پر سخت اعتراض کیے وہیں ان کی مصوری پر پورا ایک باب قائم کیا اور انھیں ایک مصور شاعر تسلیم کیا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے سماجی عناصر کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور انیس کی مصوریت کی تعریف کی۔ ان کے خیال میں میرانیس نہ تو شیکسپیئر کی طرح ڈرامائی شاعر تھے اور نہ ملٹن کی طرح ایپک (Eic) شاعر تھے، بلکہ وہ اسپنسر کی طرح مصور شاعر تھے۔

مصوری کے بارے میں خود میرانیس کے خیالات ملاحظہ ہوں:

مانی کو بھی حیرت ہو وہ نقشہ نظر آئے
بہتا ہوا اک نور کا دریا نظر آئے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے
سب بزم کو حیدر کا سراپا نظر آئے
مہتاب تو کیا ہے رخ خورشید بھی فق ہو
جو بند ہو تصویر تجلی کا ورق ہو

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہل شعور
ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
غل ہو یہ ہے کشش مو قلم طرۂ حور
صاف ہر رنگ سے ہو قدرت صانع کا ظہور
کوئی ناظر جو یہ نایاب نظیریں سمجھے
نقش ارژنگ کو کاواک لکیریں سمجھے

قلم فکر سے کھینچو جو کسی بزم کا رنگ
شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ
خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی
گر بزم کی جانب ہو توجہ دم تحریر
کھنچ جائے ابھی گلشن فردوس کی تصویر
دیکھے نہ کبھی صحبت انجم فلک پیر
ہوجائے ہوا بزم سلیماں کی بھی توقیر
یوں تخت حسینان معانی اتر آئے
ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے

مندرجہ بالا اشعار میں میرانیس نے تصویر کشی کا جو نظریہ پیش کیا اور جو دعویٰ کیا وہ تعلی نہیں ہے بلکہ انھوں نے جیسا دعویٰ کیا ویسا ہی ہوا۔ مثلاً سید مسعود حسن رضوی جیسے ادیب کو میرانیس کے ایک شعر پر شعلے بھڑکتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ شعر ملاحظہ ہو:

ساتوں جہنم آتش فرقت میں جلتے ہیں
شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں

لفظوں کے ذریعہ کسی شے کی تصویر بنانا پیکر تراشی ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی پیکر وہ شے ہے جو حواس خمسہ میں سے کسی ایک کو یا کئی کو ایک ساتھ متاثر کرے۔ میرانیس کی نظر سب سے پہلے کائنات اور اس کے مناظر پر پڑتی ہے۔ مناظر فطرت سے انیس یہ سبق حاصل کرتے ہیں کہ نور وظلمات ہمیشہ برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ حق صداقت اور حسن میرانیس کے یہاں ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ منظر انیس کے یہاں اہم نہیں بلکہ وہ نور وظلمات کا پس منظر ہیں۔ ایک جگہ تو انھوں نے حسن فطرت اور حضرت امام حسینؑ کے نوری پیکر میں یکسانیت پیدا کردی ہے:

صبح صادق کا ہوا چرخ پہ جس وقت ظہور
زمزمے کرنے لگے یاد الٰہی میں طیور
مثل خورشید برآمد ہوئے خیمے سے حضور
یک بیک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور
شش جہت میں رخ مولا سے ظہور حق تھا
صبح کا ذکر ہے کیا چاند کا چہرہ فق تھا

یہاں ظہور اور نور کا قافیہ بے وجہ استعمال نہیں کیا گیا۔ ان میں صوتی آہنگ کے ساتھ امام حسین کے نورانی پیکر کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے اور میرانیس کی تاریخی اور شعری صداقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

میرانیس نے سراپا نگاری میں بھی عمدہ مصوری کی ہے۔ ملاحظہ ہو ایک بند:

کس طرح کوئی وصف سراپا کرے رقم
جلوہ خدا کے نور کا ہے سر سے تا قدم

قطرہ کہاں کہاں صفت قلزم قلم
چیونٹی سے کیا ہو مدح سلیمان ذی حشم
یاں سب تعلیاں شعرا کی فضول ہیں
بس خاتمہ ہوا کہ شبیہ رسول ہیں

مناظر فطرت کے علاوہ انیس کی شاعری میں مختلف قسم کے پیکر ہیں، لیکن میر انیس کی توجہ زیادہ تر اس بات پر رہی ہے کہ وہ نوری پیکر کے ساتھ ساتھ ناری پیکر بھی ابھاریں۔ امام حسینؑ اور اصحاب امام حسینؑ کے پیکر کے ساتھ ساتھ انھوں نے ناری پیکر تراشے ہیں:

نکلا سیاہ شام سے بل کھا کے ایک گیو
قامت میں عمرو زور میں مرحب قوی میں دیو
عفریت جس کے ڈر سے کرے دشت میں غریو
اقلیم مکر و مملکت خدع کا خدیو
بل ابروؤں پہ زخم بدن پر پڑے ہوئے
اکثر لڑائیوں میں عرب کی لڑے ہوئے

انیس کے مرثیوں میں جامد پیکروں کے مقابلے میں متحرک پیکروں کی فراوانی ہے، جو جامد پیکروں کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے۔ یہاں مصوری بھی عاجز ہے کیونکہ جامد تصویر تو مصور بنا سکتا ہے لیکن متحرک تصویر بنانا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ مختلف حالات کی تصویر بنانے میں بھی مصور قاصر ہے۔ میر انیس نے جنگ کے مناظر میں گھوڑے اور تلوار کے ذکر میں مختلف چلتی پھرتی تصویریں بنائی ہیں۔ حضرت امام حسینؑ رخصت کو آئے ہیں۔ ایسے وقت میں انیس تاریخی مکالموں سے احتراز کرتے ہیں اور امام حسینؑ کی ایک جامد تصویر بناتے ہیں:

گیتی پہ عزیزوں کا مرقع تو ہے ابتر
شہ کا ہے یہ نقشہ کہ ہیں تصویر سے ششدر
فرزند نہ مسلم کے نہ ہمشیر کے دلبر
قاسم ہیں نہ عباس ہیں اکبر ہیں نہ اصغر
سب نذر کو دربار پیمبر میں گئے ہیں
رخصت کو اکیلے شہ دیں گھر میں گئے ہیں

سوال یہ ہے کہ مرثیوں میں واقعۂ کربلا کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ کس حد تک تاریخی حقائق پر مبنی ہے۔ مندرجہ بالا رخصت کے بند میں ایک جامد تصویر پیش کی گئی ہے اور واضح ہے کہ انیس چاہتے تو وہ تاریخی مکالمے پیش کر سکتے تھے لیکن اس وقت صرف خاموش کھڑے ہو جانا ہی اس بات کی وضاحت کے لیے کافی ہے کہ اب ہمیں بھی رخصت چاہیے میر انیس نے اس بات کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ حرکت کی رفتار کس جگہ تیز ہو اور کس جگہ سست۔ ان اشعار کے مطالعے سے ہو بہو وہی تصویر ہمارے ذہن میں ابھرنے لگتی ہے۔ متحرک تصویر کی مثال بھی ملاحظہ ہو:

زخمی بازو ہیں کمر خم ہے بدن میں نہیں تاب
ڈگمگاتے ہیں نکل جاتی ہیں قدموں سے رکاب
تیغ سے دیتے ہیں ہر وار کا اعدا کو جواب
پیاس کا غلبہ ہے لب خشک ہیں آنکھیں پر آب
شدت ضعف سے جس جا پہ ٹھہر جاتے ہیں
سیکڑوں تیر ستم تن سے گزر جاتے ہیں

گر کر کبھی اٹھے کبھی رکھا زمیں پہ سر
اگلا کبھی لہو تو سنبھالا کبھی جگر
حسرت سے کی خیام کی جانب کبھی نظر
کروٹ کبھی تڑپ کے ادھر لی کبھی ادھر
اٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے
تیر اور بدن میں گڑ گئے جب منہ کے بل گرے

انیس کے مرثیوں میں جامد پیکروں کے مقابلے میں متحرک پیکروں کی فراوانی ھے، جو جامد پیکروں کے مقابلے میں زیادہ مشکل ھے۔ یہاں مصوری بھی عاجز ھے کیونکہ جامد تصویر تو مصور بنا سکتا ھے لیکن متحرک تصویر بنانا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ مختلف حالات کی تصویر بنانے میں بھی مصور قاصر ھے۔ میر انیس نے جنگ کے مناظر میں گھوڑے اور تلوار کے ذکر میں مختلف چلتی پھرتی تصویریں بنائی ھیں۔

شبیر نے اس چاند کو ہاتھوں پہ اٹھایا
چلے سے کماندار نے واں تیر ملایا
خم ہو کے اسے مثل کماں شہ نے بچایا
مانند اجل ناوک ظلم و ستم آیا
شبیر چھپاتے رہے نازوں کے پلے کو
بازو پہ لگا توڑ کے ننھے سے گلے کو

حلقہ تو وہ دو ٹانک کا اور تیر سہ پہلو
دل سہم گیا چونک پڑے اصغر مہ رو
گردن سے لہو بہنے لگا آنکھوں سے آنسو
منہ کھل گیا تھرانے لگے ننھے سے بازو
گل رنگ ہوا طوق گلو خون سے بھر کر
ریتی پہ کڑے گر پڑے ہاتھوں سے اتر کر

سی ڈے لیوس (C. Day Lewis) نے اپنی کتاب 'دی پوئٹک امیج' (The Poetic Image) میں تحریر کیا ہے:

"لفظی تصویریں بنانا امیج سازی کا بنیادی مقصد ہے اور یہ کہ اس وقت پوری نظم مکمل امیج بن جاتی ہے، جب اس کے مختلف حصوں میں متنوع پیکروں کی تخلیق ایک ساتھ مل کر مبسوط اور مرکب تشکیل کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔"

انیس کے کلام میں مختلف قسم کے پیکر ابھرتے ہیں اور مختلف حواس کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں بصری پیکر زیادہ ابھرتے ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی مکمل تصویر کربلا کے اسی واقعے سے مطابقت رکھتی ہے جس سے ہم آپ اچھی طرح واقف ہیں، یا جو واقعہ ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہے اس سلسلے میں ان کا مرثیہ 'ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں' ملاحظہ ہو جہاں سفر کے وہ حالات نہیں جو آج کل کے سفر میں درپیش ہیں۔

میر انیس نے اپنی تصویروں میں رنگ بھی خوب بھرے ہیں۔ دیگر محاسن کے ساتھ ساتھ 'صنعت تدبیج' کا لطف بھی ہے، جو علم بدیع کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ایسے دو بند ملاحظہ ہوں:

اوج زمیں سے پست تھا چرخ زبرجدی
کوسوں تھا سبزہ زار سے صحرا زمردی
ہر خشک و تر پہ تھا کرم بحر سرمدی
بے آب تھے مگر در دریائے احمدی
رو کے ہوئے تھی نہر کو امت رسول کی
سبزہ ہرا تھا خشک تھی کھیتی بتول کی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد
مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد
یہ خوف تھا کہ دامن گل پر پڑے نہ گرد
دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

انیس نے پہلے بند میں زبرجدی (نیلا آسماں)، سبزہ زار، زردی، سبزہ سہرا اور دوسرے بند میں مینائے لاجورد (نیلا شیشہ یعنی نیلم) گل سبز و سرخ، زرد، لالہ زار، سبزہ سے اپنی تصویروں میں خوشنما رنگ بھی بھرے ہیں۔

■

Dr. Shamshad Haider Zaidi, Lecturer Urdu Department, Dr. A.H. Rizvi Degree College, Karari, Kaushambi, Allahabad - 211016 (UP)

اردو ادب اور گلکرسٹ کی خدمات

مہیمنہ خاتون

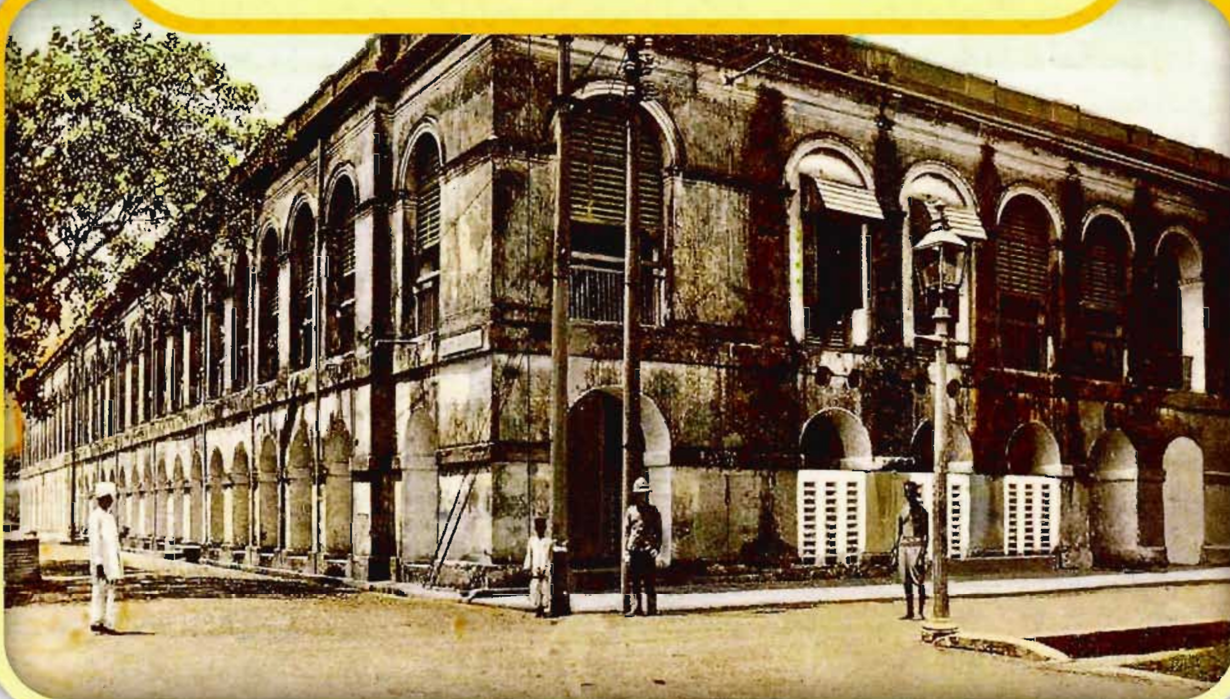

اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ڈاکٹر جان بارتھ وک گل کرسٹ ہندوستان آئے اور ترقی کرتے ہوئے فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی زبان میں صدر کے عہدے تک پہنچے۔ اس کالج کی بنیاد 4 مئی 1800 کو انگریز گورنر جنرل مارکوئیس ولزلی نے کلکتہ میں رکھی۔ کالج کے قیام کا مقصد نو منتخب انگریز ملازمین کی معقول تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا تھا تاکہ وہ برطانیہ کے استعماری نظام کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ انھیں یہاں کی دیسی زبان کا باقاعدہ علم ہو تاکہ ہندوستان پر حکومت کرنا انگریزوں کے لیے سہل ہو جائے۔ 18 اگست 1800 کو ولزلی نے گلکرسٹ کو شعبۂ ہندوستانی کا صدر مقرر کیا۔ یہاں سے گلکرسٹ کی زندگی کا روشن و تابناک باب کھلتا ہے۔ اردو ادب کی خدمت کے لیے انھوں نے اپنی عمر کا ایک طویل عرصہ وقف کیا جس کی وجہ سے اردو زبان و ادب میں ان کا نام سنہری حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف زبانِ اردو کے قواعد و لغت کے مدون ہیں بلکہ جدید ہندوستانی نثر کے موجد بھی ہیں۔ بقول محمد عتیق صدیقی:

''اردو اور ہندی کی جو کتابیں گل کرسٹ کی نگرانی میں فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبہ میں تصنیف یا تالیف کی گئیں، ان کتابوں نے ہندوستانی نثر کا صرف ادبی معیار ہی نہیں قائم کیا، بلکہ ہمارے جدید نثری ادب میں، نیز ہندی اور اردو طباعت کی تاریخ میں بھی ان کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔ خود گل کرسٹ نے ہندوستانی لسانیات کے موضوع پر جتنی کتابیں تالیف یا تصنیف کیں وہ کسی مصنف کے لیے بھی تعداد و مواد کے اعتبار سے باعثِ فخر ہو سکتی ہیں۔'' (ص 22، گل کرسٹ اور اس کا عہد)

فورٹ ولیم کالج میں شعبۂ ہندوستانی زبان کے صدر جان بارتھ وک گل کرسٹ ایک باصلاحیت منتظم اور قابل استاد تھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ اردو زبان کی آبیاری کے لیے خود کتابیں لکھیں بلکہ بہت سے ایسے اساتذہ بھی مقرر کیے جو انگریز ملازمین کو اردو، عربی، فارسی سکھانے کے ساتھ ساتھ کتابیں بھی تصنیف کر سکیں اور فارسی و عربی زبانوں کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کر سکیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے کالج میں بیالیس اساتذہ کا تقرر کیا جنھیں مختلف عہدے جیسے مترجم، چیف منشی، سکنڈ چیف منشی اور ماتحت منشی عطا کیے گئے۔ ان میں سے بعض مصنّفین و اساتذہ جیسے شیر علی افسوس، کاظم علی جوان، میر بہادر علی حسینی، میر امن دہلوی اور شیخ حفیظ الدین حیدر بخش حیدری وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے ایسی کتابیں ترجمہ و تصنیف کیں جو لکھی تو کالج کے انگریز ملازمین کے لیے گئی تھیں مگر ان کی اہمیت بچوں کے ادب میں نمایاں ہے۔ یہ وہ ابتدائی کتابیں ہیں جو ایسے لوگوں کے لیے تیار کی گئیں جو اردو سے یکسر ناواقف تھے جس

طرح بچے کو الف بے کے ذریعے کسی زبان سے روشناس کیا جاتا ہے اسی طرح کالج کے ان ملازمین کے لیے بھی اوّلاً اردو لغت و قواعد لکھی گئیں پھر انھیں قصوں اور واقعات کے ذریعے رواں اردو سکھائی گئی۔ یہ طریقۂ تعلیم اس لیے اختیار کیا گیا تاکہ اردو سیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستانی رسم و رواج، بول چال، رہن سہن اور معاملات کے طریقوں سے بھی واقف ہوسکیں۔ یہ طریقہ حقیقتاً کارگر ثابت ہوا اور گل کرسٹ نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی اس زبان کی اہمیت اور اس کی ترقی کے بارے میں جو تصور قائم کیا تھا وہ شرمندۂ تعبیر ہوا۔ کالج سے ایسے با صلاحیت اور باہنر ملازمین یا طلبا نکلے جن کی بدولت ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر و رسوخ ہندوستان پر مضبوط ہوتا گیا اور بالآخر وہ کج روی سے اس سرزمین پر ہی قابض ہو گئے۔

اگر بچے کو بھی ابتدا سے ہی ایک مقصد کے تحت تعلیم کی طرف راغب کیا جائے تو بالیقین وہ ایک دن قوم کا معمار ثابت ہوگا۔ کالج کے اساتذہ و مصنّفین نے ایسی کتابیں تحریر و ترجمہ کیں جن کی بدولت انگریزوں نے اردو زبان پر مکمل عبور حاصل کر لیا تاآنکہ انھوں نے اس زبان میں لغت و قواعد تحریر کیے اور دیگر کتابیں ترجمہ و تالیف کیں۔

کالج کے ان اساتذہ میں پہلا نام شیر علی افسوس کا آتا ہے۔ ان کا تقرر بطور مترجم 15 اکتوبر 1800 کو دو سو روپے ماہانہ پر ہوا۔ انھوں نے گل کرسٹ کے کہنے پر 'گلستانِ سعدی' کو فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور اس ترجمہ کو 'باغِ اردو' کا نام دیا۔ جس کے متعلق خود مترجم کا کہنا ہے:

''ایک دن صاحب موصوف (مدرس ہندی مسٹر جان گل کرسٹ) نے مہربانی سے فرمایا کہ تو گلستان سعدی شیرازی کو اردو زبان میں ترجمہ کر۔ میں نے دھیان کیا کہ عبارت اس کی بظاہر صاف و باطن پیچ دار ہے۔ اور رتبہ اپنی قوت و تالیف کا اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی۔ ارادہ کیا کہ اس سے پہلو تہی کروں اور سر بجز آگے دھروں، پھر میں سوچ آیا کہ مبادا حاشیۂ خیال میں ان کے گزرے کہ اس نے ہمارا کہنا نہ مانا اور اس بات کو سہل جانا۔ تب قصد کیا کہ ایک حکایت طولانی کہ نظم و نثر اس میں کثرت سے ہو اس سے ترجمہ کروں اگر (حکایت) بہ خوبی سرانجام ہوئی اور اہلِ معانی کے پسند پڑی تو فبہا۔ و الّا صاحب ممدوح سے اس امر کی معافی چاہوں گا۔ چنانچہ قاضی ہمدان کی حکایت کا ترجمہ کیا۔ اور وہ علماً و عقلاً و چند شعرا کہ یہاں تھے، ان کی پسند پڑا۔ تب اس ضعیف نے کمر ہمت بر قوت باندھی اور سعی بلیغ کی۔ بارے فضل ایزدی اور لطف سرمدی سے تمام کتاب زبان اردو میں لکھی اور مقبول خاص عام کی ہوئی۔ نام اس کا باغ اردو رکھا''۔

(ص 199، گل کرسٹ اور اس کا عہد)

اس کتاب کا ترجمہ مترجم نے اکثر جگہ لفظی کیا ہے لیکن عبارت واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے۔ 'باغِ اردو' سے نقل کی گئی مندرجہ ذیل حکایت اس کی واضح دلیل ہے:

''کہتے ہیں کہ نوشیروانِ عادل کے شکار گاہ میں ایک شکار کے کباب بھونتے تھے، نمک موجود نہ تھا۔ لوگوں نے زمین دار کے پاس آدمی بھیجا کہ نمک لے آوے۔ نوشیرواں بولا کہ نمک قیمت دے کر لیجو تاکہ رسم نہ بگڑ جائے اور گاؤں خراب نہ ہو۔ لوگ بولے اے بادشاہ اتنی سی بات سے کیا خلل پیدا ہوگا۔ نوشیرواں نے کہا اوّل ظلم کی بنیاد تھوڑی ہی سی تھی، جو آیا اس پر بڑھاتا گیا، حتیٰ کہ اس درجہ کو پہنچ گئی۔''

جو کھاوے شہ رعیت کے باغ سے ایک سیب
غلام اس کے درختوں کو ڈالیں جڑ سے اکھاڑ
جو آدھے انڈے پہ سلطاں ستم روا رکھے
سپاہی سیخ پہ بھونیں ہزار مرغ پچھاڑ

(ص 135، قادری، حامد حسن، داستان تاریخ اردو، ٹیچر ٹریننگ کالج روڈ، جامعہ نگر، اوکھلا، دہلی، 2007)

کالج کے دوسرے منتخب کیے گئے مدرس کاظم علی جوان تھے جنھوں نے گلکرسٹ کے کہنے پر قرآن شریف اور شکنتلا ناٹک کا ترجمہ اردو میں کیا۔ تیسرے استاد میر بہادر علی حسینی تھے جنھوں نے گلکرسٹ کے حکم سے فارسی کتاب 'مفرح القلوب' کا اردو ترجمہ 'اخلاق ہندی' کے نام سے کیا۔ کالج کے چوتھے استاد میر امّن تھے جنھوں نے صدر مدرس گلکرسٹ کے کہنے پر فارسی قصہ چہار درویش کا اردو میں ترجمہ کیا اور 'باغ و بہار' نام رکھا۔ پانچویں استاد حیدر بخش حیدری تھے جنھوں نے گلکرسٹ کے کہنے پر فارسی سے اردو میں طوطی نامہ کا اردو ترجمہ توتا کہانی کے نام سے کیا اور فارسی کی ایک اور کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام 'آرائشِ محفل' رکھا۔ چھٹے استاد مظہر علی خاں ولا تھے جنھوں نے موصوف کے کہنے پر 'بیتال پچیسی' کا برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب اصل میں سنسکرت میں تھی جو پہلے برج بھاشا میں ترجمہ کی گئی پھر گل کرسٹ کی فرمائش پر اردو میں ترجمہ کی گئی۔

کالج کے ان مصنّفین و مترجمین کے علاوہ گلکرسٹ نے کچھ ایسے لوگوں سے بھی ترجمہ و تالیف کا کام لیا جو کالج کے باقاعدہ ملازم تو نہیں تھے مگر انھوں نے کالج کے طلبا کے لیے کتابیں تصنیف و ترجمہ کیں جیسے نہال چند لاہوری اور باسط خاں باسط۔ لاہوری نے قصہ گل بکاولی اور تاج الملوک کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام 'مذہبِ عشق' رکھا۔ باسط نے قصہ گل و صنوبر کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور 'گلشنِ ہند' نام رکھا۔

فورٹ ولیم کالج کے تحت گلکرسٹ کی ایما پر کیے گئے تراجم مبتدئینِ اردو نیز بچوں کے لیے نادر تحفہ ہیں۔ یہ آسان اور عام فہم زبان میں لکھی گئی وہ تالیفات ہیں جن پر زبانِ اردو کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ اس طرح کی حکایتوں، واقعوں اور قصّوں سے نہ صرف اردو زبان میں مہارت پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ اخلاقی و معاشرتی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ کالج کے اساتذہ خود بھی گل کرسٹ کی اردو کے تئیں محنت اور لگن کو دیکھتے تھے۔ شیر علی افسوس نے تو ان کی تعریف میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے:

پیشوائے صاحبانِ عقل مستر گل کرست
صاحبِ عالی طبیعت، صاف طینت، باصفا
تو ہر اک فن کا محقق ہے نہیں کچھ اس میں شک
مرتبہ غایت کو پہنچا ہے تری تحقیق کا
جامع الفاظ اردو دہر میں تو ہے فقط
خوبی تالیف تیری کوئی کب ہے جانتا
خصلتیں نیکوں کی جتنی وہ تجھ میں جمع ہیں
ریری مدّاحی جہاں تک کیجیے ہے وہ بجا

(ص 229، کلیات افسوس، مرتبہ سید ظہیر احسن، ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ، 1961)

ان اساتذہ کی تقرری اور گلکرسٹ کی دیگر اردو خدمات نے اردو نثر کو جدید اور آسان و سادہ روش پر ڈال دیا تھا جس پر چلتے ہوئے بعد میں سرسید اور ان کے رفقا نے اردو نظم و نثر میں جدتیں پیدا کیں اور سائنسی، انگریزی اور دیگر کتابوں کے ترجمہ و تالیف کی طرف توجہ کی۔ ان کی کوششوں کا ثمرہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے۔

◘

Mohaimina Khatoon, Research Scholar, 003, Old Mahanadi Hostel JNU, New Delhi - 110067

محمد شاہد پٹھان

ابو محمد سحر کا سحر غزل

یوں تو ڈاکٹر ابومحمد سحر صاحب کی ادبی شہرت و شناخت شاعر سے زیادہ محقق و نقاد کی ہے، مگر جن قارئین اور ناقدین کرام نے سحر کی شاعری کا ذرا بھی مطالعہ کیا ہے وہ میری طرح سے ان کی غزل گوئی کے بھی قائل و قدرداں ہوں گے۔ سحر صاحب تقریباً پچپن برس تک کارِ سخن وری سے وابستہ رہے۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے بہت زیادہ نہیں بلکہ بہت کم سرمایۂ سخن تخلیق کیا، مگر جو غزلیہ شاعری سحر نے 'برگِ غزل' (1981) اور 'برگِ سحر' (2002) کی صورت میں یادگار چھوڑی ہے وہ ان کی شاعرانہ حیثیت ہی کی ضامن نہیں بلکہ غزل کے فنی وفکری مضمرات واقدار کی بھی مظہر ہے۔ غزل کو اس کے فنی کیف وکم کے ساتھ برتنا معمولی صلاحیت کے شعرا کے بوتے کی بات نہیں، اس کے لیے مقدس دیوانگی کے ساتھ ساتھ ذہنی بالیدگی وفرزانگی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بقول محمد سحر:

آگہی یوں ہو کہ جیسے مل گیا سارا جہاں
بے خودی ایسی کہ اپنے آپ کو ڈھونڈا کریں

کیا میٹھے بول سناتے ہو، کیا گیت انوکھے گاتے ہو
کیا نغموں پر اتراتے ہو جھنکار نہیں تو کچھ بھی نہیں

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سحر صاحب نے اپنے تخلیقی سفر کے دوران شاعری کے معیار کو بھی برقرار رکھنے کی سعی کی اور غزل کے فنی رموز ونکات کی پاسداری بھی کی ہے۔

ڈاکٹر ابومحمد سحر کو اپنی تحقیقی وتنقیدی کارگزاریوں کے ساتھ ہی ساتھ شعری کارگزاری پر بھی ہمیشہ ایقان وافتخار رہا وہ تحقیقی کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود محقق محض قسم کے خشک اور بے رونق و بے ذوق آدمی کبھی نہیں بن سکے، اور اسی سبب سے وہ آخری عمر تک اپنے شعری ذوق کو زندہ وتابندہ بنائے رکھنے میں کامیاب رہے۔ ہمارے کئی شعرائے کرام وادیٔ تحقیق میں داخل ہونے کے بعد شاعری سے یا تو بہت دور ہوگئے یا پھر تائب (مثلاً مشفق خواجہ وغیرہ) مگر سحر صاحب نے پنے اندر کے شاعر کو ہمیشہ متحرک ومتبسم بنائے رکھا۔ اپنے اولین شعری مجموعے 'برگِ غزل' کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

''ادب کے لیے تحقیق وتنقید کی بڑی اہمیت ہے لیکن ان کا کوئی ایسا غلبہ مناسب نہیں جو شاعری یا اس سے تعلق رکھنے والی کسی چیز کے انسداد کی علامت بن جائے اور ایک ایسا ماحول پیدا ہو جس میں لوگ اپنے ناموں سے تخلص حذف کردیں... شاعری جوہر ہے اور تحقیق وتنقید عرض۔ عرض سے جوہر کا رتبہ تو کھل سکتا ہے لیکن اس کو جوہر پر برتری نہیں حاصل ہوسکتی۔ میری رائے میں ہر ادبی کارگزاری کے لیے ادبی ذوق لازمی ہے اور اس کی آخری کسوٹی شعری ذوق ہے۔ مجھے اپنی شاعری کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے لیکن اپنے طبعی رجحان کے پیش نظر میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے یہ مجموعۂ غزلیات ترتیب دینے کا موقع ملا اور اس کی اشاعت کے متعلق فیصلہ کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ میری علمی کاوشوں اور شاعری کے درمیان کسی قدرِ مشترک کی تلاش میں قارئین کو مایوسی نہ ہوگی۔'' (ص 8-7)

تنقید اور تحقیق درحقیقت 'تخلیق' کے بعد کی چیزیں ہیں اور اس لحاظ سے ہمیشہ سے وسرے درجے میں ہی براجمان رہی ہیں۔ اول منصب و مقام اصلاً تخلیق اور تخلیق کار کا ہی ہوتا ہے۔ جو ناقدین اور محققین شاعری کی 'نعمتِ خداداد' سے سرفراز کیے ہیں وہ اس ادبی کلیہ کو تسلیم کرتے آئے ہیں مگر گزشتہ تیس چالیس برسوں سے 'تخلیق' پر 'تنقید' حاوی رہی اور چند مغرب زدہ نقادوں نے اس رجحان کو بڑھاوا دینے میں خاص رول ادا کیا ہے۔ چھوٹے موٹے دل گردے کے ادبا وشعرا ایسے نقادوں سے متاثر ہی نہیں بلکہ خوف زدہ بھی رہے ہیں، چنانچہ نقاد اور اس کی آدھی ادھوری تنقید کو 'تخلیق' پر مقدم بنانے اور منوانے میں ممد ومعاون ثابت ہوئے ہیں۔

غزل میں طبع آزمائی بظاہر جس قدر آسان ہے، عمدہ اور پائندہ غزل کہنا اتنا ہی محال ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر دور میں غزل گویوں کی وافر تعداد کے باوجود منفرد اور معتبر غزل گو شعرا کم کم ہی نظر آتے ہیں۔ سامنے کی ردیفوں اور قافیوں میں تازہ کاری اور تاب لاکر فکر پاروں کی تخلیق جوہر آزما ہی نہیں جان آزما بھی ہے، سحر کو اس حقیقت کا احساس ہے، چنانچہ کہتے ہیں:

خوبیِ فن نہیں پروردۂ آورد سحر
روحِ تخلیق دمِ کن فیکن مانگتی ہے

میری غزل کا رنگ سحر
خون جگر کی ہے سوغات

ڈاکٹر ابومحمد سحر موضوعاتی سطح پر غزل کو ہمہ جہتی اور تنوع نگاری سے ہم کنار کرنے کے روادار ہیں، انھوں نے اپنے اظہارات میں کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کی، کلاسیکی غزلیہ مضامین ہوں یا اپنے ذاتی درد و داغ کا ذکر ہو یا پھر عصری آشوب واضطراب کا بیان، سحر نے ہمہ رنگ مضامین و موضوعات کو شعری تلازمات کے ساتھ برتنے کی فن کارانہ مساعی انجام دی ہیں۔ ایک طرف اگر وہ یہ کہتے ہیں:

وہ بہار صد بہاراں سامنے کیا آگیا
فکر کی رنگینیاں گویا مجسم ہوگئیں

عشق کے مضموں تھے جن میں وہ رسالے کیا ہوئے
اے کتابِ زندگی تیرے حوالے کیا ہوئے

وہیں انھیں فن اور فن کار کی عظمت وفضیلت اور فعالیت وفرزانگی کا بھی احساس ہے چنانچہ وہ کچھ اس طرح بھی گویا ہوتے ہیں:

شعورِ ذات بھی ادراک غیر ذات بھی تھا
حدودِ ذات میں یوں بیکراں ہوئے ہم لوگ

بے ربطیِ حیات کا منظر بھی دیکھ لے
تھوڑا سا اپنی ذات کے باہر بھی دیکھ لے

ڈاکٹر ابومحمد سحر نے غزل ہی کو اپنے فنی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ شاعری کے متعلق انھوں نے اپنے جن افکارِ عالیہ کا اظہار کیا ہے، اس کے پیش نظر ممکن تھا کہ وہ رباعی، قطعہ یا نظم میں بھی جوہرِ فن دکھانے کی سعی کرتے، مگر انھوں نے شعر وادب کے تعلق سے اپنی تمام امیدوں، اور خوابوں کی تعبیر صرف اور صرف 'غزل' ہی سے وابستہ کیا ہے چنانچہ 'غزل' کے متعلق سحر کے فنی فکری اور موضوعاتی سروکار درحقیقت زندگی اور متعلقاتِ زندگی سے کسی قدر مربوط ومستحکم معلوم ہوتے ہیں۔ خاطرنشاں رہے کہ سحر کے نزدیک انسانی زندگی کے چند رنگ نہیں بلکہ یہ عروسِ ہزار شیوہ ہے۔ لہٰذا اس کے مختلف رنگوں اور رویوں سے آشنائی قائم کرنا اور اسے متنوع زاویوں سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش تخلیق کار کا معمول ہونا چاہیے۔ سحر کے حسبِ ذیل اشعار کے بین السطور میں موجود وموجزن

تصورات کی تفہیم ضروری ہے۔ کہتے ہیں:

جاگا وہ درد دل میں کہ آنسو نکل پڑے
برسا ہے آج ٹوٹ کے پانی غزل سنو
سر پر ہوائے سنگِ ملامت چلی بہت
لیکن غزل نے ہار نہ مانی غزل سنو

ظاہر ہے کہ جس تخلیق کار کو اپنے اور غزل کے فن پر اس قدر اعتماد و ایقان ہو، اس کے 'حریم ناز' تک رسائی پانا کسی بھی طرح بے سود نہ ہوگا۔ غزل کا فن چونکہ کنایات و علامات کا فن ہے، اس کے استعاراتی اظہار میں معانی و مفاہیم کی کائنات آباد ہوتی ہے، اور قاری اپنی فہم و فراست کے مطابق تعبیرِ سخن کی سعی کرتا ہے۔ سحر اپنے قاری سے کچھ یوں مخاطب ہوتے ہیں:

چاند کا رقص ستاروں کا فسوں مانگتی ہے
زندگی پھر کوئی اندازِ جنوں مانگتی ہے
نہیں جب حال ہی اپنا تو مستقبل کی پروا کیا
غمِ امروز چھوڑا فکرِ فردا چھوڑ دی میں نے
سحر واجب ہے تعظیمِ تغیر
یہ مانا ہم نے حیرانی کے دن ہیں
غم کریں کیا شکستہ خوابوں کا
پھول تھے کچھ، بکھر گئے ہوں گے
زندگی میں کچھ خوشی کا بھی بہانہ چاہیے
اک کہانی دکھ بھری سی عمر بھر اچھی نہیں
روز و شب جھوٹی امیدوں پر بھی جینا ہے فضول
گرچہ نومیدی کی بھی شام و سحر اچھی نہیں
چہرۂ آدم کو ہے درکار خوشیوں کا گلال
خون میں ڈوبی ہو گرد سفر اچھی نہیں

غرضیکہ سحر کی شاعری کے مطالعے کے دوران قاری کو فکر و احساسات کی ایک بوقلموں کائنات محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے اظہارات کے دوران جذباتیت اور بلند آہنگی کے بجائے خودکلامی کے استعاراتی پیرایۂ بیان کو مرجح گردانا ہے۔ چنانچہ اپنے عصری و آفاقی مسائل و مظاہر کے اظہار کے دوران بھی سحر، شاعری کا ایک سنجیدہ اور پرکار اسلوب اپنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ آزادی کے بعد کے سیاسی و سماجی ماحول و منظر کے احتسابی نقوش ابھارنے میں سحر کو کس قدر فنی دست گاہ حاصل ہے۔ اس کا اندازہ ان کے درج ذیل اشعار سے کیا جاسکتا ہے:

گمانِ محض تھا، امید تھی کہ نومیدی
فریب اہلِ تمنا نے کھائے ہیں کیا کیا
دوریِ جنت میں تا جنت کا حسنِ دل فریب
کتنی تصویریں قریب آنے سے مدھم ہوگئیں
وہ رہروانِ کوئے ستم گر کہاں گئے
سر پر جنھوں نے کھائے تھے پتھر کہاں گئے
صبحِ نشاط وصل کے جلووں کو کیا ہوا
شامِ غم فراق کے منظر کہاں گئے
آج ہم ہیں اور اک فرسودہ تعبیرِ حیات
خواب جو دیکھے تھے دنیا سے نرالے کیا ہوئے
نہ جانے کون سے پردے میں ہوگیا روپوش
وہ ایک شخص کہ سب جس کو آدمی کہتے
شہر بے آب ہے پیاسے ہیں شجر اور حجر
زندگی دشت و بیاباں میں نکل آئی ہے

جیسا کہ ذکر ہوا، سحر صاحب غزل کے فنی رموز و نکات سے گہری آگاہی رکھتے ہیں۔ چنانچہ زندگی کے بعض اہم حقائق و اسرار پر وہ بڑی ماہرانہ و دانش ورانہ نگاہ ڈالتے ہیں اور قاری کو اپنے مشاہدات و تجربات میں شرکت کی کچھ اس طرح سے اپیل کرتے ہیں کہ ان کا یہ عمل شعوری نہیں بلکہ لاشعور علم معلوم ہوتا ہے، مثلاً:

ہم اس عروج و ترقی کو کیا کہیں جس میں
زوالِ عظمت انساں دکھائی دیتا ہے
کوئی صورت نہیں اُجالے کی
شمع نے سر کٹا کے دیکھ لیا

غزل فی نفسہٖ محبوب، رقیب اور دنیا والوں سے باتیں کرنے ہی کا فن نہیں بلکہ اپنے آپ کو سمجھنے اور خود سے مکالمہ کرنے کا بھی موثر ذریعہ ہے۔ اسے سہولت کے لیے ہم داخلیت و انفرادیت کے اظہار سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ یوں تو کلاسیکی شعرا میں مثلاً ولی، سراج اورنگ آبادی، میر، غالب، مومن اور ظفر کے یہاں بھی خودکلامی اور زیرِ لبی اظہار کے اثرات بآسانی دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ مگر رومانی شعرا 'حلقۂ ارباب ذوق' اور 'جدیدیت یا آزادی کے بعد کے ماحولِ حیات میں پروان چڑھنے والے جدید حسیت کے علم بردار سخن پردازوں کے فکری اظہارات میں انفرادی و داخلی طرزِ اظہار کا مستقل رجحان نمایاں ہوا ہے۔ سحر صاحب کی غزل میں بھی اس طرزِ سخن کو خاص اہمیت حاصل ہے یہ ان کے شعری اظہار کا حاوی رجحان ہے۔ سحر کے عشقیہ اشعار ہوں یا مسائلِ زمانہ کا بیان انھوں نے اپنے احساسات کے اظہار میں اپنی داخلیت و انفرادیت کے نشان ثبت کرنے کی سعی کی ہے:

اب اس سے کیا غرض ہے کہ انجام کیا ہوا
یہ تو نہیں کہ تیری تمنا نہ کرسکے

اس طرح اپنے عصری و آفاقی مسائل اور مظاہر حیات کا بیان بھی سحر نے داخلی اور انفرادی طریقِ کار کے ذریعے کیا ہے۔ ان کی وجودیت آمیز انفرادیت میں اپنے زمانے کا اضطراب و انتشار بھی سمٹ آیا ہے۔ نئے دور کے انسان کو آج جس طرح کی مشکلوں، آزمائشوں اور وارداتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس سے اس کا وجود مجروح اور ملول ہوکر رہ گیا ہے۔ جدید غزل نمائندہ شعرا کے یہاں اسی 'پریشاں حال' انسانی کردار کی نقش گری مختلف انداز و اطوار سے کی گئی ہے۔ سحر صاحب کی غزلیہ شاعری میں متذکرہ شعری نقش گری کچھ اس طرح ہوئی ہے:

دل کے بہلانے کے تھے جتنے بہانے چپ ہیں
فرد کا ذکر ہے کیا اب تو گھرانے چپ ہیں
دھوپ ہے سخت ہوا بھی مسموم
کون دروازوں کے باہر نکلے
کوئی منزل نہ کہیں سنگِ نشاں
فاصلے اپنا مقدر نکلے
راہ دشوار اور پرخطر تھی بہت
جانے کس موڑ پر ہم سفر رہ گئے
سازِ ہستی میں نہیں تار خوشی کے شاید
جو صدا آتی ہے اب درد بھری آتی ہے
کس کو اب حوصلۂ انجمن آرائی ہے
کوئی عالم ہو یہاں عالم تنہائی ہے

سحر صاحب کی شاعری میں زندگی کے مصائب و شدائد میں عزم و حوصلے کے ساتھ زندگی کرنے کا مستقل میلان ہے وہ ہجوم غم میں مسکرانے کی سکت رکھتے ہیں اور انسان کے سامنے زندگی گزارنے کا ایک انتہائی مثبت، معتبر اور مجاہدانہ طریقِ کار پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ابومحمد سحر کی غزلیہ شاعری میں شاعرانہ رمزیت و ایمائیت کے ساتھ ہی معنوی بلاغت کے عمدہ نمونے بھی موجود ہیں۔ وہ زندگی اور اس کی اقدار کے جتنے قدر شناس ہیں بعینہٖ شعری نکات و لوازمات کے بھی رمز آشنا ہیں۔ اپنی شاعری میں انھوں نے اختصاریت اور انتخابیت کی کیفیت برقرار رکھنے کی سعی مسعود کی ہے۔ غزل کے کسی بھی شاعر کے سیکڑوں نہیں بلکہ درجنوں اشعار ہی مقبول و منقش ہو پاتے ہیں، سحر صاحب کے بھی ایسے درجنوں اشعار مل جائیں گے جو ہمارے ذہن و ذوق کی سیرابی کی صفت و کیفیت رکھتے ہیں:

کس کے نغموں میں سحر پنہاں تھی روحِ کائنات
بربطِ تارِ رگِ جاں پر غزل خواں کون تھا

■

Mohd Shahid Pathan, Basha Vidya Peeth
M Gandhi Hindi University, Wardha - 442001 (MS)

مظہر محمود

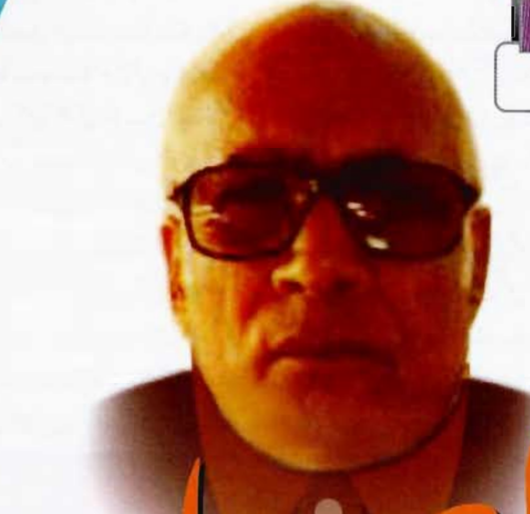

رام لعل
ایک مطالعہ

کرشن چندر، منٹو، راجیندر سنگھ بیدی وغیرہ کے بعد افسانہ نگاروں کی جونسل بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ابھر کر سامنے آئی رام لعل کا شمار انھیں میں ہوتا ہے۔ رام لعل کے اس وقت کے ہم عصروں میں قرۃ العین حیدر، انتظار، شوکت صدیقی، اقبال متین، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کو کچھ شروع سے ہی اہمیت حاصل ہوگئی تھی اور غالباً اس لیے کہ اس زمانے میں اردو میں خواتین افسانہ نگاروں کی تعداد بہت کم تھی لیکن جب ہم آزادی کے بعد مذکورہ بالا بشمول جیلانی بانو، جوگیندر پال وغیرہ کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو رام لعل ان کے ہم پلّہ نظر آتے ہیں۔

رام لعل کا جنم 3 مارچ 1923 کو مغربی پنجاب کے ایک پسماندہ ضلع میاں والی میں ایک متوسط خاندان میں ہوا تھا اور ان کا انتقال 16 اکتوبر 1996 کو لکھنؤ میں ہوا۔ اس خاندان میں علم و ادب کی تخلیقی سطح پر پہلے سے کوئی روایت نہیں تھی۔ عام طور پر ہر تخلیق کار کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کی وجہ سے اس کا فطری جھکاؤ علم و ادب کی تخلیق یا مصوری یا دیگر فنون کی طرف ہو جاتا ہے۔ رام لعل کی زندگی کا ایک المناک واقعہ ڈھائی سال کی عمر میں ان کی والدہ کا انتقال تھا۔ اس عمر میں ماں کی محرومی کا احساس اور بھی بڑھ جاتا ہے جب بچے کا باپ دوسری شادی کر لیتا ہے اور اس طرح وہ اپنے باپ کی ہمدردی سے بھی کافی حد تک محروم ہو جاتا ہے۔ رام لعل کے اس وقت کے ذہنی رویے کو سمجھنے کے لیے ایک طرف تو ان کے مطالعے کے شوق کو پیش نظر رکھنا ہوگا، دوسری طرف رام لعل کے فلمیں دیکھنے کے بے پناہ شوق کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، جس کے بارے میں انھوں نے خود اپنی نوشت میں لکھا ہے کہ جب وہ بارہ برس کے تھے اور ساتویں درجے میں زیر تعلیم تھے تو ان کے والد نے اپنا ایک سنیما گھر دل رُبا ٹاکیز کے نام سے تعمیر کرایا تھا جہاں انھوں نے بے شمار اچھی و معمولی فلمیں مثلاً دیوداس، دھوپ چھاؤں، چنڈی داس، لیلا مجنوں، عورت کا پیار، سلور کنگ وغیرہ دیکھی تھیں اور لگ بھگ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے اندر کہانی لکھنے کی خواہش بھی محسوس کر لی تھی۔

رام لعل اپنی پہلی تخلیق افسانہ بعنوان 'تھوک' قرار دیتے ہیں۔ جو ہفت روزہ لاہور میں 1943 میں شائع ہوا تھا۔ ماہنامہ 'شاہکار' میں رام لعل کا ایک اور اہم ابتدائی افسانہ بعنوان 'جلن' شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے افسانے شاہکار، بیسویں صدی اور کہانی جیسے ماہناموں میں چھپنے لگے۔ رام لعل کے محبوب ترین افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی کے علاوہ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجیندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی وغیرہ شامل تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ انھوں نے اس زمانے تک ٹیگور، پریم چند، سدرشن، فیاض محمود، نیاز فتحپوری، راشد الخیری، ڈپٹی نظیر احمد، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کو پڑھ لیا تھا۔ 1945 میں رام لعل کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'آئینے' شائع ہوا تھا۔ اس کا تعارف احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا۔

اس وقت تک رام لعل ادب لطیف، ادبی دنیا، ساقی، نیرنگِ خیال، سب رس جیسے رسالوں میں تواتر کے ساتھ شائع ہونے لگے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سیاسی سطح پر ملک کی تقسیم کا غلغلہ اٹھا تھا۔ کئی جگہوں پر فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ ملک تقسیم ہوگیا۔ رام لعل کو نقل مکانی کے تجربے سے گزرنا پڑا۔ لاہور چھوڑ کر وہ ہندوستان چلے آئے۔ رام لعل نے تقسیم ملک کے فسادات کے بارے میں اور ہندوستان میں شرنارتھیوں کے نوآبادکاری کے مسائل کے بارے میں اور اپنے ریلوے کی ملازمت کے ماحول کے بارے میں بھی بے شمار افسانے لکھے۔

آزادی کے بعد رام لعل لکھنؤ جا کر بس گئے۔ وہاں کا ادبی ماحول قریب سے دیکھا۔ کئی کانفرنسوں اور مختلف یونیورسٹیوں کے سیمیناروں میں بھی شرکت کی۔ انھوں نے کئی بار غیر ممالک کے سفر بھی کیے اور نتیجے کے طور پر کئی افسانے، ناول، سفرنامے، تنقیدی مضامین اور ڈرامے وغیرہ لکھے۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ رام لعل کا پہلا افسانہ بعنوان 'تھوک' 1943 میں ہفت روزہ 'خیام' لاہور میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ ان کے پہلے افسانوی مجموعے 'آئینے' میں بھی شامل تھا، جو کہ 1945 میں منظر عام پر آیا

تھا۔ یہ افسانہ دراصل دو دوستوں کی لاہور کی ایک معروف سڑک پر آوارہ گردی کا بیانیہ ہے۔ دونوں دوست نوعمر ہیں اور سنیما گھروں اور دیگر تفریح گاہوں پر مٹر گشتی کرتے ہیں۔ جن کی جیب میں زیادہ پیسے بھی نہیں۔ بے روزگاری کے کرب میں مبتلا یہ دونوں نوعمر لڑکوں کی توجہ کا مرکز ایک برقع پوش بھکارن بن جاتی ہے جو مختلف لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کر مختلف بہانوں سے بھیک مانگتی پھرتی ہے۔ کبھی اپنی بھوک کی فریاد، کبھی بیٹی کی موت کا المیہ اور کہیں سمندر پار جنگ میں اپنے شوہر کی گمشدگی کا ذکر۔ دونوں لڑکے اس عورت کو اپنی جیب میں رکھی واحد اٹھنی دینے کا لالچ دے کر اپنی قیام گاہ پر لے آتے ہیں اور جب وہ عورت برقع اتار دیتی ہے تو وہ ایک کالی کلوٹی ادھیڑ عمر کا پیکر ثابت ہوتی ہے۔ جسے دیکھ کر نوجوانوں کے احساس جمالیات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ اس کی طرف اٹھنی پھینک کر اسے وہاں سے بھگا دیتے ہیں۔ افسانہ 'تھوک' کی ابتدائی سطریں اس طرح ہیں:

''فوجی ریسٹورنٹ کے قریب ہیرا کھڑا ہنس رہا تھا۔ جیب میں ایک اٹھنی تھی۔ چاندی کی گول مٹول اٹھنی۔ انگلیاں ٹٹول رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ہنسی اپنا اصلی رنگ کھو بیٹھی۔ بھکارن کو چھیڑتا دیکھ کر ہنس کر اسے شہ دے رہی تھی۔ انھیں ہنستا دیکھ کر اس کے ہونٹ بھی وا ہو گئے۔ ہنسی جیسے رال بن کر بہنے لگی۔''

اس مجموعے میں رام لعل کا ایک اور افسانہ 'یہ شارع عام نہیں ہے' قابل توجہ ہے جو ایک نوعمر لڑکے کی ویسی ہی مٹر گشتی کی روداد ہے۔ وہ گھومتے گھومتے لارنس گارڈن میں انگریزوں کے ایک کلب کے قریب جا پہنچتا ہے۔ جہاں ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اس میں رام لعل نے لکھا ہے:

''انگریز عورتیں اور مرد باہوں میں باہیں ڈال کر ناچ رہے تھے۔ باجا بج رہا تھا۔ کئی ایک طرف بیٹھے وہسکی پی رہے تھے اور جھوم رہے تھے۔ للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بیرے خدمت بجا رہے تھے اور چوکیدار آس پاس پہرا دے رہے تھے چوکیدار اسے وہاں سے بھگا دیتا ہے۔ اس پر نوعمر لڑکا برافروختہ ہو کر کہہ اٹھتا ہے۔ یہ دیکھ میری جیب میں دو روپے ہیں تو دیکھ دیکھ کر ترستا ہے اور اپنے آپ کو مطمئن سمجھتا ہے۔ میں ابھی جا کر ایک عورت کے ہونٹ، بال، رخسار اور ساری عورت خرید سکتا ہوں۔ تو کیا کر سکتا ہے؟''

اس مجموعے میں ایک اور اہم افسانہ 'فرار' ہے۔ جس میں انگریزوں کے دور حکومت میں ایک نوعمر لڑکا جو ایک ریلوے ورکشاپ کے اندر آگ کی دہکتی ہوئی بھٹیوں کے پاس روزانہ نو گھنٹے کام کرتا ہے لیکن وہ ملنے والی اجرت سے سخت غیر مطمئن ہے کیوں کہ اس سے وہ روٹی، کپڑا اور مکان کی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتا۔ اچانک دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے اسے فوج میں بھرتی ہو کر ہندوستان سے بھاگ جانے کا موقع مل جاتا ہے۔

رام لعل کی کہانی 'جلن' مغربی پنجاب کی ایک خاص تہذیب کی عکاسی کرتی ہے جس میں متوسط مسلم معاشرے میں شادی اور لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور حسد کی ایک دھیمی دھیمی آنچ ملتی ہے۔ مجموعے میں شامل دیگر اچھی کہانیاں 'بے روزگاری' اور 'مفلسی' ہیں۔ جن کا موضوع سماجی نا برابری اور جنسی نا آسودگی ہے۔ اس افسانوی مجموعے کے تعارف میں احمد ندیم قاسمی رام لعل کے فن افسانہ نگاری سے متعلق لکھتے ہیں:

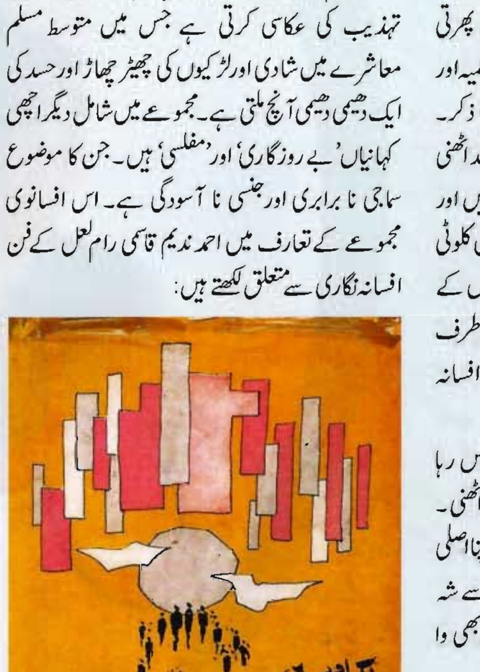

''ان افسانوں میں نئی تکنیک کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ رام لعل پلاٹ کا بہت زیادہ قائل نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن وہ پلاٹ کی اہمیت سے بھی بے خبر نہیں۔ ایک ننھی سی بات، ایک ذرا سا واقعہ، اس کے حساس دل میں تھرتھراہٹ سی پیدا کر دیتا ہے اور وہ اپنی دیہاتی ذہنیت اور تعلیم یافتہ ماحول کے پس منظر پر پیاری اور خوبصورت تصویر اتار لیتا ہے...... رام لعل کا انداز تحریر مفکرانہ ہے۔ زندگی کے اس گرجتے دھارے میں اس کی تیز نگاہ ایک بے مایہ تنکے کو بھی دیکھ اور پرکھ سکتی ہے۔ وہ کف آلود لہروں میں گھری ہوئی چٹانوں کی طرف اتنا متوجہ نہیں جتنا بلبلوں، تنکوں اور گردابوں کی طرف۔ وہ نقاشی بھی کرتا ہے اور عکاسی بھی۔ وہ ذہنی تصویریں بھی تیار کر سکتا ہے اور کائنات میں بکھری ہوئی بے شمار تصویروں کا فوٹو بھی اتار سکتا ہے، سوچتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے۔ یہی خوبی ہے جو اس کی کہانی کو زندہ رکھے گی، کیونکہ بصیرت اور بصارت اگر الگ الگ ہو کر کام کریں تو زندگی زندگی نہیں رہتی۔''

رام لعل کی افسانہ نگاری کے اولین دور کا دوسرا قابل ذکر مجموعہ 'انقلاب آنے تک' کے عنوان سے آزادی کے بعد 1949 میں انٹرنیشنل پبلشرز، بنارس کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اُس زمانے میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ آزادی اپنے ساتھ فسادات کا ایک المناک سلسلہ لے آئی تھی۔ قومی سطح پر تعمیر و تشکیل کا ایک خواب سامنے رکھ دیا گیا تھا لیکن اس کی تعمیر میں شکست و ریخت، نا آسودگی اور نا امیدی بھی موجود تھی۔ 'انقلاب آنے تک' عنوان ہی سے اس بات کا شاہد ہے کہ انقلاب ابھی دور ہے لیکن اس کی راہ میں بے شمار مسائل، بے شمار کھائیاں اور دشوار گزار پہاڑ آتے ہیں جن کا سامنا کرنا رام لعل ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا یہ مجموعہ زیادہ تر آزادی کے فسادات کے بارے میں لکھے ہوئے افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان فسادات کو رام لعل نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جھیلا اور ہزاروں لاکھوں مہاجروں کی طرح سرحد کو پار کیا تھا۔ نئے ہندوستان میں پہنچ کر بھی انھوں نے ذہنی توازن نہیں کھویا اور انھوں نے ایک مثبت انداز میں فسادات کا معاشی اور سماجی تجزیہ پیش کیا۔

فسادات کے موضوع پر اس مجموعے میں رام لعل کے دو اور افسانے 'بھیڑیئے' اور 'کھیتوں کی رانی' بھی شامل ہیں۔ لیکن رام لعل کے پیش نظر فسادات اور ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ کچھ اور مسائل بھی تھے جنھیں انھوں نے برسوں بعد تک ایک نئے تجزیاتی انداز سے لکھا۔ جو لوگ بے خانماں و برباد ہو کر پاکستان سے ہندوستان پہنچے۔ ان کے سامنے نو آبادکاری کی بھی مشکلات تھیں اور اپنے کھوئے ہوئے وطن کی یادوں کو بھی وہ کسی طرح سے محو نہیں کر سکتے تھے۔ نئی سرزمین پر پہنچ کر ان کے طرز معاشرت میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں جن کا سلسلہ نئی نسلوں تک پہنچتا ہے۔ ان سب کا احاطہ رام لعل نے اپنے بہت ہی معروف افسانوں اکھڑے ہوئے لوگ، قبر، اندھیرے میں کھوئی ہوئی صلیب، تلاش گمشدہ، نصیب جلی، ایک ہزار بچوں والی ماں، زہر تھوڑا سا، نئی دھرتی پرانے گیت، ایک شہری پاکستان کا اور 'شگن' وغیرہ میں بڑی خوبی سے کیا ہے۔

کسی بھی ملک میں جب تاریخ کے فیصلے کے مطابق ایک بہت بڑی ہجرت کا عمل شروع ہوتا ہے تو اس کے اثرات چند برسوں میں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ذہنی طور پر نسلیں صدیوں تک زمین و آسمان کے درمیان معلق رہ جاتی

ہیں۔ رام لعل نے اسی نقطۂ نظر سے تقسیم سے پیدا شدہ حالات پر ایک مفکرانہ طرز اظہار اپنایا اور مذکورہ بالا افسانوں میں سے کچھ ایک کو تو اردو ادب کا قابل قدر حصہ بنا دیا۔

رام لعل کے افسانوں کا ایک اہم ترین مجموعہ 'نئی دھرتی پرانے گیت' کے عنوان سے 1958 میں مکتبہ فکر جدید، لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، جس نے انھیں آزادی کے بعد کے ممتاز افسانہ نگاروں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ اس مجموعے سے متعلق اہم نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے:

''رام لعل اردو کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کی نظر کی صحت اور فن کی پختگی اب اردو دنیا میں تسلیم کی جا چکی ہے۔ میں نے ان کے افسانے سنے بھی ہیں اور پڑھے بھی ہیں۔ ان افسانوں میں حقیقت نگاری کے ساتھ حسن اور فن کے التزام کے ساتھ فکر کی گہرائی ہے۔ انھوں نے زیادہ تر اُنھیں موضوعات کو لیا ہے، جن سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ اس واقفیت کی وجہ سے ان کے افسانوں میں جان ہے۔'' رام لعل محکمۂ ریل سے وابستہ رہے۔ انھیں اس محکمے کے مختلف نوع کے افراد کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان لوگوں کی نفسیات کا بہت گہرائی سے رام لعل نے مطالعہ کیا اور انھیں اپنے متعدد افسانوں میں پیش بھی کیا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اس مجموعے سے متعلق لکھا ہے کہ ''شرنارتھیوں کی زندگی اور ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی نفسیاتی کشمکش، ریلوے کالونی، ٹرین کے ڈبے اور گودام کے اکاؤنٹر سے جھانکتے ہوئے انسانی چہروں کی سرگزشت رام لعل کے محبوب موضوع ہیں اور وہ انھیں پوری نفسیاتی باریک بینی اور فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ اپنے خوبصورت افسانوں میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ رام لعل کے افسانے اردو افسانے کی قوس وقزح کا ایک دلنواز اور رنگین جزو ہیں۔''

رام لعل نے اپنے آغازِ سفر سے ہی ایک طرف تو نہایت سادہ نثر کو اپنایا دوسری طرف عام لوگوں کی طرح چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور محرومیوں کو پیش کرنے کی کوشش کی، جنھیں عام طور پر بڑے افسانہ نگار یا تو نظر انداز کر دیتے ہیں یا ایسے وسیع کینوس پر رکھ کر پیش کرتے ہیں کہ وہ بے حد بوجھل قسم کا فلسفہ بن جاتا ہے۔ اس ضمن میں رام لعل نے چے خف اور موپاساں کو اپنا آئیڈیل بنایا ہے۔ اس مجموعے میں پریم چند جیسے قدآور افسانہ نگار نے رام لعل کے فن پر کچھ اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

''رام لعل کے افسانے چھوٹے چھوٹے ہندوستانی گھروں کے دکھ درد اور خوشیوں کے افسانے ہیں یہ عوام کے سیدھے سادے جذبات کے تانے بانے سے بُنے گئے ہیں۔ یہ افسانے مرعوب نہیں کرتے، متاثر کرتے ہیں۔ ان میں گراں بار الفاظ کی بوجھل ترکیبیں نہیں ہیں۔ سادہ رنگوں کی مصوری ہے جو دل میں اتر جاتی ہے۔ ان افسانوں کا لہجہ، ان کی ادا، ان کا پیرایۂ حقیقی زندگی سے مستعار ہے۔''

رام لعل کے افسانوں میں ایسا کوئی بھی افسانہ نہیں ملتا جسے فحش نگاری سے تعبیر کیا جاسکتا ہو انھوں نے جنس کو ایک سماجی اور انفرادی مسئلہ بنا کر پورے اعتدال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس کی مثال منجمد لمحے، ملبہ، فرضی آگ کی لو وغیرہ سے دی جاسکتی ہے۔ رام لعل کے افسانوی سفر کا پہلا دور 1960 کے آس پاس ختم ہو جاتا ہے، جس میں ان کی افسانہ نگاری کے ابتدائی نقوش بھی مل جاتے ہیں۔ اور پختہ کاری کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کے واضح ترین نشانات بھی مل جاتے ہیں۔

رام لعل کی زندگی حقیقی معنوں میں ایک سفر مسلسل تھی۔ اندرون ملک میں ریلوے کی ملازمت کے باعث وہ جموں و شملہ سے لے کر گجرات، کاٹھیاواڑ، ممبئی، مدراس، میسور، کلکتہ اور آسام تک سفر کرتے رہے مختلف علاقوں کے لوگوں سے برصغیر ہندو پاک میں ان کا واسطہ پڑا جہاں رسم و رواج، طرزِ بود و باش، لباس، رہن سہن، انفرادی رویے اور زبانیں مختلف النوع تھیں ان تجربات و مشاہدات نے رام لعل کے ذہنی افق کو وسیع تر کیا۔ رام لعل نے غیر ممالک کے کئی سفر کیے جس میں ان کے سابق وطن پاکستان کے علاوہ نیپال، ناروے، سویڈن، ڈنمارک، انگلینڈ، سویت روس، مغربی جرمنی، سوئزر لینڈ اور فرانس شامل تھے۔ ان میں سے بعض ممالک میں تو وہ ایک سے زیادہ بار گئے تھے۔ رام لعل کے یہ سارے دورے ادب کے وسیلے سے تھے۔ کہیں سیمینار، کہیں کتابوں کی تعارفی تقریبات، کہیں محض سیر و سیاحت کا شوق باعث سفر رہا۔ رام لعل نے چار اہم سفرنامے تحریر کیے۔ اپنے سفرناموں میں بھی ساری روداد بڑے افسانوی ڈھنگ میں لکھی۔ یقیناً ان سفرناموں کو بھی قاری افسانوں جیسی دلچسپیوں کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ رام لعل لوگوں کے ساتھ بڑی جلدی سے گھل مل جاتے تھے۔ ملنے والوں کی ذاتی زندگی، رویوں اور نظریات سے وہ کوئی نہ کوئی افسانہ تلاش کر لیا کرتے تھے۔ اس طرح رام لعل کے سفرنامے اپنی افسانوی فضا کی وجہ سے خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

'زرد پتوں کی بہار' رام لعل کے سفرنامۂ پاکستان کا عنوان ہے۔ رام لعل نے آزادی کے بعد اپنے کھوئے ہوئے وطن اور جنم بھومی میانوالی مغربی پنجاب کا لگ بھگ بتیس برسوں کے بعد 1980 میں سفر کیا تھا جہاں وہ ایک مہینے تک قیام پذیر رہے۔ اپنے گھر میں بھی گئے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ جہاں رہ کر انھوں نے ہائی اسکول تک اپنی تعلیم پوری کی تھی اور اس گھر کی یادیں ان کے ذہن سے کبھی محو نہ ہو سکیں۔ جذباتیت کے ان لمحات کو رام لعل نے اس سفر نامے میں بڑے اچھے افسانوی پیرائے میں پیش کیا ہے۔

رام لعل کا ایک مشہور افسانہ 'پکھیرو' ان کے بیرون کے سفر سے متاثر ہو کر لکھا گیا ایک شاہکار مانا جاتا ہے۔ ان کا ایک اور افسانہ 'ہندوستانی نژاد' ایک ایسی لڑکی کے بارے میں ہے جو ڈراموں میں کام کرنے کی شوقین ہے لیکن اسے ہر ڈرامیٹک کلب کے ڈائریکٹر نے اپنی رکھیل بنانا چاہا۔ اس افسانے کا عنوان 'ایک بدن ایک شہر' ہے جو 'گزرتے لمحوں کی چاپ' افسانوی مجموعے میں شامل ہیں۔ مغربی پس منظر پر لکھی ہوئی رام لعل کی ایک اور قابل ذکر کہانی 'ناگ پھنی' ہے۔ جس کا مرکزی کردار ایک فلسطینی خاتون 'نادرہ ناصری' ہے۔ یہ ان کے افسانوی مجموعے 'ڈوبتا ابھرتا آدمی' میں شامل ہے جو لاہور سے 1985 میں شائع ہوا۔ اس سلسلے کا ایک اور قابل ذکر افسانہ 'مڈنائٹ سَن' ہے۔ جو ان کے افسانوی مجموعے 'سدا بہار چاندنی' میں شامل ہے۔ یہ مجموعہ مکتبہ جامعہ نئی دلّی نے 1986 میں شائع کیا تھا۔ اردو کے افسانوی ادب کا دامن ابھی تک ایسے افسانوں سے خالی تھا جو دوسرے ممالک کے پس منظر پر لکھے گئے ہوں اور انھیں لکھنے والے ہندوستانی تخلیق کار ہی ہوں۔ اس کمی کو سب سے پہلے رام لعل نے پورا کیا۔ ان افسانوں میں دیگر ممالک کی رسموں، رواجوں، رویوں اور معاشرتی زندگی کی جھلکیاں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ رام لعل نصف صدی سے زائد عرصے تک اردو افسانے کی تخلیق اور اشاعت میں سرگرم رہے۔ وہ برصغیر کے قریب قریب تمام ادبی جرائد و رسائل میں بڑی باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ ان کی افسانہ نگاری کے متعدد گوشوں پر تقریباً تمام اہم نقادوں نے قلم اٹھایا۔ کئی رسائل نے خصوصی گوشے شائع کیے۔ یقیناً رام لعل کی شخصیت اردو افسانے کے آسمان پر ایک درخشاں ستارے کی طرح چمکتی دمکتی دکھائی دیتی ہے۔

□

Mazhar Mahmood, Senior News Producer (News&Current Affairs), R. No. 518, DD News, Doordarshan Bhawan, Tower-B, Copernicus Marg, New Delhi- 110 001

ادارہ

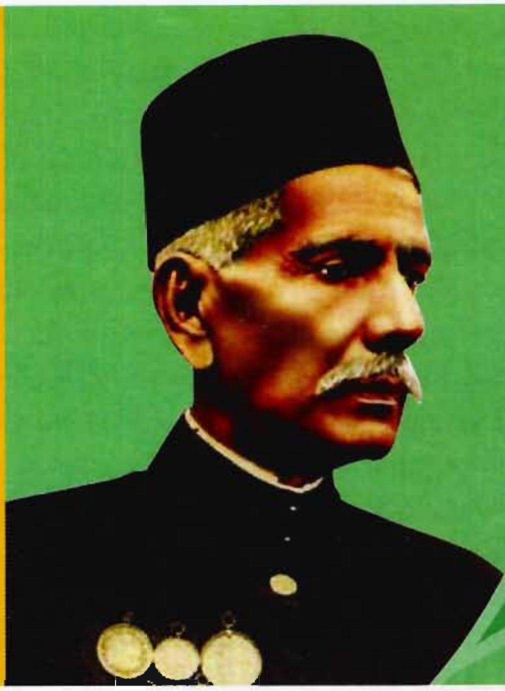

سید علی تقی زیدی صفی لکھنوی

سید علی تقی زیدی نام، صفی تخلص تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ کا آبائی وطن غزنی تھا۔ صفی لکھنوی کے آبا و اجداد سید نورالدین شاہ التمش کے زمانے میں دہلی آ گئے۔ بعد ازاں ان کے پردادا سید احسان علی نے دہلی کی برسوں کی سکونت ترک کر کے فیض آباد میں سکونت اختیار کی۔ صفی لکھنوی کے دادا سید سلطان حسین، سید حسین اور سید فضل حسین کے ہمراہ لکھنؤ آ گئے۔ سید فضل حسین ہی صفی کے والد تھے جو لکھنؤ میں سلیمان قدر کے ملازم ہوئے۔ ان کی پیدائش 3 جنوری 1862 کو لکھنؤ میں ہوئی۔ 5 سال کی عمر میں مکتب نشیں ہوئے اور مولوی نجم الدین کاکوروی سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولوی احمد علی محمد آبادی سے درسیات عربی اور فارسی کی تکمیل کی۔ امین آباد نائٹ اسکول اور کیننگ کالجیئیٹ کالج لکھنؤ سے انٹرنس انگریزی میں پڑھی اور اسی کالج میں انگریزی پڑھانے پر معمور ہو گئے۔ جون 1883 سے اودھ کے محکمہ دیوانی میں مستقل ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ صوبے کے مختلف مقامات میں مختلف عہدوں پر فائز رہ کر 1922 میں سبکدوشی حاصل کی۔ صفی لکھنوی کی وفات 15 جنوری 1950 میں ہوئی۔

صفی بڑے خوددار انسان تھے۔ جب تک بقید حیات رہے خودداری سے سمجھوتہ نہیں کی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا، تاہم کسی کی شاگردی قبول نہیں کی۔ انھوں نے غزل گوئی میں اعلیٰ مقام حاصل کیا، جس کی گونج اس عہد میں سنائی دیتی ہے۔ صفی کا سب سے بڑا کارنامہ لکھنؤ کی شاعری میں اصلاح اور ادب میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ صفی لکھنوی نے غزل کی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے اس میں ندرت اور وسعت پیدا کی۔ غزل میں نیا آہنگ اور نکھار صفی نے ہی روشناس کرایا۔

صفی اپنے عہد کے باکمال شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی رنگ نمایاں ہے۔ صفی کی شاعری میں عشقیہ مضامین رسمی نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک طرح کی بصیرت پائی جاتی ہے، جسے عارفانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک سنجیدہ کیفیت کا پتہ ملتا ہے جس میں تصوف کی آنچ بھی ہے۔ انھوں نے نظم نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔ طویل نظمیں لکھنے پر مہارت ہے۔ ان کی ایک نظم 'تنظیم الحیات' جو انگریزی سے ترجمہ ہے تیس اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کی نظموں میں حب الوطنی، ہندوستانی ثقافت و تہذیب کی خوبصورت پیش کش ملتی ہے۔

ان کی نظم نگاری کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ ممتاز حسن جونپوری کے اس اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

''ایک جلسے میں مرحوم نے جیسے ہی قومی ترانے کا مطلع پڑھا تو علامہ اقبال جو اس وقت جلسے میں موجود تھے جوش میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور جب تک صفی ترانہ پڑھتے رہے اقبال سر جھکائے کھڑے رہے۔ اس ترانے سے چند شعر یہ ہیں:

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے
مشرق کا سرا اٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے
دھارے میں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہے
بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے
ایران ہو یا ترکی دونوں کو مٹا دیکھیں
کیا صفحہ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے
اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

(کلاسیکی شعرا پر تنقیدی مقالات، ایم حبیب خاں، ص348)

بہرحال اردو ادب کے لیے اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ صفی لکھنوی جیسے شاعر نے اردو ادب کے شعر و سخن میں بلند پایہ شاعری کی، اردو صنف شعر میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ادب کے پارکھوں نے انھیں فراموش کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو جو شہرت حاصل ہونی چاہیے تھی اور ادب کی تاریخ میں آپ کو جو مقام ملنا چاہیے تھا وہ نہ مل سکا۔

صفی اتنے وضع دار تھے کہ انھوں نے اپنی حیات میں دیوان تک شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دوستوں کے اصرار پر بھی آمادہ نہیں ہوئے۔ لہٰذا ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں نے بھی باپ کی روایت کو قائم رکھا۔ البتہ مولانا صفی کے دوست ممتاز حسن جونپوری نے ان کے بیٹوں کے انتقال کے بعد اپنی بندوق بیچ کر صفی کا مجموعہ کلام چھپوایا اور دوستی کا حق ادا کیا۔

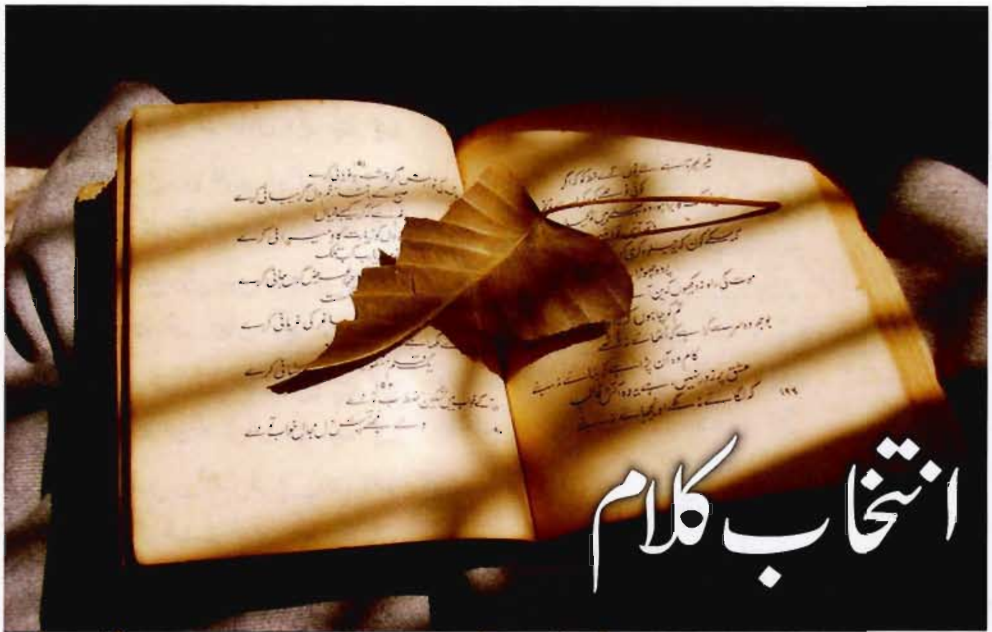

انتخاب کلام

صفی لکھنوی

غزل

دردِ آغازِ محبت کا اب انجام نہیں
زندگی کیا ہے اگر موت کا پیغام نہیں

کیجیے غور تو ہر لذتِ دنیا ہے فریب
کون دانہ ہے یہاں پر جو تہِ دام نہیں

ہے تنزل کہ زمانے نے ترقی کی ہے
کفر وہ کفر، اب اسلام وہ اسلام نہیں

کون آزاد نہیں حلقہ بگوشوں میں ترے
نقش، کس دل کے نگینے پہ ترا نام نہیں

نارسیدہ ہے ترا میوۂ جنت زاہد
پختہ مغزوں کو تلاشِ ثمرِ خام نہیں

یہی جنت ہے جو حاصل ہو سکونِ خاطر
اور دوزخ یہی دنیا، اگر آرام نہیں

شعرگوئی کے لیے بس وہی موزوں ہے صفی
جس کو جز فکرِ سخن اور کوئی کام نہیں

انسان کو اس نے خاک سے پاک کیا
ذی حوصلہ و صاحبِ ادراک کیا

پہلے تو بنایا اسے گنجینۂ علم
پھر گنج کو پوشیدہ تہِ خاک کیا

1909 کی شیعہ کانفرنس بمقام لکھنؤ میں پڑھی گئی نظم 'لختِ جگر' کے کچھ اشعار

1909 کے اجلاس سوم 'شیعہ کانفرنس' منعقدہ بمقام لکھنؤ سے نظم موسومہ 'لخت جگر' کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جس میں شیعہ کانفرنس کو دو سال کا بچہ قرار دے کر تعلیم کی طرف قوم کو توجہ دلائی ہے اور انھیں نظموں کے سلسلہ مابعد میں سب سے پہلے شیعہ کالج کی صدا اُس وقت بلند کی گئی۔ جب اِس کا کہیں اور چرچا نہ تھا:

لکھنؤ، اے مطلعِ نورِ ہدایت لکھنؤ — چاند کا ٹکڑا لیے ہے گود میں کیسا یہ تو
دوڑتا پھرتا ہے رگ رگ میں جو اسلامی لہو — دو برس کی جان اور اعضا میں یہ جوشِ نمو

کون کرتا ہے نگاہِ مہر پرور دیکھیے
کس کے پاس آتا ہے یہ بچہ ہمک کر دیکھیے

ہوتی ہے بچپن میں شیرینی سے رغبت بیشتر — پاگئے رمزِ طبیعت جب یہ اربابِ نظر
نفع کی اک چیز لاکر دی اسے یعنی شکر — جو ہیں دیکھا اس کے ہونٹوں پر تبسم کا اثر

آگیا جوش اہل ہمت کو خزانہ کھُل گیا
بات کہتے اک شکر کا کارخانہ کھل گیا

سرپرستی کو جب اس کی عالمانِ دیں اُٹھیں — والیانِ ملک و سردارانِ باتمکیں اٹھیں
گوشے گوشے سے سحر خیزان مہر آئیں اٹھیں — چھوڑ کر بیمار غم تک بستر و بالیں اٹھیں

پھر نہ کیوں پیارا ہو یہ آنکھوں کا تارا قوم کی
راحت دل زندگانی کا سہارا قوم کی

کس قیامت کا جو شیلا ہے یہ طفلِ خرد سال — گھٹنوں چلنے کے دن ہیں لیکن اس کا ہے یہ حال
ہر طرف چلنے کو ہے تیار ہنگام سوال — ہاتھوں ہاتھ اس کو لیے پھرتے ہیں ارباب کمال

کون سا دل ہے نہیں جس کی محبت جوش میں
آج اس آغوش میں ہے کل یہ اُن آغوش میں

سال آئندہ سنا جاتا ہے یہ حسب الطلب — لکھنؤ کی گود سے جائے گا امروہے تک اب
پھر وہاں سے دیکھیے جائے کہاں خواہاں ہیں سب — گھوم پھر کر لکھنؤ آئے گا کیا معلوم کب

یہ خوش و خرم رہے یارب جہاں چاہے رہے
شاد روز و شب رہے یہ اب جہاں چاہے رہے

کوئی آباد منزل ہم جو ویراں دیکھ لیتے ہیں
بہ حسرت سوئے چرخِ فتنہ ساماں دیکھ لیتے ہیں

نظر حسن آشنا ٹھہری، وہ خلوت ہو کہ جلوت ہو
جب آنکھیں بند کیں، تصویرِ جاناں دیکھ لیتے ہیں

خدا نے دی ہیں جن روشن دلوں کو دور بیں نظریں
سوادِ کفر میں وہ نورِ ایماں دیکھ لیتے ہیں

وہ خود سر سے قدم تک ڈوب جاتے ہیں پسینے میں
بھری محفل میں جو ان کو پشیماں دیکھ لیتے ہیں

ٹپک پڑتے ہیں آنکھوں سے شبنم کی طرح بے اختیار آنسو
چمن میں جب کبھی گلہائے خنداں دیکھ لیتے ہیں

صفی رہتے ہیں جان و دل فدا کرنے پہ آمادہ
مگر اُس وقت جب انسان کو انسان دیکھ لیتے ہیں

غم نقدِ حیات لوٹنے کو ہے
یہ رشتۂ عمر ٹوٹنے کو ہے
پیری میں کمر جھکی تو کیا دم کا قیام
اب تیر کماں سے چھوٹنے کو ہے

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

قفس لے اڑوں میں، ہوا اب جو سن کے
مدد اتنی اے بالِ پرواز دینا

نہ خاموش رہنا مرے ہم صفیرو
جب آواز دوں تم بھی آواز دینا

کوئی سیکھ لے دل کی بے تابیوں کو
ہر انجام میں رنگِ آغاز دینا

دلیلِ گراں باریِ سنگِ غم سے
صفی ٹوٹ کر دل کا آواز دینا

قوم کی ادنیٰ توجہ اس طرف درکار ہے
وہ روش پیدا کرے دنیا کی جو رفتار ہے
اکتساب علم و فن ہے خوبیِ کردار ہے
کیجیے اس نعمت سے کیوں پرہیز ہے کیوں عار ہے
منزلت قوموں میں کچھ یہ قوم اُس دن پائے گی
دولتِ تعلیم جس دن عام کردی جائے گی

صنعت و حرفت میں کچھ پیدا کرے یہ دستگاہ
جب کہیں شاید پڑے شائستہ قوموں کی نگاہ
چاہتے ہیں ہم جو بننا مرد میدانِ رفاہ
ٹھوکریں کھائیں نہ ان گلیو میں جو ہیں سدِّ راہ
رہبری کے واسطے علم و عمل کو ساتھ لیں
دولتِ دنیا کا اپنے ہاتھ میں پھر ہاتھ لیں

قوم کے افراد کو لازم ہے اس پر اتفاق
دل کے گلشن میں نہ رہنے دیں کہیں خارِ نفاق
ربط میں بھی اعتدال اتنا کہ جو گزرے نہ شاق
گرم جوشی سے نہ پیدا خون میں ہو احتراق
کمپنی قائم کریں یا انجمن قائم کریں
ہاں چلیں اُس رائے پر جو رائے زن قائم کریں

رہبر کامل کے ہاتھوں میں عنانِ قوم ہو
روز افزوں مجمع دانشورانِ قوم ہو
یہ ہم آہنگی الٰہی درمیانِ قوم ہو
جو زبان اک فرد کی ہو وہ زبانِ قوم ہو
تاظہور صاحب الامر اس کو ہو نشو و نما
بارور اہل تشیع کا یہ نخلِ مدعا

قوم کا نور نظر یہ قوم کا چشم و چراغ
جس کی صورت دیکھ کر ہے قوم کا دل باغ باغ
خود قیافہ یہ بتاتا ہے کہ ہے روشن دماغ
مغربی تعلیم سے بھی ہوگا جب حاصل فراغ
نیند سے غفلت کی ہم سب کو جگائے گا یہی
قوم کے دامن سے بس دھبا چھڑائے گا یہی

ہے صفی کی یہ دعا اے کردگار ذوالمنن
ہو جواں جلدی سے بڑھ کر یہ تہِ چرخِ کہن
لکھنؤ مولد ہے اس کا لکھنؤ اِس کا وطن
اور سارا ہند اس کی سیر کو صحنِ چمن
پھول برسیں رُخ جدھر ہو جلوہ آرائے بہار
جائے یہ سروِ خراماں جس طرف آئے بہار

لکھنؤ کا یہ جگر گوشہ، یہ طفلِ شیر خوار
جس کی پیشانی پہ لکھا ہے 'جوشیلا ہونہار
اور ہوجائے ذرا اے قوم بڑھ کر ہوشیار
دیکھنا ہوتا ہے کیا رعنا جوانِ شاندار
شہرۂ آفاق ہوگا حسن تا سنِ تمیز
تو سہی جو صورتِ یوسف نہ ہو ہر دل عزیز

زالِ دنیا اپنی آنکھوں سے لگائے گی رکاب
میرے یوسف کی دعا اس وقت ہوگی مستجاب
پیکر دولت میں پیدا ہوگا رنگِ انقلاب
قوم دیکھے گی زلیخا کی طرح عودِ شباب
پھر جو چمکے گا ستارہ قوم کے اقبال کا
ہوگا خواہش کے موافق زائچہ ہر سال کا

آسمانِ سرزمینِ لکھنؤ کا یہ ہلال
رفتہ رفتہ ایک دن پہنچے گا تا حدِ کمال
دیکھنا اُس وقت جذبِ پرتوِ نورِ جمال
قوم کو کھینچے گا سوے اوجِ تہذیب خیال
قوم کروٹ لے گی طاقتور سمندر کی طرح
چمکے گا اِس بحر کا ہر قطرہ اختر کی طرح

سختیاں جھیلی ہیں تونے جس کی خاطر لکھنؤ
مال کیا جس کے لیے ہے جان حاضر لکھنؤ
تجھ سے چھٹتا ہے وہ ننھا سا مسافر لکھنؤ
دیکھ لے حسرت کی نظروں سے ذرا پھر لکھنؤ
منھ سے پھر اک بار کہہ دے وقت رخصت الوداع
الوداع اے یادگارِ ملک و ملت الوداع

◘ ادارہ

مولانا محمد حسین آزاد

اردو زبان و ادب کے کلاسیکی دور میں جن نثر نگاروں نے اپنے اسلوب تحریر سے متاثر کیا ان میں ایک اہم نام مولانا محمد حسین آزاد کا بھی ہے جو اعلیٰ درجے کے نقاد، تذکرہ نویس، صحافی، شاعر اور انشا پرداز تھے۔ آب حیات، نیرنگ خیال اور دربار اکبری ان کی تحریر کی ہوئی وہ کتابیں ہیں جن کا حوالہ دیے بغیر اردو نثر کے ارتقا کی کوئی تاریخ مکمل نہیں کہی جاسکتی۔

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کے والد کا نام مولانا محمد باقر تھا جو شمالی ہند میں اپنی مضمون نویسی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ مولوی محمد باقر نے 1836 میں دہلی سے اردو کا پہلا اخبار 'اردو اخبار' کے نام سے نکالا تھا۔ وہ استاد ذوق کے دوست تھے اسی لیے آزاد نے شروع سے ذوق کی شاگردی اختیار کی۔ آزاد نے عربی، فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور دلی کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں پیارے لال آشوب، مولوی نذیر احمد، مولانا حالی، مولوی ذکاءاللہ وغیرہ ان کے ہم مکتب تھے۔

آزاد کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ جب ان کی عمر 27 یا 28 برس کی تھی تو والد مولوی محمد باقر 1857 کی پہلی جنگ آزادی میں شہید ہو گئے۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے والوں نے جب دہلی پر قبضہ کیا تو والد نے مغل بادشاہ کا ساتھ دیا تھا اور 'اردو اخبار' سلطنت مغلیہ کی حمایت کرتا تھا۔ چند ماہ بعد جب انگریزوں نے بغاوت کو ناکام بنا کر دہلی پر دوبارہ قبضہ کیا تو ہزاروں دوسرے لوگوں کے ساتھ انھوں نے مولوی باقر کو بھی بغاوت کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا تھا اور وہ اردو کے پہلے شہید صحافی قرار پائے۔ محمد حسین آزاد کو انگریزوں کے عتاب سے بچنے کے لیے دہلی سے نکلنا پڑا۔ پہلے وہ لکھنؤ پہنچے اور پھر لدھیانہ آئے۔ وہاں ارسطو جاہ مولوی رجب علی صاحب کے پریس میں پہلے کچھ دن تک کتابت کی اور بعد میں چار سال تک منیجر رہے۔ لدھیانہ سے لاہور آ کر ڈاک خانے میں پندرہ روپے ماہوار پر سررشتہ دار ہوئے۔ اُن دنوں میجر فلر محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے آزاد کی زباں دانی اور قابلیت علمی کو بہت پسند کیا اور ابتدائی درسی کتابیں لکھنے کو دیں۔ اسی زمانے میں لاہور یونیورسٹی مشرقی علوم کی ترویج کے لیے قائم ہوئی اور آزاد فارسی اور عربی کے پروفیسر ہو گئے اور وہیں سے پنشن پائی۔

1874 میں آزاد نے کرنل ہالرائڈ، ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ان کی سرپرستی میں نثر میں بھی مشاعرہ کی ابتدا کی جائے جس کا مقصد اردو شاعری کی مبالغہ آمیزی اور تصنع کو حقیقت اور اصلیت سے بدلنے کی ترغیب دینا تھا۔ اس مشاعرے میں بجائے مصرع طرح کے نیچرل مضامین دیے جاتے تھے۔ 1887 میں آزاد کو ملکہ وکٹوریہ کی حکومت نے ان کی تعلیمی اور ادبی خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں شمس العلما کا خطاب عطا کیا۔

تصانیف: فارسی ریڈریں 2 حصے، اردو ریڈریں 3 حصے، اردو کا قاعدہ، قواعد اردو، قصص ہند، جامع القواعد رسوم ہند، آب حیات، نیرنگِ خیال، نظم آزاد، قند پارسی، نصیحت کا کرن پھول، سخندانِ فارس، دیوان ذوق، دربار اکبری، نگارستان پارس، سپاک ونماک، جانورستان، فلسفۂ الٰہیات، مجموعہ مکتوبات وغیرہ

'آب حیات' آزاد کی بہترین تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ اس میں زبانِ اردو کی تاریخ اور مشہور شعرا کے حالات اور کلام کے نمونے ان پر دلچسپ اور فاضلانہ تنقیدیں شامل ہیں۔ دربار اکبری شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی شخصیت اور حالاتِ زندگی، نیز اس دور کے ہندوستان کی ثقافتی تصویر پیش کرنے والی نہایت اہم کتاب ہے۔ 'نیرنگ خیال' کو، جس کا وہ دوسرا حصہ بھی لکھنا چاہتے تھے ان کے نثری اسلوب کا سب سے عمدہ نمونہ مانا جاتا ہے۔

1887 میں انھوں نے 'آزاد لائبریری' قائم کی تھی جو دور دور تک مشہور ہوئی۔ انھوں نے 80 سال کی عمر پائی۔ آخری چند برسوں میں ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ اس کے علاوہ نجی زندگی میں پے در پے کئی ذہنی صدموں نے انھیں اور نڈھال کر دیا۔ آخر کار 1910 میں ان کا انتقال ہو گیا۔

◘

مولانا محمد حسین آزاد

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

انشائے آزاد کے نمونے کے طور پر یہاں ان کے مضامین کے مجموعے 'نیرنگ خیال' سے ایک تحریر پیش کی جارہی ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے یہ مضمون 1875 میں لکھنا شروع کیے تھے۔ ان میں سے بعض انجمن مفید عام قصور (ضلع لاہور) کے ماہانہ پرچے 'رسالہ' میں 1875 سے لے کر 1877 تک کے متفرق شماروں میں شائع ہوئے تھے۔ ان کا مجموعہ حصہ اوّل کی شکل میں 1880 میں شائع ہوا۔ آزاد کا ارادہ حصہ دوم بھی مرتب کرنے کا تھا۔ افسوس کہ وہ اسے مکمل نہیں کرسکے تھے کہ اختلالِ دماغ کے عارضے میں مبتلا ہوگئے اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

عہد قدیم کے مورخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانے میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لیے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ شہ سواری، تیراندازی اور راست بازی شہ سواری اور تیراندازی تو بے شک سہل آجاتی ہوگی، مگر کیا اچھی بات ہوتی اگر ہمیں معلوم ہوجاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیوزاد آکر ان کے دلوں پر شیشۂ جادو مارتا تھا، تو یہ اس چوٹ سے اُس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا بری جگہ ہے! چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں۔ جو اِس مشتِ خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جرم ہوجاتا ہے کہ اگر قبولے، تو مرنا پڑتا ہے؛ ناچار مکرنا پڑتا ہے، کبھی ابا فریبی کر کے جاہلوں کو پھنساتا ہے، جب لقمہ رزق کا پاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے، اور جزوی جزوی خطائیں ہوجاتی ہیں جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے راستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لیے سننے والے بھی ضرور ہیں، کیوں کہ خوشامد جس کی دکان میں آج موتی برس رہے ہیں، اُس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا اور کون ایسا ہے جو اس قید کا زنجیری نہیں۔ ڈرپوک بچارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔ تابعدار اُمید کا بھوکا آقا کو خوش کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ دوست محبت کا بندہ ہے۔ اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں، نہ ڈرپوک ہیں۔ انھیں باتوں باتوں میں خوش کرنے ہی کا شوق ہے۔ اسی طرح جب جلسوں میں نمودیے گدھوں کے دعوے بل ڈاگ[1] کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں، تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں کچھ امید، کچھ ڈر، کچھ مروت سے، غرض چار ناچار کبھی ان کے ساتھ ساتھ، کبھی پیچھے پیچھے؛ دوڑنا پڑتا ہے۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عملداری دور دور تک پھیل گئی ہے بلکہ جن صاحب تمیزوں کو قوتِ عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی اور خود اس مردار سے متنفر ہیں، وہ بھی اسی کے حامی ہوکر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔

سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے، مگر پھر بھی لوگ اُسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے چنانچہ جب کسی شے پر دل آتا ہے اور سچ اس کے برخلاف ہوتا ہے، تو اُس وقت سچ سے زیادہ کوئی برا نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں۔ جس چیز کو جی نہیں چاہتا، اس کا جاننا بھی نہیں چاہتے۔ جو بات پسند نہیں آتی، اس کا ذکر بھی نہیں سنتے، اس کان سنتے ہیں، اُس کان سے نکال دیتے ہیں۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں اور جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں، اسی طرح انواع و اقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کیں ہیں، تاکہ لوگ اُسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔

واضح ہو کہ ملکۂ صداقت زمانی، سلطانِ آسمانی کی بیٹی تھی، جو کہ ملکۂ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکۂ موصوفہ نے ہوش سنبھالا، تو اوّل تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کرلیا، تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدقِ دل سے تعریف کی۔ عزتِ دوام کا تاجِ مرصع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اولادِ آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالم سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفلۂ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اُسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی، مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے، تو

[1] ایک قسم کا شکاری کتا ہے، جسے ہندوستانی زبان میں گلڈانک کہتے ہیں۔

ان کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا اور بادشاہ کوایسا خوش کیا تھا کہ اُسے ملبوس خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر ومنزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعوے دار نئے ملک اورنئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اٹھے، تو چونکہ بزرگانِ آسمانی کو ان کی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی، سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں، اُن کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟

سچ کے زور وقوت کو کون نہیں جانتا۔ چنانچہ ملکۂ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے۔ اٹھی اوراپنے زور میں بھری ہوئی اٹھی؛ اسی واسطے بلند اٹھی۔ اکیلی آئی اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں، آگے آگے فتح واقبال نور کا غبار اڑاتے آتے تھے اور پیچھے پیچھے ادراک پری پرواز تھا مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے، شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی، اوردبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی، مگر استقلال کا رکاب پکڑے تھا اور جو قدم اٹھتا تھا، دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا، تو انسان کیا، فرشتہ سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔

دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا، ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سوانگ بھرتا تھا، تو وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کی ہوا وہوَس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لیے تھیں اور چوں کہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا، اسی لالچ کا مارا کمزور تابعداروں کی طرح اُن کے حکم اٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں اس کی بے معنی تھیں اور کام بھی اُلٹ پلٹ، بے اوسان تھے، کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتح یاب تو جلد ہو جاتا تھا، مگر تھم نہ سکتا تھا۔ ہوا وہوس اس کے یار وفادار تھے اور اگر کچھ تھے، تو وہی سنبھالتے رہتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آپڑتی تھی۔ اس وقت دروغ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لیے سر پر بادل کا دھواں دھار پگڑ لپیٹ لیتا تھا۔ لاف وگزاف کو حکم دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کردو۔ ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں طراری کی تلوار، بائیں ہاتھ میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی۔ غلط نما تیروں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا و ہوس دائیں بائیں دوڑتے پھرتے تھے۔ دل کی ہٹ دھری، بات کی پچ، پیچھے سے زور لگاتے تھے۔ غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا اور باوجود اس کے کہ ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دور دور سے لڑائی ہو۔ میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھاڑ کر دیتا تھا، مگر وہ بھی باد ہوائی، اٹکل پچو، بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھیرتا تھا۔ دم بدم جگہ بدلتا تھا، کیونکہ حق کی کمان سے جب تیر نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا، تو جھٹ تاڑ جاتا تھا۔ ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک بجلی کی تلوار نہ تھی، مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا اور رعبِ خداداد کا خود سر پر دھرا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتح یاب ہوتی تھی، تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک،

مولوی محمد حسین آزاد کی مشہور نظم

اولوالعزمی کے لیے کوئی سدِّ راہ نہیں

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو — باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو — ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن — دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین ونسترن
نہریں اِدھراُدھر ہیں امیدوں کی موجزن — اس دشت میں نہ دوڑ سکو بن کے گر ہرن
کبکِ دری کی طرح خراماں چلے چلو

آؤ کہ کھولے اپنے نشاں ننگ و نام نے — باندھی کمر ہے کس کے ہر اک شاد کام نے
کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے تھامنے — دیوارِ باغ وہ نظر آتی ہے سامنے
سروِ سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو

یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم — کرتے ہو کیا امید یمین و یسار تم
میدانِ عزم و جزم کے ہو شہ سوار تم — بڑھ جاؤ گے کروگے اگر مار مار تم
چلاّ رہی ہے ہمتِ مرداں چلے چلو

ہمت کے شہ سوار جو گھوڑے اٹھائیں گے — دشمن فلک بھی ہوں گے تو سر کو جھکائیں گے
طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں گے — نیکی کے زور اٹھ کے بدی کو دبائیں گے
بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں چلے چلو

آئینہ دل کا گردِ سفر سے اجال دو — پوچھے کوئی ارداہ کدھر ہے تو ٹال دو
شیطاں جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو — ہو خوف کا خیال تو بزدل پہ ڈال دو
اور آپ بن کے شیرِ نیستاں چلے چلو

رکھو رفاہِ قوم پہ اپنا مدار تم — اور ہو کبھی صلے کے نہ امیدوار تم
عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم — دو رُخ کو آبِ فخر سے رنگِ بہار تم
گلشن میں ہو کے بادِ بہاراں چلے چلو

آؤ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے — چمکایا چہرہ صبح نے با آب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتحیاب ہے — اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتابِ درخشاں چلے چلو

نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے — اب خاتموں پہ آگئے ہیں ان کے فیصلے
قسمت کے یہ نوشتے نہیں جو نہ مٹ سکے — وہ گونجا طبلِ فتح کہ میدان لے لیے
ہے کترنائے جنگ کی الحاں چلے چلو

بے حیائی کی ڈھال منھ پر لے، ہوا و ہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشانِ لشکر گر پڑتا تھا اور لوگ پھریرا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔

ملکہ صداقت زمانی کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی مگر سانچ کو آنچ نہیں، زخم جلد بھر آتے تھے اور وہ جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تھا، تو ایسے سڑتے تھے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آن کودا۔

دروغ دیوزاد نے تھوڑے ہی تجربے میں معلوم کرلیا تھا کہ بڑائی اور دانائی کا پردہ اسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھیروں۔ اس لیے دھوکہ بازی اور شبہ کاری کو حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لیے ایک سڑک تیار کرو۔[1] مگر اس طرح کے اینچ پینچ اور ہیر پھیر دے کر بناؤ کہ شاہراہِ صداقت جو خطِ مستقیم میں ہے، اس سے کہیں نہ ٹکرائے۔ چنانچہ جب اُس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا تو اسی رستے سے جدھر چاہتا تھا نکل جاتا تھا اور جدھر سے چاہتا تھا پھر آن موجود ہوتا تھا۔

ان رستوں سے اُس نے ساری دنیا پر حملے کرنا شروع کردیے اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر دروغ شاہ دیوزاد کا لقب اختیار کیا۔ جہاں جہاں فتح پاتا تھا، ہوا و ہوس کو اپنا نائب چھوڑتا اور آپ فوراً کھسک جاتا۔ وہ اس فرماں روائی سے بہت خوش ہوتے تھے اور جب ملکہ کا لشکر آتا تھا تو بڑی گھاتوں سے مقابلے کرتے تھے۔ جھوٹی قسموں کی ایک لمبی زنجیر بنائی تھی۔ سب اپنی کمریں اس سے جکڑ لیتے تھے کہ ہرگز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پانو کہاں؟ لڑتے تھے اور متابعت کرکے ہٹتے تھے۔ پھر اِدھر ملکہ نے منہ پھیرا، اُدھر باغی ہوگئے۔ ملکہ جب آسمان سے نازل ہوئی تھی، تو سمجھتی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے خوش ہوں گے۔ جو بات سنیں گے، اُسے مانیں گے اور حکومت میری تمام عالم میں پھیل کر مستقل ہوجائے گی۔ مگر یہاں دیکھا کہ گزارہ بھی مشکل ہے۔ لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں اور ہوا و ہوس کے غلام ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ ملکہ کی حکومت آگے بڑھتی تھی مگر بہت تھوڑی تھوڑی۔ اس پر بھی یہ دشواری تھی کہ ذرا اس طرف ہٹی اور پھر بدعملی ہوگئی کیونکہ ہوا و ہوس جھٹ بغاوت کا نقارہ بجا، دشمن کے زیرِ علم جا موجود ہوتے تھے۔ ہر چند ملکہ صداقت زمانی ان باتوں سے کچھ دبتی نہ تھی کیونکہ اس کا زور کسی کے بس کا نہ تھا، مگر جب بار بار ایسے پاجی کمینے کو اپنے مقابلے پر دیکھتی تھی اور اس میں سوا مکر و فریب اور کمزوری و بے ہمتی کے اصالت اور شجاعت کا نام نہ پاتی تھی، تو گھٹتی تھی اور دل میں پیچ و تاب کھاتی تھی۔ جب سب طرح سے ناامید ہوئی، تو غصہ ہوکر اپنے باپ سلطان آسمانی کو لکھا کہ آپ مجھے اپنے پاس بلا لیجیے۔ دنیا کے لوگ اس شیطان کے تابع ہوکر جن بلاؤں میں خوش ہیں، ان ہی میں رہا کریں، اپنے کیے کی سزا آپ پالیں گے۔ سلطان آسمانی اگرچہ اس عرض کو پڑھ کر بہت خفا ہوا، مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا اور سمجھا کہ اگر سچ کا قدم دنیا سے اٹھا تو جہان اندھیرا اور

اس میں شک نہیں کہ دنیا بری جگہ ہے! چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں۔ جو اس مشت خاک کو اس دیوآتش زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جرم ہوجاتا ہے کہ اگر قبولے، تو مرنا پڑتا ہے؛ ناچار مُکرنا پڑتا ہے، کبھی ابافریبی کرکے جاہلوں کو پھنساتا ہے۔ جب لقمہ رزق کا پاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے، اور جزوی جزوی خطائیں ہوجاتی ہیں جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے راستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں۔

تمام عالم تہ و بالا ہوجائے گا۔ چنانچہ اس خیال سے اس کی عرض نامنظور کی۔ ساتھ اس کے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بداصلوں کے ہاتھوں یوں مصیبت میں گرفتار رہے۔ اُسی وقت عالم بالا کے پاک نہادوں کو جمع کرکے ایک انجمن منعقد کی۔ اُس میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے:

(1) کیا سبب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرماں فرمائی دنیا میں ہر دل عزیز نہیں۔

(2) کیا تدبیر ہے جس سے اس کے آمینِ حکومت کو جلد اہلِ عالم میں رسائی ہو اور اسے بھی ان تکلیفوں سے رہائی ہو۔

کمیٹی میں یہ بات کھلی کہ درحقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے اور کارروائی میں تلخی ہے۔ صدرِ انجمن نے اتفاق رائے کرکے اس قدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیقت کے دعووں کا دھواں اس قدر بھرا ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر کامیابی چاہتی ہیں، جس کا زور طبیعتوں کو سخت اور دھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات لوگوں کو اس کی راستی سے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں۔ کبھی ایسے فساد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کا سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دوراندیشی اور صلاح وقت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ پس اُسے چاہیے کہ جس طرح ہوسکے، اپنی سختی اور تلخی کی اصلاح کرے۔ جب تک یہ نہ ہوگا لوگ اُس کی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کریں گے۔ کیونکہ دیو دروغ کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اس کے خلاف ہے۔ اوّل تو اس میں فارغ البالی بہت ہے اور جو لوگ اس کی رعایا میں داخل ہوجاتے ہیں۔ انھیں سوا عیش و آرام کے دنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ خود بہروپیہ ہے۔ جو صورت سب کو بھائے، وہی روپ بھر لیتا ہے اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہنے رہتا ہے۔ غرض اہل انجمن نے صلاح کرکے ملکہ کی طرزِ لباس بدلنے کی تجویز کی۔ چنانچہ ایک ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا، جیسا کہ جھوٹ پہنتا تھا اور وہ پہن کر لوگوں کو جل دیا کرتا تھا۔ اس جامہ کا مصلحتِ زمانہ نام ہوا چنانچہ اس خلعت کو زیب بدن کرکے ملکہ پھر ملک گیری کو اٹھی۔ جس ملک میں پہنچتی اور آگے کو راستہ مانگتی، ہوا و ہوس حاکم وہاں کے اس دروغ شاہ دیوزاد سمجھ کر آتے اور شہر کی کنجیاں نذر گزرانتے۔ اِدھر اُس کا دخل ہوا، اُدھر ادراک آیا اور جھٹ وہ جامہ اتار لیا۔ جامہ کے اترتے ہی اس کی اصل روشنی اور ذاتی حسن و جمال پھر چمک کر نکل آیا۔ چنانچہ اب یہی وقت آگیا ہے، یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیزی کرکے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لیے مضر سمجھنے لگے ہیں۔ اگر سچ کہیں پہنچ کر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہے، تو پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق کے کپڑے مانگ تانگ کر لاتا ہے۔ جب تبدیل لباس کرکے وہاں جا پہنچتا ہے، تو وہ لفافہ اتار کر پھینک دیتا ہے۔ پھر اپنا اصل نور پھیلاتا ہے کہ جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے۔

□

ماخذ: نیرنگ خیال، (اوّل و دوم): شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد مرحوم ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

1۔ جب جھوٹ کی قلعی کھلنے لگتی ہے، تو جھوٹا آدمی ایسی باتیں پیش کرتا ہے جس سے لوگ شبہ اور شک میں پڑ جائیں اور سمجھیں کہ ہو تو سکتا ہے، شاید جو یہ کہتا ہے وہی سچ ہو۔

مخمور اکبرآبادی

بحیثیت محقق و مصنف

سید اختیار جعفری

سید محمد محمود مخمور اکبرآبادی آگرے میں اپنے آبائی مکان (کٹراہادی حسن) میں 4 فروری 1894 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید محمد علی صاحب آگرے کی دیوانی عدالت میں منصرم تھے، بعد کو شاید ناظم ہوگئے تھے۔ محمود 14 سال کے تھے، جب مفید عام ہائی اسکول سے دسویں کی سند لی۔ تعلیم کے دوران بہت ممتاز رہے۔ آگرہ کالج سے ایل ایل بی کرکے وکالت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ 18 سال تک آگرے میں وکالت کرتے رہے۔ اسی دوران حکومت نے آگرہ یونیورسٹی کی سینٹ کا رکن نامزد کیا اور 12 برس تک اس عہدے پر فائز رہے۔

دوسری عالمی جنگ (1953-1939) کے دوران حکومت ہند نے انھیں آل انڈیا ریڈیو میں مترجم مقرر کردیا، اور وہ ڈھاکہ کے دفتر میں (جاپانی محاذ پر) متعین ہوگئے۔ جب ملک آزاد ہوا تو وہ پاکستان میں ہی رہ گئے اور اس کے بعد بھی بہت دن تک ریڈیو پاکستان میں ملازم رہے؛ اس طرح انھیں مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) میں طویل قیام کا اتفاق ہوا۔ جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو اپنے اکلوتے بیٹے سید حسن محمود رضوی (سابق ڈپٹی کلکٹر سینئر اکسائز کسٹمز، پاکستان) کے پاس کراچی میں رہنے لگے۔ غالباً بعد کو ان سے کچھ اختلاف ہوگیا اور انھیں گھر چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد بہت ہی عسرت سے بسر ہونے لگی۔ بالآخر کراچی سے نقل مکان کرکے اپنے بھانجے سید علی مظاہر جعفری ایڈوکیٹ، خیرپور میر کے ہاں چلے گئے۔ وہیں بروز جمعہ 16 اپریل 1986 صبح پانچ بجے ان کا انتقال ہوا؛ اور شیعوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

مخمور کو لکھنے پڑھنے کا شوق طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ خان بہادر سید آل نبی مرحوم آپ کے جدِ اعلیٰ تھے۔ ان کے نانا مولوی سید محمد تنزیہ الفرقان کے مصنف تھے۔ نیاز فتح پوری نے جن احباب کے تعاون سے 1922 میں نگار جاری کیا تھا، انھوں نے ان کو 'یارانِ نجد' کا نام دیا تھا؛ مخمور بھی ان میں شامل تھے اور غالباً اس گروہ میں سب سے کم عمر تھے۔

جیسا کہ معلوم ہے، نگار جب شروع ہوا، تو نیاز اس زمانے میں ریاست بھوپال میں ملازم تھے، وہ پرچہ وہاں سے بھیج دیا کرتے اور اس کی کتابت وطباعت کے جملہ مراحل طے ہوجانے کے بعد یہ آگرے ہی سے خریداروں کو بھیجا جاتا تھا۔ مخمور اس سے پہلے 'نقاد' (آگرہ) کے مستقل معاونوں میں رہ چکے تھے، اور اس کے دونوں دوروں میں ان کی نظمیں شائع ہوتی رہی تھیں۔ اب وہ نیاز کے دست راست ثابت ہوئے۔ اس زمانے میں وہ نگار کے لیے فوائد علمیہ کی ذیل میں چھوٹے چھوٹے شذرات لکھا کرتے تھے۔ چندے تسنیم (ماہنامہ) کی ادارت سے بھی منسلک رہے۔

مخمور پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اردو فارسی اور انگریزی زبانوں پر یکساں عبور تھا۔ مخمور کی زیادہ تر کتابیں اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل رہیں۔ میکش کے یہاں اکثر ان کی صحبتیں فانی، جوش اور ل احمد وغیرہ سے رہا کرتی تھیں۔ میکش اس کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''مخمور صاحب ایک عالم اور ذہین انسان ہیں۔ آگرے کی نفاست شرافت اور علمی تہذیب کا نمونہ ان کی ذات ہے۔ جب ہمارے ساتھ فانی، ل احمد، جوش اور مخمور صاحب بیٹھا کرتے تھے اس وقت ان کی ذہانت اور علم کے جوہر کھلتے تھے۔''

مخمور صاحب آگرہ سے بنگلہ دیش ہوتے ہوئے پاکستان چلے گئے۔ وہاں بھی میکش کی یاد ان کو ستاتی رہی اور اپنی عقیدت و محبت کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا:

''جناب میکش مفروضۂ ازلی سے مجھے میر و غالب کی صحبت میں فروکش نظر آتے ہیں۔ ان کا حضورِ قلب، ان کا سکونِ نفس ان کا ذوق وشوق نظر اور ان کا تغزل معیاری و یادگاری اجزائے شاعری ہیں۔ فانی کی طرح ان کا کلام تالم و تفلسف کا امتزاج ہے اور بے شبہ قنوطیت سے یک قلم معریٰ ہے۔''

مخمور تسنیم اور نگار رسائل میں شریک ادارت رہے۔ بلند پایہ نثر نگار ہونے کے علاوہ آپ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ شاعری میں رومانی طرزِ فکر ان پر غالب رہتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں۔ نظم میں بھی ان کا رومانی انداز برقرار ہے۔ ان کے کلام میں شگفتگی، نفاست اور سلاست پائی جاتی ہے۔ اپنی تحقیقی اور ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے شاعری کی طرف کما حقہ توجہ نہیں دے سکے ورنہ آج شاعری کے آسمان پر آفتاب یا ماہتاب بن کر چمکتے۔ موجودہ نظم نگاری میں مخمور بلا جھجک ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ جذباتی نظموں کا انھیں رہنما کہا جاسکتا ہے۔ ان سے پہلے ایسی نظمیں لکھنے کا رواج بہت کم تھا۔ غزلیں بہت کم کہتے تھے مگر بہت فطری ہوا کرتی تھیں۔ مخمور نے پاکستان جانے کے بعد بھی بہت کچھ لکھا اور ان کی زیادہ تر کتابیں شائع بھی ہوئیں۔

ان کی سب سے پہلی کتاب 'روحِ نظیر' ہے، جو 1942 میں شائع ہوئی تھی۔ (دوسرا ایڈیشن 1949)۔ وفات سے پہلے انھوں نے اس پر نظرِ ثانی کی تھی۔ مسودہ ان کے صاحبزادے کے پاس کراچی میں ہے۔ (2) ایک اور کتاب آلام حیات (تراجم اور افسانے) بھی اسی زمانے میں تصنیف کیے۔ اسی دور میں (3) تاریخ انگلستان، (4) شمیم اردو، (5) نگارِ اردو، (6) بوستانِ ادب (7) جواہر نثر، (8) سلکِ نظم (9) 'دنیا کے آبشار' بھی شائع کیں؛ یہ سب طلبا کی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر تالیف کی گئی تھیں، (10) اردو زبان اور اسالیب (کراچی، 1961) اس میں اردو کے الفاظ، مرکباتِ محاورات کے استعمال پر بحث کی ہے۔ (11) مشرقِ تاباں (کراچی)، 1967) اس مختصر مجموعے میں مشرقی پاکستان سے متعلق کچھ نظمیں ہیں (12) سرو و صنوبر (کراچی، 1971) غالب کے بارے میں مقالات کا مجموعہ (13) فانی: شخصیت اور حسن بیان (کراچی، 1971)، (14) قاموس الفصاحت (کراچی، 1973) مقدمے میں اردو زبان کی بعض خصوصیات پر روشنی ڈالنے کے بعد اس کی کہاوتیں، محاورے، روزمرہ، غیر مانوس الفاظ، تراکیب وغیرہ جمع کی ہیں۔ غیر مطبوعہ ذخیرے میں ان کی ایک معرکے کی کتاب 'غالب کی فطنیت اور صناعت' ہے؛ اس میں کوئی 2000 صفحات ہوں گے۔ اس کے (22) ابواب میں سے صرف

تین 'قومی زبان' اور 'اردو' میں شائع ہوئے تھے۔ انھوں نے اس کی فہرست مضامین کی نقل مالک رام صاحب کو بھیجی تھی۔ ان کی سب سے اہم 2 ادبی کتابیں 'روحِ نظیر' اور 'صحیفۂ اردو' ہیں۔

ریاضِ نثر: سید محمد محمود رضوی مخمور اکبرآبادی نے دی ایجوکیشنل پریس آگرہ سے 1966 میں یہ کتاب شائع کرائی۔ صفحات کی تعداد 200 ہے۔ اس کتاب کی طباعت باہتمام خواجہ فراست حسین منیجر نے اپنے آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ میں کرائی۔ کتاب طالب علموں کے لیے اردو کے اہم نثرپاروں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس درجہ کے لیے ہے۔ کتاب میں مشاہیر اردو غالب، سرسید، محمد حسین آزاد، حالی، نذیر احمد، محسن الملک، چراغ علی، شبلی، شرر، سرشار، مخمور اکبرآبادی اور محمد علی طبیب کے مضامین شامل ہیں۔ مخمور کا مضمون نظیر اور انسان کتاب میں شامل ہے۔

جواہراتِ نثر: میں مخمور نے میر امن سے لے کر موجودہ زمانے تک اردو زبان کے بہترین انشاپردازوں کی نثر کے نمونے جمع کیے ہیں۔ یہ کتاب رام پرشاد اینڈ برادرس کتب فروش آگرہ نے شائع کی۔ دیباچے سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب 27 اگست 1928 سے قبل مرتب ہوگئی تھی اور اس کے فوراً بعد چھپی ہے۔

مخمور اکبرآبادی نے ایچ اے اوور اسٹریٹ کی کتاب کا ترجمہ 'عقلِ سلیم' کے نام سے کیا۔ یہ کتاب پاک امریکن کمرشل انکارپوریشن لاہور نے مطبع فیروز سنس لاہور سے 1955 میں طبع کرا کے شائع کی۔ صفحات کی تعداد 167 ہے۔ اس کتاب میں عقلِ سلیم کی تعریف کی گئی ہے، اس کی اہمیت اور کیفیت کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقیِ اردو پاکستان کراچی کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے۔

مخمور اکبرآبادی کی کتاب تاریخ اور تنقیدی ادب میں ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں مخمور نے کئی مشہور تصانیف کی زبان، انداز بیان، اور حقائق پر تاریخی حوالوں اور تنقیدی و لسانی اعتبار سے گفتگو کی ہے۔ کتاب میں اردو زبان کے آغاز کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

کتاب میں رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو، مولانا عبدالسلام ندوی کی شعرالہند، مولوی عبدالحئ کی گل رعنا، سید اعجاز حسین کی مختصر تاریخ ادب اردو، خواجہ نصیر حسین خاں خیال کی داستان اردو، آغا محمد باقر کی تاریخ نظم و نثر اردو وغیرہ پر تنقیدی نظر ڈال کر ان کی زبان و بیان کی غلطیاں اور تاریخی کوائف و شواہد میں افسوسناک ٹھوکریں کھانے پر سخت گفتگو کی گئی ہے۔ سکسینہ اور اعجاز حسین پر عجلت اور جان بوجھ کر غلط بیانی کا الزام بھی رکھا گیا ہے۔ یہ مقدمہ 86 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ان کتابوں کی ہر ہر سطر اور ہر ہر بیان کا تنقیدی و تحقیقی محاکمہ کیا گیا ہے۔

مقدمے کے بعد اصل کتاب کا پہلا عنوان 'خلقت وارتقا' ہے۔ اس باب میں مخمور اکبرآبادی نے اردو زبان کی پیدائش کے اسباب، محرکات، اردو کے اداروں کا تاریخی و لسانی جائزہ لیا ہے۔ مختلف بادشاہوں، سلاطین، مغل لکھنؤ، دکن، اکبرآباد، رامپور وغیرہ میں اردو کی پیدائش وارتقا اور اردو اداروں کے قیام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مخمور اکبرآبادی کی تاریخی دقتِ نظر اور وسیع ادبی مطالعہ کا یہ کتاب بہترین مظہر ہے۔ لائبریری سائز کی یہ کتاب 1946 میں گیا پرشاد اینڈ سنز آگرہ نے شائع کی۔ اس کی طبات آرمی پریس دہلی میں ہوئی۔ صفحات کی تعداد 356 ہے۔ یہ کتاب رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔

اس صحیفے میں صرف ان اربابِ ادب کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے کسی نہ کسی عنوان سے اردو ادب کی ترقی میں باقاعدہ حصہ لیا ہے۔

یہ کتاب 1943 میں چھپنا شروع ہوئی تھی مگر نوع بہ نوع دشواریوں کی وجہ سے، اس کی طباعت میں لگاتار تاخیر ہوتی رہی۔ بعد میں احباب و شائقین کے تقاضوں سے مجبور ہوکر نامکمل حالت میں شائع کی گئی۔ حالانکہ مصنف کا خیال اسے مزید وقیع بنانا تھا لیکن موجودہ شکل میں بھی کتاب میں تمام ضروری موضوعات موجود ہیں اور تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

روحِ نظیر مخمور اکبرآبادی کے شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اسے نظیریات پر اہم ترین ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1922 میں آگرہ برقی پریس آگرہ میں طبع ہوا اور آگرہ کے ہی گیا پرشاد اینڈ پبلشرز نے اسے شائع کیا۔ اس میں کل 568 صفحات ہیں۔ اس کا پہلا دیباچہ جون 1922 میں لکھا گیا تھا۔ جب کہ دوسرا دیباچہ مئی 1996 میں لکھا گیا۔ میرے سامنے یہی دوسرا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر 4 حصوں مقدمہ، حصہ نظم، حصہ غزلیات اور فرہنگ و حواشی و اشاریہ میں منقسم ہے۔

پروفیسر عبدالغفور شہباز کی زندگانی بےنظیر کے بعد روحِ نظیر، نظیر اکبرآبادی پر سب سے اہم تصنیف ہے۔ طبع دوم کے دیباچے میں مخمور نے وضاحت کی ہے کہ پہلی اشاعت صرف چالیس نظموں پر مشتمل تھی۔ اس کی انتالیسویں نظم جو حافظ کی ایک غزل کی تضمین ہے، اس مرتبہ حذف کر کے گیارہ مزید نظمیں اضافہ کردی گئی ہیں۔ گویا اس دوسرے ایڈیشن میں نظیر کی 50 نظمیں شامل ہیں۔ اس دیباچہ میں مخمور نے کچھ عرصہ قبل انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع شدہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مرتبہ مجموعۂ غزلیات پر درجن بھر اعتراضات کیے ہیں اور ان کے مجموعے کو تحقیق و تنقید اور طباعت کے لحاظ سے نہایت کم تر بتایا ہے۔ آخر میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ نظیر کو سمجھنے کے لیے مزید گہری نظر اور تنقیدی بصیرت درکار ہے۔ اسی لیے انھوں نے صاحب آب حیات مولانا محمد حسین آزاد پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے محض سنی سنائی باتوں پر اعتماد کر کے نظیر کو آبِ حیات میں شامل نہیں کیا۔ اس سے نظیر کی عظمت کم نہ ہوئی بلکہ آزاد کی ہی سخن فہمی، تنقیدی بصیرت اور تحقیقی مزاج پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔

مخمور نے مقدمے میں جس چیز کو اولیت دی ہے وہ ان کا گوشۂ گم نامی میں پڑا رہنا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے مورخین، تذکرہ نگاروں اور تنقید نگاروں کو موردِ الزام قرار دیا ہے۔ وہ نظیر کے اختصاص سے عصری عدم توجہی کا گلہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اتنا ضرور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ گزشتہ ساٹھ ستر برس کی مدت میں جیسا روح فرسا اور جوہر کش برتاؤ ان کے ساتھ کیا گیا اس سے بدر جہا بہتر قدر دانی غالباً ان کی حیات میں ہوئی ہوگی لیکن اس پر بھی بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ نظیر فی الحقیقت جس قدر دانی کے مستحق تھے اتنی قدر ان کی حیات میں بھی نہیں ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ روحِ نظیر میں انھوں نے سوانح، ان کی علمیت، ان کے نظریۂ زندگی، جہانِ شاعری، عوامی زندگی، بول چال، 8 زبانوں پنجابی، پوربی، مارواڑی، ہندی، اردو اور برج بھاشا پر عبور، فارسی و عربی میں دست گاہ، نظیر کے آرٹ، غزل کے مقابلے نظم کو اہمیت دینے کے اسباب، خالص ہندوستانی شاعری، مشرقی و مغربی نظریۂ شاعری پر ان کے کھرا اترنے، اخلاقی پہلو، فطرت نگاری، مقامی آہنگ، تمثیل نگاری، لسانی اجتہاد، زبان پر ان کے احسانات، قومی شاعری، متروکات و معائب، آزادانہ رنگ، تخیل کی فراوانی، عروض، فحشیات اور مکمل شاعری پر تنقیدی تبصرہ جیسے موضوعات پر بالکل نئی روشنی ڈالی ہے۔

(سبدِ گل از امام اکبرآبادی، تذکرۂ معاصرین از مالک رام، تصنیفات، مصنف: روحِ نظیر، صحیفۂ تاریخ اردو، عقل سلیم، مجموعۂ شاعری)

■

Dr. Syed Ikhtiyar Jafri, (Rashtriya Sahara)
18/147, A-26, Khairadi Tola, Tajganj Road,
Agra- 282001 (U.P.)

نظریۂ ارتقائے حیات کا تاریخی پسِ منظر

▪ افتخار عالم خاں

آج شاید ہی کوئی علم حیاتیات کا ذی ہوش ماہر ایسا ہوگا جو جانداروں کی مختلف اقسام کے وجود میں آنے کے بارے میں نظریۂ ارتقا کا حامی نہ ہو۔ یہ بات کہ کسی دور کے جاندار اپنے سے پہلے ادوار میں موجود جانداروں کی اقسام کی ارتقائی اشکال پیش کرتے ہیں آج کسی شک وشبہ کے بغیر مانی جاتی ہے کیونکہ اس نظریے کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے آج اتنی ٹھوس شہادتیں موجود ہیں کہ اس سے انحراف تقریباً ناممکن ہے بلکہ اب تو اس نظریے کو تجربات کی روشنی میں تجربہ گاہوں میں پرکھا اور ثابت کیا جاسکتا ہے۔

لیکن آج سے سوڈیڑھ سوسال پہلے تک اسی بات کو کہنے کے لیے کسی شخص کو خاصی ہمت اور جرأت سے کام لینا پڑتا تھا اور شاید تین چار سوسال پہلے تو ہمت اور جرأت کرنے کے باوجود کوئی شخص اِن مسائل پر زبان کھولنا تو درکنار سوچنے کو بھی تیار نہ ہوتا۔

انسان کے ذہن میں اپنے وجود کے بارے میں اکثر سوالات اٹھتے رہے ہوں گے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دوسرے تمام جانداروں کے وجود میں آنے کے بارے میں سوچتا رہا ہوگا۔ اپنی ذہنی تشفی کے لیے وہ مسلسل ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی سعیِ پیہم کرتا رہا ہوگا جو وقتاً فوقتاً اس کے ذہن میں اٹھتے رہے ہوں گے جس کے نتیجے میں وہ مختلف نظریات بناتا اور رد کرتا رہا ہوگا۔ آج ان میں سے بہت سے نظریات ہمارے سامنے موجود ہیں جو اکثر ناسمجھی کی حد تک سادہ معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ابتدائی ادوار کے یہ نظریات عام طور پر ٹھوس عملی شہادتوں پر مبنی نہیں تھے۔

چھٹی سے چوتھی قبل مسیح تک تھیلس (Thales) انا کزیمانڈر (Anaximander) ایمپی ڈوکلس (Empedocles) اور ارسطو (Aristotle) جیسے فلسفیوں نے اپنے اپنے طور پر اُس وقت کے مخصوص فلسفیانہ انداز میں کسی نہ کسی حد تک ان امکانات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی تھی کہ تمام جاندار ایک دوسرے سے قطعی غیر متعلق نہیں ہیں بلکہ کسی نہ کسی طرح کی نسبت ان کے درمیان موجود ہے۔

تھیلس (Thales 640-548 B.C) وہ پہلا یونانی فلسفی تھا جو اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ زندگی کی ابتدا پانی میں ہوئی ہے اور دوسرے تمام جاندار پانی میں پائے جانے والے جانداروں سے نکلے ہیں۔ ارسطو (322-384 ق م) نے علم الحیوانات کے سلسلے میں جو بھی قلیل علمی بصیرت اس کے دور میں موجود تھی اسے ایک مخصوص ترتیب دی اور تمام جانداروں کی ان کے جسم کی بناوٹ یا تشریحی ہیئت (Anatomy) کی بنیاد پر درجہ بندی (Classification) کی جو بذاتِ خود اس بات کی غماز تھی کہ مختلف انواع کے جاندار ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ لیکن ان فلسفیوں کے ارتقائے حیات سے متعلق ابتدائی نظریات کو آئندہ کئی صدیوں تک نہ تو مقبولیت حاصل ہوسکی اور نہ ہی کوئی معنویت۔

اس کے برخلاف مسیحی نقطۂ نظر کے عام ہونے کے بعد کلیسا اور کٹر مذہبیت کے زیرِ اثر نظریۂ ارتقا کے سلسلے میں کوئی تحقیق کرنا تو درکنار اس طرح کے نظریات کی حمایت میں زبان کھولنا بھی تقریباً ناممکن ہوگیا اور پھر سیکڑوں سالوں تک یہ تصور یقین کی صورت رائج رہا کہ اس دنیا میں پائے جانے والے سارے جاندار جس صورت میں وجود میں آئے تھے اُسی صورت میں شروع سے اب تک موجود ہیں۔ اس طرح کے خیالات الٰہی تخلیق (Devine Creation) اور غیر متحیرالاقسام الحیوانات (Immutalitity of Species) کے نظریات پر مبنی تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان سیکڑوں سالوں میں حقیقتیں سامنے نہ آئی ہوں اور انسانی ذہن کی اُپج نے کلیسا اور پادریت کے کٹرپن کو چنوتی نہ دی ہو۔

علمِ طبقات الارض (Geolagy) کے ماہرین پتھروں اور چٹانوں میں پائے جانے والے جانوروں اور پیڑ پودوں کے باقیات دیکھ کر ششدر رہ جاتے تھے۔ ان جانداروں کے باقیات کو انگریزی میں (Fossils) کہتے ہیں اور جو لاکھوں کی تعداد میں ملتے ہیں۔ یہ ہی نہیں اکثر سمندروں میں پائے جانے والے جانداروں جیسے گھونگھوں، سیپیوں، مچھلیوں وغیرہ کے باقیات پہاڑوں کی چوٹیوں پر موجود چٹانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے سوال اٹھا کہ کس طرح یہ سمندری جانور پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچ گئے۔ یہ بات کہ آج جو پہاڑ ہیں کبھی سمندر کا حصہ تھے قابلِ قبول نہیں تھی۔ اس لیے ایسے آسان نسخے کی تلاش ضروری تھی جس کے ذریعے ان سمندری جانوروں کا پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچنے کا قابلِ قبول جواز مہیا کیا جاسکے۔ اسی طرح ایک دوسری پریشان کن بات یہ تھی کہ پتھروں میں پائے جانے والے 'باقیات' موجودہ جانداروں سے نہ صرف مختلف تھے بلکہ موجودہ جاندار اپنی ہی اقسام کے 'باقیات' میں پائے جانے والے جانداروں کی ایک ترقی یافتہ شکل معلوم ہوتے تھے۔ ظاہر ہے یہ ایسی حقیقتیں تھیں کہ جن کی وجہ سے طرح طرح کے سوالات پوچھے جانے لگے۔ لیکن کلیسا کے علمبرداروں نے ان حقیقتوں کو واضح کرنے کے لیے آسان جواز مہیا کردیے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے، تب ہی سے وقتاً فوقتاً مکمل تباہی مچانے والے طوفان آتے رہے ہیں جن کے دوران اس دنیا میں موجود سارے جاندار نیست ونابود ہوتے رہے ہیں اور ہر طوفان کے بعد نئے سرے سے جانداروں کی تخلیق ہوئی ہے یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان طوفانوں کے دوران اتنی تیز ہوائیں چلتی تھیں اور اتنی اونچی اونچی سمندری لہریں اٹھتی تھیں کہ سمندروں کی تہوں میں موجود جاندار پاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچ جاتے تھے۔ طوفانوں کی اس مبالغہ آمیز ہلچل کا تذکرہ غالباً اس وجہ سے ضروری سمجھا گیا تاکہ پہاڑوں کے اوپر پائے جانے والے سمندری جانوروں کے 'باقیات' کی موجودگی کا جواز پیش کیا جاسکے۔ ساتھ ساتھ یہ وضاحت

بھی ملتی ہے کہ ہر بڑی تباہی کے بعد جب تخلیق ہوئی تو اس بات کا خیال رکھا گیا کہ ماضی کے جانداروں کے مقابلے میں تخلیقِ نو کے جاندار موزوں و متناسب ہوں۔ گویا اس طرح سے اس حقیقت کی بھی تشریح کر دی گئی کہ کیوں 'باقیات' کے جاندار موجودہ جانداروں کے قبیلے کے ہونے کے باوجود ان سے مختلف نظر آتے ہیں۔

جانداروں کی تخلیق کے سلسلے میں اٹلی میں کلیسا سے متعلق ایک مذہبی پیشوا نے تو یہاں تک نشان دہی کی تھی کہ اِس دنیا میں سب سے آخری مکمل تباہی مچانے والے، طوفان کے بعد موجودہ جانداروں کی تخلیق 4004 ق م میں 26 اکتوبر کے دن صبح 9 بجے عمل میں آئی تھی۔

اسی طرح سولہویں صدی تک یہ خیال بھی عام تھا کہ مختلف جاندار اپنے آپ وجود میں آجاتے ہیں۔ اس طرح کے نظریے کو نظریۂ تخلیق خود روئیدگی (Theoryof Spontareous Creation) بھی کہتے ہیں۔ اس نظریے کے حامی اپنے خیال کی تقویت کے بطور تجربات پر مبنی دلائل پیش کرتے تھے۔ مثلاً ان کا کہنا تھا کہ گوشت کے ٹکڑے کو ایک پلیٹ میں رکھ کر چھوڑ دیا جائے تو کچھ روز بعد اس میں خود بخود زندگی کے آثار نمایاں ہونا شروع ہو جائیں گے اور کچھ ہی عرصے میں بڑے بڑے سفید کیڑے (Maggots) اس میں کلبلانے لگیں گے۔

غالباً اٹلی کا ایک معالج جس کا نام فرینسیسکو ریڈی (Francesco Redi) تھا سترھویں صدی کا وہ پہلا سائنس داں تھا جس نے تجربات کی روشنی میں زندگی کے اپنے آپ وجود میں آنے کے نظریہ یا نظریۂ تخلیق خود روئیدگی (Theory of Spontareous Creation) کو غلط ثابت کیا اور اپنے تجربات سے یہ ثابت کر دیا کہ گوشت کے ٹکڑے پر اگر مکھیوں کو بیٹھنے نہ دیا جائے تو اس میں سفید رنگ کے کیڑے (جو مکھیوں کے انڈوں سے نکلے بچوں کی پہلی شکل ہوتی ہے) پیدا نہیں ہو پاتے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود عہدِ وسطیٰ کے یوروپ میں کلیسا کا اثر اتنا تھا کہ عام لوگ مذہبی اعتقاد سے ہٹ کر کوئی بات، چاہے وہ کتنی ہی حقیقی کیوں نہ ہو، ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کی زندہ مثال سترھویں صدی کا سائنس داں گیلیلیو ہے (1564-1642) جس کا یقین تھا کہ سورج ہمارے نظامِ شمسی کا جامد مرکز ہے اور ہماری زمین اُس کے اردگرد گھومتی ہے اور اسی بنا پر گیلیلیو کے خلاف عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور آخر کار اُس کو تحریری معافی مانگنی پڑی۔

گیلیلیو کے معافی نامہ کے الفاظ کچھ اس طرح تھے:

''میں کہ گیلیلیو گیلیلی ولد وینسیز یو گیلیلی۔ ساکن فلورینس عمر 70 سال جس کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور انصاف کیا گیا... یہ اقرار کرتا ہوں کہ ایسے ناقص خیالات سے میں منحرف ہوتا ہوں جن کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سورج نظامِ شمسی کا جامد مرکز ہے۔ میں نہ خود ایسے غلط خیالات رکھوں گا، نہ ہی ان کی تائید و حمایت کروں گا اور نہ ہی کسی کو اس کا درس دوں گا۔''

لیکن اٹھارھویں صدی کے آخیر اور انیسویں صدی کے شروع میں حالات خاصے سازگار ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے ارتقائے علمِ حیات کے سلسلے میں نئے نئے خیالات اور نظریات سامنے آنے لگے۔ عالموں کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جو نہ کسی طرح ارتقائے علمِ حیات کے نظریہ کی ہم نوا تھی اور نہ ان کا خیال تھا کہ تمام جانداروں میں جو ایک مخصوص تعلق نظر آتا ہے وہ اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ سب جاندار لاکھوں سالوں کے ارتقائی سلسلے میں ایک ہی طرح کے جانداروں سے ارتقا کر کے بنے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے ان سائنس دانوں میں جنھوں نے اس زمرہ میں اپنے اہم نظریات پیش کیے بوفون (Buffon 1707-1788) ارازمیک ڈارون (Erosmic Darwin) اور لامارک (Lamarek) کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ارازمیک ڈارون (Erosmic Darwin) اُنیسویں صدی میں مشہور ہونے والے سائنس داں چارلس ڈارون کے دادا تھے۔ انھوں نے ارتقائے حیات کے بارے میں اپنے نظریات 1794 میں اپنی کتاب Zoonamia میں شائع کیے۔

ان تینوں ناموں میں لامارک (Lamarak) کا نام نظریۂ ارتقا کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ فرانس کا رہنے والا سائنس داں علم الحیوانات کا ماہر تھا۔ لارماک کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ اس نے پہلی بار ارتقائے علمِ حیات کے سلسلے میں ایک مدلل و اہم تھیوری پیش کی جو 1809 میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ لامارک کے نظریے کی اہمیت اس لیے اور زیادہ مانی جاتی ہے کہ اس نے اس یقین کے ساتھ کہ سارے جاندار لاکھوں کروڑوں سالوں کے ارتقائی تسلسل سے وجود میں آئے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ کس طرح اس ارتقائی سلسلۂ عمل میں ایک نوع کے جاندار دوسری نوع کے جانداروں سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

لامارک کا خیال تھا کہ اس ارتقائی عمل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس بات کو سمجھا جائے کہ کس طرح کسی جاندار پر اس کا ماحول (Environment) اثر انداز ہوتا ہے اور ماحول کے بدلتے ہوئے اثرات کو وہ جاندار کس طرح قبول کرتا ہے اور کس طرح خود اس جاندار کے اندر ماحول کے زیرِ اثر مختلف تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں یعنی کس طرح وہ اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھال لیتا ہے جس کو انگریزی میں Adaptations (توافق) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

لامارک کا خیال تھا کہ ماحول کے زیرِ اثر جانداروں میں انفرادی طور پر بہت چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں

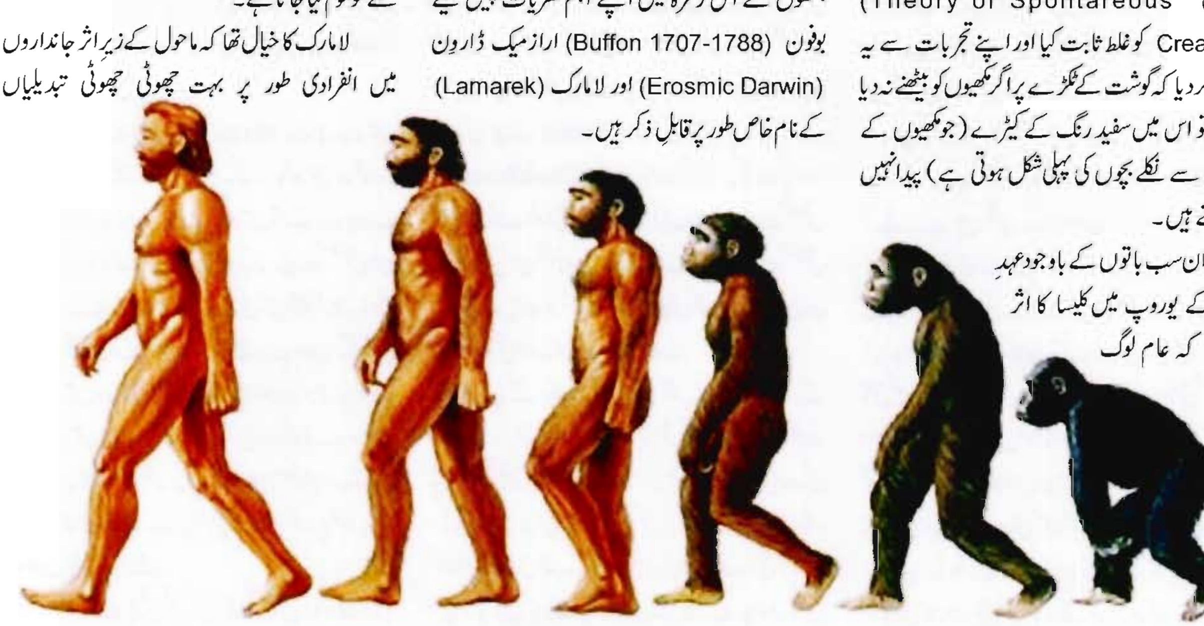

(Variations) واقع ہوتی ہیں اور پھر یہ انفرادی تبدیلیاں ورثہ میں آئندہ نسل کو ملتی ہیں اور اس آئندہ نسل کے افراد میں واقع ہونے والی تبدیلیاں اُن کی آنے والی نسلوں میں پہنچتی ہیں اور اس طرح لاکھوں سالوں میں نسل در نسل چلتے رہنے کے بعد ان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک نئی نوع کے جاندار وجود میں آجاتے ہیں جو اپنے پرکھوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہوئے بھی نوعی جزیات میں ان سے مختلف ہوتے ہیں۔

لامارک کی ارتقائے حیاتیات کی تھیوری کو کثرت الاستعمال وفقدان الاستعمال کے نظریہ کے نام سے جانا جاتا ہے یعنی انگریزی میں اسے Theory of use & disuse) کہتے ہیں کیونکہ لامارک کا خیال تھا کہ ایک جاندار کی اپنی زندگی میں اس کے جسم کے مخصوص حصے کثرتِ استعمال سے قوی و مضبوط ہوسکتے ہیں۔ دوسری طرف غیر استعمال سے لاغر اور کمزور۔ اس لیے ایک ہی طرح کے جانداروں میں کثرتِ استعمال یا اس کی کمی کی وجہ سے انفرادی طور پر جسمانی تفریق پیدا ہوسکتی ہے اور کسی جاندار کے اپنے دوران زندگی میں پیدا ہونے والی یہ امتیازی خصوصیات وراثت میں دوسری نسل کو مل سکتی ہے۔ لامارک نے اپنے اس نظریے کے ثبوت میں بتایا تھا کہ آج کا لمبی گردن رکھنے والا جراف کس طرح لاکھوں سال پہلے پائے جانے والے چھوٹی گردن کے جراف نما جانور سے ترقی کرکے بنا ہے اس کا خیال تھا کہ ان چھوٹی گردن والے جراف نما جانوروں میں سے جن جانوروں نے انفرادی طور پر پیڑوں میں لگی نیچے کی پتیوں کے ختم ہوجانے کے بعد اوپر کی پتیوں کو کھانے کے لیے اپنی گردن کو اونچا اٹھانے کی کوشش کی ہوگی اور متواتر یہ کوشش کرتے رہے ہوں گے ان کی گردنیں کتنی ہی کم سہی کثرتِ استعمال کی وجہ سے دوسروں کے مقابلے میں تھوڑی زیادہ لانبی ہوگئی ہوں گی اور اس طرح یہ امتیازی خصوصیت (Variation) ان کی اگلی نسل میں چلی گئی ہوگی اور اسی طرح لاکھوں سال تک نسل در نسل پیڑوں کی اونچی پتیوں کو کھانے کی کوشش میں گردن کے کثرتِ استعمال سے گردن کی لمبائی بڑھتی رہی ہوگی اور اس طرح ایک وقت ایسا آیا ہوگا کہ جب ایک نسبتاً لمبی گردن والا جانور وجود میں آیا ہوگا جو غالباً ہمارے موجودہ جراف کے پرکھوں میں سے ہوگا۔

لامارک کی تھیوری کافی حد تک ارتقائے علم حیات کو عام فہم بنانے میں معاون ثابت ہوئی لیکن جلد ہی اُس کے نظریے کی کمزوریاں بھی سامنے آنے لگیں، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ کثرتِ استعمال یا محنت مشقت سے جسم کے مخصوص رگ پٹھوں کو مضبوط وتناور تو کیا جاسکتا ہے لیکن یہ تبدیلی جسم کے سطحی خلیوں میں ہوتی ہے اور کثرتِ استعمال سے حاصل کردہ ایسی سطحی خصوصیات آئندہ نسل میں نہیں پہنچتی ہیں۔ کسی جاندار کی زندگی میں کثرت استعمال یا اس کے فقدان سے پیدا شدہ جسمانی تبدیلیاں اس وقت تک آئندہ نسل میں منتقل نہیں ہوسکتی ہیں، جب تک کہ وہ افزائش نسل کے خلیوں پر اثرانداز نہ ہوں۔

لامارک کے نظریہ کی کمزوری کو اجاگر کرنے کے لیے ویزمین (Weizman) کے جو اپنے زمانے کا ماہر علم الحیوانات تھا تجربات بہت اہم ہیں۔ اس نے کئی نسلوں تک پیدا ہوتے ہی چوہوں کی دُمیں کاٹ دیں لیکن اس کے باوجود ہر نسل میں چوہے اپنے اجداد کی طرح لمبی دم لیے ہوتے رہے یعنی دُم کاٹنے سے کئی نسلوں تک چوہوں کی دُموں کا استعمال مفقود رہا۔ اور لامارک کے نظریہ کے مطابق استعمال کی کمی کی وجہ سے آہستہ آہستہ چوہوں کی دُم کو ختم ہوجانا چاہیے تھا اور بغیر دُم کے چوہے پیدا ہونے لگنا چاہیے تھے۔

لامارک کی تھیوری جس میں نظریۂ ارتقا کو پہلی بار مدلل انداز میں سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی بہت عرصے تک اپنی سلمیت برقرار نہ رکھ سکی لیکن لامارک کا ایک کارنامہ ضرور ہے کہ اس کی تھیوری کے مدلل انداز نے لوگوں کو نظریۂ ارتقا کے بارے میں زیادہ مدلل انداز میں سوچنے پر مجبور کردیا۔ جو دوسرے دلائل لامارک کے نظریے کی مخالفت میں وقتاً فوقتاً پیش کیے جاتے رہے ہیں، ان میں چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں: **چین میں** سیکڑوں سالوں سے یہ رواج عام تھا کہ لڑکیوں کو اس طرح کے **چھوٹے اور سخت جوتے بچپن سے** پہنائے جائیں کہ ان کے پیر کا سائز عام طور پر جتنا ہونا چاہیے نہ ہوسکے۔ اسی طرح **یہودیوں** اور مسلمانوں میں نسلوں سے ختنہ کروانے کا **رواج عام** ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ مختلف ایشیائی وافریقی ممالک میں عورتیں **اپنی آرائش** کے لیے ناک اور کان کو نسل در نسل **چھیدتی رہی ہیں لیکن ان سب** چیزوں کے باوجود آج بھی جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ اب ہم موجودہ سائنسی تحقیقات کی روشنی میں یہ بات سمجھ گئے ہیں کہ وہ تمام تبدیلیاں جو کسی جاندار میں اس کے بدنی خلیوں (Somatic cells) میں ہوں تو وہ وراثتاً دوسری نسل میں نہیں پہنچ سکتی ہیں، جب تک کہ ان کا اثر افزائش نسل کے خلیوں پر نہ ہو۔

لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج ہم لامارک کی تھیوری کو یکسر غلط قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ آج یہ حقیقت ثابت ہوچکی ہے کہ کسی جاندار کا ماحول کسی حد تک اُس جاندار میں اس نوعیت کی تبدیلیاں پیدا کرسکتا ہے جو افزائش نسل کے خلیوں پر اثرانداز ہوتی ہے اور اس طرح دوسری نسل کے افراد تک پہنچ سکتی ہیں۔

مثال کے طور پر ہمارے ماحول میں ایسے عناصر موجود ہیں جو افزائش نسل کے خلیوں پر اثرانداز ہوسکتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ماحول میں ایکس ریز (X-Rays) پائی جاتی ہیں، جو جانداروں پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ ایکس ریز (X-Rays) کی مدد سے ہم تجربہ گاہوں کے اندر کسی جاندار کے افزائش نسل کے خلیوں میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرسکتے ہیں جو اس کی آئندہ نسلوں کے افراد تک پہنچ سکیں۔ تجربہ گاہوں کے باہر عام حالت میں بھی اس طرح کی تبدیلیاں جانداروں میں رونما ہوسکتی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ تو نکالا جاسکتا ہے کہ ماحول کے اثر سے ایسی تبدیلیاں واقع ہوسکتی ہیں جو دوسری نسلوں تک پہنچ سکیں۔

لیکن ان تبدیلیوں کے اثرات ضروری نہیں کہ اُس جاندار کو اپنے ماحول کی مناسبت سے زیادہ موزوں بنانے میں معاون ثابت ہوں۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ ان تبدیلیوں کی وجہ سے کوئی جاندار اپنے ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے میں دشواریاں محسوس کرے اور خود اپنے ہی ماحول میں بیگانہ ہوجائے۔

مختصراً کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لامارک کے نظریے کا یہ پہلو کسی حد تک صحیح ہے کہ ماحول جانداروں کے اوپر اثرانداز ہوتا ہے اور جاندار اپنے ماحول سے مطابقت رکھنے کے لیے اپنے آپ کو اُس کی مناسبت سے ڈھالتے رہتے ہیں۔ اس تغیراتی سلسلے میں زیادہ تر تبدیلیاں وہ ہوتی ہیں جو ایک نسل سے دوسری نسل تک نہیں پہنچ پاتیں اور اسی وجہ سے وہ ارتقائی تسلسل میں کوئی اہم رول ادا نہیں کرتیں لیکن کچھ تبدیلیاں ماحول کے اثر سے ایسی ضرور ہوسکتی ہیں جو **ایک نسل سے** دوسری نسل تک پہنچ سکتی ہیں۔ لیکن ایسی سب تبدیلیوں میں چند مخصوص تبدیلیاں ہی ایسی ہوتی ہیں جو کسی حد تک جانداروں کی ارتقائی نشوونما میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ لامارک کے نظریۂ ارتقا کی اہمیت اس لیے اور زیادہ ہے کہ اس نے اٹھارھویں صدی میں ایک ایسا سازگار ماحول بنادیا تھا جس نے چند سالوں کے بعد ایک ایسے مفکر کو جنم دیا جس نے اپنے نظریہ ارتقائے حیات کو پیش کرکے دنیائے علم میں تہلکہ مچادیا۔ وہ مشہور مفکر انیسویں صدی کا ماہر الحیوانات چارلس ڈارون تھا۔

□

ماخذ: ڈارون اور اس کا نظریۂ ارتقا: افتخار عالم خاں، سنہ اشاعت: 2000، ناشر: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

مصنف: نین تارا سہگل　　مترجم: شائستہ فاخری

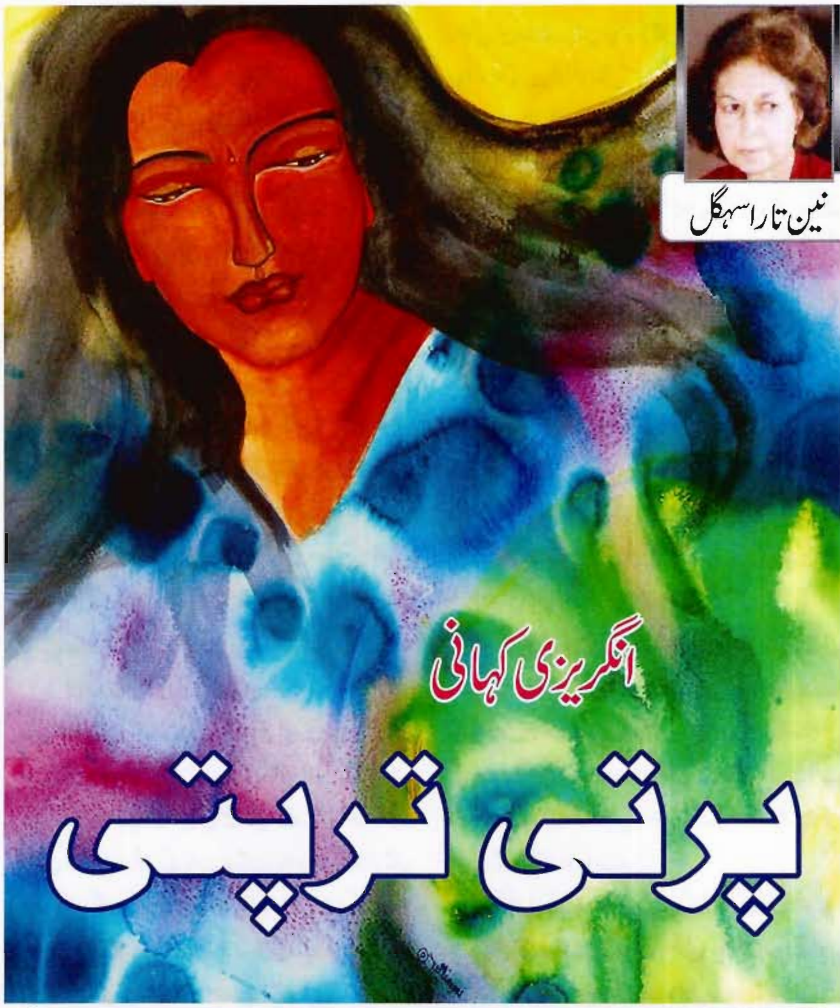

نین تارا سہگل

انگریزی کہانی

پرتی ترپتی

نین تارا سہگل کی پیدائش 10 مئی 1927 کو الہ آباد میں ہوئی۔ تعلیم ویلیزلی کالج ، میسا چیسیسٹرز، امریکہ سے تاریخ میں بی اے اور لیڈز یونیورسٹی، یو کے سے ادب میں ڈاکٹر کی ڈگری لی۔ بیس سے زیادہ کتابیں شائع شدہ۔ جن میں فرام فیر سیٹ فری (خود نوشت) ، اے ٹائم ٹو بی ہیپی۔ اے سٹورم ان چنڈی گڑھ، لیسر بریڈس (ناول) ریلیشن شپ(خطوں کا مجموعہ) اور فری ڈم موومنت ان انڈیا (سیاسی تبصرے) خاص ہیں۔ ساہیتہ اکیڈمی ایوارڈ، سنکلئیر، کامن ویلتھ اور یوریشیا کتھا انعامات سے اعزاز یافتہ۔

دوا کی دکان میں داخل ہوتے ہی میری ملاقات کملا سے ہوگئی۔ اپنے مخدوش پرانے جوتوں کو گھسیٹی ہوئی وہ دکان سے باہر آرہی تھی۔ اس کی ساڑی پر دھبے تھے اور اس کے سفید بالوں میں کچھ پیلا پن جھلکنے لگا تھا۔ وہ مسکرائی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا آگے کا ایک دانت بھی غائب تھا۔ برسوں بعد لکھنو آنے کی وجہ سے میں اس کے چہرے مہرے میں کچھ تبدیلی دیکھنے کے لیے تیار تھی لیکن اس کی اس قدر غریبی نے تو مجھے حیران ہی کر دیا تھا۔ مجھے دکھ ہوا اسے اس حالت میں دیکھ کر...

حیرت سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ بول پڑی۔ ''ہر آدمی وقت کے ساتھ بڑا ہوتا ہے۔ تم اس طرح گھبراؤ نہیں''

لیکن یہ تو بڑا ہونے سے بھی بڑھ کر تھا۔ برسوں سے ہم ایک دوسرے سے نہیں مل پائے تھے۔ ابھی تک وہ مجھے ایک خوش خرم اور خوش مزاج لڑکی کے روپ میں یاد ہے۔ وہ دور دراز کی رشتہ دار ہوتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ ہی بڑی ہوئی تھی اور میرے پاپا تو اسے خاص کر پیار کرتے تھے۔ انھوں نے کملا کے بلند ذہنی معیار کو پہچان لیا تھا۔ پھر پاپا نے اسے اسکول میں بھی بھیجا جبکہ ہم لوگوں کو ایسی کوئی سہولت نہیں ملی تھی۔ ہماری پڑھائی گھر پر ہی ہوئی تھی اور اپنے استاد کی باتوں کو سننے کی بجائے اگر ہم آپس میں دنیا جہاں کی باتیں کرتے یا اپنی کاپیوں پر ڈرائنگ کے نام پر ادھر ادھر کی تصویریں بناتے رہتے تب بھی پاپا کو کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی کہتے رہتے ۔تم سب تو اپنی شادیوں کے بعد صرف اپنے گھر بساؤ گی لیکن کملا تم سب سے الگ نکلے گی۔ آخر پاپا کی ان امیدوں کا کیا ہوا؟

کل چائے کے لیے ضرور آنا۔ وہ بولی اور مجھے اپنا نیا پتہ دیتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میں نے اپنا پچھلا مکان چھوڑ دیا ہے، دوسرے دن اس کے یہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ وہ ایک ایسے چھوٹے سے بنگلے میں رہ رہی تھی جسے دیوار کا ایک حصہ راستے سے الگ کرتا تھا۔ باغیچے کی زمین جنگلی گھاس سے بھری ہوئی تھی اور ٹیڑھی میڑھی لتاؤں نے جیسے اس سارے مکان کو پوری طرح چھپا لیا تھا۔ ہم ایک دیوان پر بیٹھ گئے اور کملا نے نوکر کو چائے لانے کا حکم دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک اور آدمی ہم لوگوں کے درمیان آکر بیٹھ گئے۔

''تمھیں موہن لال کی یاد ہے نا؟'' کملا اس کا تعارف کراتی ہوئی بولی۔ ''جب ہمارے ساتھ یہ پرانے والے مکان میں رہتے تھے تب تمھاری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب ہمارے ساتھ یہ بھی وہاں سے چلے آئے ہیں۔''

بیچ میں ہی موہن لال بول اٹھے۔ ''اصل میں کملا کے بنائے کھانے کا میں اس قدر عادی ہوگیا تھا کہ کسی دوسرے کے ساتھ رہنا ہی میرے لیے ممکن نہ تھا۔''

لمبے عرصے کی رفاقت نے انھیں ایک دوسرے جیسا ہی بنا دیا تھا۔ موہن لال بھی اب کافی بڑے لگنے لگے تھے۔ اپنے کچھ زیادہ بڑھے ہوئے سفید بالوں اور آگے سے ٹوٹے ایک دانت کے ساتھ اس کا حلیہ کملا سے ملتا جلتا ہوگیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ دونوں بھائی بہن ہوں۔ ہم کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اس کے بعد میں نے موہن لال سے ان کے مضامین اور لکچرز کے بارے میں پوچھ تاچھ کی اور جاننا چاہا کہ اب تک وہ زیادہ گھوم پھر کر کیوں نہیں پاتے ہیں؟

''یہ سمجھنا بھول ہے کہ چھوٹے شہر غیر جاذب نظر اور بے کار ہوتے ہیں۔ مجھے تو یہاں بھی بہت کچھ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔'' انھوں نے کہا ''لیکن آپ کسی دوسری جگہ ہوتے تو اور بھی ترقی کے مواقع مل سکتے تھے، آپ کی شہرت بھی تب شاید آج سے کئی گنا بڑھ چکی ہوتی۔''

یہ تو آدمی آدمی کے نظریے پر منحصر ہے۔ میری بات پوری طرح سنے بغیر وہ بول اٹھے تھے۔ ہم باتیں کر رہے تھے اور نوکر چائے بنا رہا تھا۔ اچانک مجھے چینی کراکری کا وہ خوبصورت سیٹ یاد آ گیا جسے پاپا نے کملا کے لیے دیا تھا۔ یقیناً وہ بھی مکان کے ساتھ بیچ دیا گیا ہوگا۔ میں نے سوچا۔

تھوڑی دیر بعد کملا کے شوہر نواب صاحب بھی وہاں آ گئے۔ نواب صاحب نہ ان کا نام تھا اور نہ سچ مچ کہیں کے نواب تھے۔ وہ ان کی چست درست زندگی، ادب وآداب سے بھرے رہن سہن، صاف شفاف لباس اور لکھنوی نزاکت سے بھرپور اداؤں کو دیکھتے ہوئے ہم لوگوں نے انھیں اس نام سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ اور بعد میں وہ ان کے ساتھ پوری طرح چسپاں ہو کر رہ گیا تھا۔

نواب صاحب سچ مچ پورے شائستہ مزاج انسان تھے۔ گزرے زمانے میں یقیناً لوگ انھیں ایک نوبل مین کی شکل میں مخاطب کرتے۔ ان کے کپڑے کملا اور موہن لال کی بکھری اور بے ترتیب رنگ ڈھنگ، لباس، وضع قطع کے مقابلے کہیں زیادہ اچھے اور صاف ستھرے تھے۔ ان کی رنگت ٹیسو پیپر کی طرح شفاف تھی اور ان کا چہرہ پتلا اور جبڑے ذرا اٹھے ہوئے تھے۔ اپنے لمبے اور پتلے جسم میں وہ کچھ جھک کر چلتے ہوئے سے معلوم پڑ رہے تھے۔

کملا نے انھیں آرام سے بٹھانے کی نیت سے موہن لال کو آرام کرسی چھوڑنے کا اشارہ کیا۔ موہن لال دوسری کرسی لانے اندر چلے گئے۔ نواب صاحب آرام سے کرسی پر بیٹھے ہی خوش نظر آ رہے تھے۔ میرے سلام کے جواب میں وہ ہلکے سے مسکرا دیے۔ جیسے میری موجودگی سے انھیں کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ پر سکون اور مطمئن بیٹھے رہے۔ ہماری بات چیت پھر شروع ہو گئی بیچ میں نواب صاحب نے کملا سے اپنا سگار مانگا جسے اس نے لا کر دے دیا۔

''تمھاری ہرے نگینے والی انگوٹھی کہاں ہے؟''
تھوڑی دیر بعد وہ اچانک کملا سے پوچھ بیٹھے تھے۔ ایسا لگا جیسے ہماری بات چیت ان تک پہنچ ہی نہ پا رہی ہو۔

''یہاں ہے''۔ کملا نے اپنی ساڑی کے کنارے سے بندھی ہوئی انگوٹھی نکالتے ہوئے کہا۔ ''جب کھانا بنانے لگی تھی تب اسے اتار دیا تھا۔'' وہ سنجیدگی سے بولے تھے۔ ''اسے تمھیں ہمیشہ پہنے رہنا چاہیے۔''

پھر چائے آئی اور سب سے پہلے نواب صاحب کو پیش کی گئی۔ جب تک اس کا ایک گھونٹ پی کر انھوں نے کملا سے یہ نہیں کہا کہ چائے ان کی پسند کے مطابق بنی ہے، کملا ایسی ہی بیٹھی رہی۔ اس کے بعد مجھے اور پھر موہن لال کو چائے دی گئی۔ مجھے حیرت ہوئی یہ سوچ کر کہ کیا کملا کو اس دن کی یاد نہیں ہے جب اس کے پچھلے گھر میں انڈے کی شکل کے شاندار ڈائنگ روم میں جس کی کھڑکیوں سے اس کا رنگ برنگا باغیچہ دکھائی دیتا تھا، ہم لوگوں نے چائے پی تھی۔ کوٹ اور پگڑی سے چست درست ایک نوکر ہمارے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد کملا کے تین بیٹے، تینوں بالکل اپنے باپ جیسے ہی دبلے پتلے تھے، وہاں آ گئے۔ انھوں نے نواب صاحب کو مودبانہ سلام عرض کیا اور پھر موہن لال کے ساتھ ادھر ادھر کی باتوں میں گم ہو گئے۔ تبھی شام کو اخبار آیا اور وہ نواب صاحب کے ہاتھوں میں تھما دیا گیا۔ لیکن نواب صاحب نے اپنی جگہ سے تھوڑا اٹھتے ہوئے اس اخبار کو موہن لال کے ہاتھوں میں دے دیا۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے یہی کہہ رہا تھا کہ پہلے وہ اس اخبار کو پڑھے۔ آخر میں نواب صاحب نے فیصلہ کیا کہ چونکہ موہن لال گھر میں مہمان کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ اس لئے پہلے اخبار پڑھنے کا حق انھیں کو ہے۔ مجھے ان کی یہ بات سچ مچ ہی کچھ عجیب سی لگی کیونکہ جب چائے انھیں دی گئی تھی تو انھوں نے اسے لینے سے انکار نہیں کیا تھا۔

کملا کے یہاں سے میں تینوں آدمیوں کی مختلف النوع شخصی تصویریں اپنے دل ودماغ میں اتار کر واپس لوٹی۔ کملا اور اس کے ساتھ خاندان کو میں نے اپنے یہاں کھانے پر مدعو کرنے کی بھی کوشش کی لیکن کملا نے اسے نا منظور کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تم مجھے غلط نہیں سمجھنا، لیکن میں باہر بہت ہی کم نکلتی ہوں۔ آج کل تو بالکل نہیں''

ہمارے جس گھر میں کملا پلی بڑھی تھی، بڑی ہوئی تھی وہاں آنے پر اسے یقینی طور پر اپنی باتیں یاد آ جاتی ہوں گی۔ ایسا میں سمجھتی تھی۔ کتنی ہی بار کملا یہاں اسی میز پر بیٹھ کر ہم سب کو اپنے میٹھے رویوں اور ہنس مکھ برتاؤ سے بری طرح متاثر کر چکی تھی۔ پاپا اگر کبھی ذہنی دباؤ میں مبتلا نظر آتے تھے تو کملا ہی ان کو اس سے آزادی دلانے میں کامیاب ہو پاتی تھی۔ جب ہم دوسری لڑکیاں پاپا کے ڈر سے شور نہ مچا کر چپ چاپ بیٹھنے کی تکلیف جھیلتی تھیں تو کملا ہی ہوتی تھی جو اپنی پر تکلف باتوں سے اس خاموشی بھرے ماحول کو پوری طرح ہلکا پھلکا کر دیا کرتی تھی۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہا کرتی تھی کہ گھر میں خاموشی اور غمگینی کی پرچھائیں بھی نہ پڑ پائے اور اپنی انھیں خوبیوں کی وجہ سے وہ ہم سب کی محبوبہ بن سکی تھی۔

ان ہنستے کھیلتے دنوں کی یاد کر کے مجھے کملا کی آج کی حالت پر یقیناً ہی بے حد دکھ ہوا اور خاص طور پر اس لیے مجھے اور بھی زیادہ افسوس ہوا کہ اپنی اس حالت کو وہ مسکراتے ہوئے قبول کر رہی ہے۔ کیا سچ مچ اسے پرانے دنوں کی یاد نہیں آتی؟ کیا سچ مچ وہ ان دنوں کو یاد کر کے ان کے لیے تڑپن محسوس نہیں کرتی؟ کیا اسے نواب صاحب کے ساتھ بغیر سوچے سمجھے کی گئی شادی کا سچ مچ کوئی دکھ نہیں ہے؟

کملا کو ایک مرد کا دماغ ملا ہے۔ یہ بات پاپا نے بڑے فخر سے کہی تھی اور ماں نے مایوسی سے۔ ماں گہری سانس لے کر کہا کرتی تھی۔ ''کملا میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ بے حد آزاد خیال اور پارہ صفت مزاج کی ہے۔ اس لیے یہ بالکل ممکن تھا کہ جب دوسری لڑکیوں کی شادیاں ان کے ماں باپ طے کرتے تھے، کملا خود کسی سے محبت کر بیٹھی۔ وہ نوجوان حالانکہ کئی بار ہمارے گھر آ چکا تھا پھر بھی ہمارے شہر کے لیے وہ بالکل نیا تھا اور یہاں کوئی بھی اس کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ پاپا کملا کی ہر بات کو آنکھ بند کر کے مان لیا کرتے تھے لیکن اس بات میں اس کی حمایت نہیں لے سکے۔

لیکن آپ کیا اس بات کو نہیں مانتے ہیں کہ وہ ایک شریف، تعلیم یافتہ اور مہذب نوجوان ہے؟ کملا سوال کرتی۔

نوجوان اپنے رہن سہن، چال ڈھال سے بڑا جاذب نظر اور ہینڈسم تھا۔ اسے اردو زبان اور ادب میں خاص دلچسپی تھی اور کبھی کبھی ہمیں اس کی کچھ چیزیں سناتا بھی رہتا تھا۔ اس کا پرخلوص اور نرم رویہ اسے با آسانی ہی دوسرے لوگوں کی بہ نسبت اونچا اٹھا دیتا تھا۔ ہم لوگوں نے خود اپنی طرف سے اسے نواب صاحب کہنا شروع کر دیا تھا اور یہ تخاطب اس کی شخصیت پر جچتا بھی خوب تھا۔ ہمارے لیے اس وقت وہ سچ ہی کام دیو کا اوتار جیسا ہی معلوم ہوتا تھا اور ہمیں اس بات کا پورا بھروسہ تھا کہ کملا کے لیے پاپا اسے ضرور پسند کر لیں گے۔

تمھیں پہلے اپنی پڑھائی کی طرف دھیان لگانا چاہیے اور اس کے بعد ہی ان باتوں کو سوچنے کی ضرورت ہے۔ پاپا نے کملا کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

لیکن وہ سب تو میں بعد میں بھی پورا کر سکتی ہوں۔ آپ اس بات کو آخر سمجھتے کیوں نہیں؟ کملا نے جواب دیا تھا۔ اس کی بے صبری اپنی حد پر تھی۔ اسی بے صبری میں وہ

یہاں تک کہہ بیٹھی۔ آپ دیکھتے نہیں کہ میں اس سے کتنا پیار کرتی ہوں؟ پھر وہ بہت دنوں تک تو یہاں رکے گا بھی نہیں۔ اور پھر کسی دوسری لڑکی کے ساتھ اس جیسے خوبصورت نوجوان کی شادی ہوجائے گی۔

پاپا نے اپنی آخری کوشش کرتے ہوئے کملا سے کہا تھا۔ ''مجھے تو نہیں لگتا کہ اسے جانے کی کوئی جلدی ہے اور پھر اس مسئلے پر تھوڑی بہت تاخیر تصویر کو اور صاف کردے گی۔

لیکن آخر میں ان کو کملا کی بات ماننی ہی پڑ گئی۔ انھوں نے اپنے من کو یہ سمجھانے کا فیصلہ کیا کہ ایک نہ ایک دن تو کملا کی شادی کرنی ہی ہے اور اگر اسے اپنی پسند کا شوہر مل گیا تو پھر دیر کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ پتہ لگانے پر معلوم ہوا کہ نواب صاحب بھلے ہی زیادہ پیسے والے نہ ہوں لیکن ان کا خاندان ایک جانے مانے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور پاپا نے کملا کے ساتھ ان کی سگائی کردی۔

کملا نے اندر دل سے نواب صاحب کو پیار کرنا شروع کردیا تھا اور ان کی شادی میں کسی طرح کی کوئی دیر ہو یہ بات اسے گوارا نہ تھی۔ ماں کو اس کی یہ جلد بازی تہذیب کے خلاف لگتی تھی لیکن ہم جیسے لوگ جو عمر کے جوشیلے پن کی شدت کے احساس کرنے کا کبھی کوئی موقع نہیں ملا تھا کملا سے رشک کرنے لگ گئے تھے۔ وہ ہمیشہ ہم سے اوپر رہی تھی۔ ہم سب سے الگ ایک نرالی شخصیت کی مالکن۔ اس کی اس پیار بھری شادی نے تو اسے اچانک ہی ہم سب کی ہیروئین بنادیا تھا۔

کملا کے ایک ایسے شخص کی طرف متوجہ ہونے پر جو اپنی عادتوں اور برتاؤ میں کملا کے ساتھ قطعی میل نہ کھاتا ہو، ہمیں حیرت نہیں ہوئی تھی۔ ہم کسی ایسے آدمی کو جانتے ہی نہیں تھے جو ہو بہ ہو کملا کی طرح ہو۔ پاپا سے ملنے جلنے والے لوگ، وہ لوگ جن سے ہم پارٹیوں وغیرہ میں ملا کرتے تھے۔ بالکل الگ طور طریقے کے شریف آدمی ہوا کرتے تھے۔ وہ لوگ اپنی باتوں کو لفظوں کی جگہ پر اشاروں کے ذریعے بیان کرنے کے عادی تھے۔ الفاظ سے عاری آنکھوں کی زبان بولنے کی ان کی عادت تھی۔ ایسے لوگ ناراض اور غصہ ہونے پر بھی اسے صاف طور پر ظاہر کرنے کے بجائے اپنی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔

ایک دوسرے کو سر اور جناب کہہ کر مخاطب کرتے۔ کسی لڑکی کے روبرو اپنی محبت کا مظاہرہ کرتے وقت وہ لوگ بہت سوچ سمجھ کر گنے چنے لفظوں میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ ایسے لوگوں سے ہم برابر ہی اپنے ڈرائنگ روم یا گارڈن پارٹیوں میں ملا کرتے اور ان کے ہاؤ بھاؤ، چال ڈھال سے انھیں پرکھنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح کے ماحول میں اپنے کو قابو میں نہ رکھنے کا گناہ ناقابل معافی مانا جاتا ہے اور گناہ گاروں کو فوراً ہی غیر مہذب اور بدتہذیب لوگوں کی صف میں رکھ دیا جاتا ہے۔ ہم خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ کملا جیسے جیسے بڑی ہوتی جائے گی وہ خود بھی اس طرح کے خاندان کو بالکل بے غرض اور کھوکھلا سمجھنے لگے گی۔

کملا اور نواب صاحب کو شادی کے پہلے حالانکہ بہت کم کھل کر ملنے کا موقع ملا تھا لیکن جب کبھی دونوں میں ملاقات ہوتی تھی تو کملا کی آنکھوں سے مسرت کی لہر اپنے آپ جھلکنے لگتی تھی۔ ویسے ان ملاقاتوں کا خود نواب صاحب پر بھی زیادہ اثر نہیں پڑتا کیونکہ وہ ربط میں آنے والے ہر آدمی سے اس طرح کی تحسین حاصل کرنے کے عادی ہوچکے تھے۔

شادی کے دن کملا میں خود بخود ایک شرم کی ادا پیدا ہوگئی تھی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چمکنے لگی تھیں۔ دولہے کے لباس میں حالانکہ نواب صاحب ساری رات کے جاگنے کے باعث بہت زیادہ تھکے دکھائی دے رہے تھے لیکن تب بھی ان کا چہرہ پوری طرح پرسکون اور مطمئن تھا۔ پھولوں سے سجے سجائے اس کمرے میں جہاں انھیں اپنی شادی کی پہلی رات گزارنی تھی۔ انھوں نے اپنے سلیپر اتارنے کے بعد ایک لمبی جماہی لیتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں سمجھ نہیں پارہا ہوں کہ اتنے پھولوں کی آخر کیا ضرورت تھی؟ ان کی خوشبو کتنی زیادہ تیکھی ہے۔''

کمرے کا فرش اور بستر سب پھولوں سے پوری طرح بھرے ہوئے تھے۔ ہر جگہ چنبیلی اور گلاب کے پھول بکھرے دکھائی پڑ رہے تھے۔ باغیچے والی کھڑکی کھلی ہوتے ہوئے بھی کمرہ خوشبوؤں سے بھرا تھا، نواب صاحب نے اپنے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے تھوڑی ہی دیر بعد کہا تھا۔ اور شراب؟''

کملا نے پھولوں کی لڑیوں کو اٹھا کر غسل خانے میں رکھ دیا تھا، بستر اور فرش پر بکھری پنکھڑیوں کو جمع کرکے اس نے کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ اس کام میں اسے مشکل سے دس پندرہ منٹ لگے ہوں گے۔ کام ختم کرنے پر جب وہ نواب صاحب کے پاس پہنچی تو وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے سونے کی کوشش کرنے میں لگے تھے۔ کملا نے انھیں دھیرے سے اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا۔ لیٹتے ہی وہ پوری طرح سو گئے۔ کملا کچھ دیر تک اپنے آنسو بہاتی رہی لیکن چونکہ وہ بھی دن بھر کی تھکی ماندی تھی، اس لیے اسے بھی جلدی ہی نیند آ گئی۔

شادی کے بعد ہم لوگوں نے کملا میں ایک عجیب سی تبدیلی پائی۔ اپنی عادت کے برخلاف وہ پوری طرح خاموش سی ہوگئی تھی۔ ماں کو اس کی اس تبدیلی پر بہت اطمینان ہوا لیکن ہم جیسے لوگ اس کی اس خاموشی سے حیران ہوا ٹھے تھے۔

''کیا بات ہے کملا؟'' میں نے اس سے پوچھا تھا۔ ''تم اس سے پیار کرتی ہونا؟''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں؟'' کملا نے جواب دیا تھا۔

نواب صاحب کے تئیں اپنے پیار کو پالنے اسے بڑھاوا دینے اور سمجھنے میں ہی کملا کا پورا وقت لگ جاتا تھا۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہو پایا کہ کتنے دنوں تک وہ اپنے کو اس کام میں لگائے رہی تھی۔ تبھی اس کی ملاقات موہن لال سے ہوئی۔

موہن لال یونیورسٹی میں استاد تھے۔ ان سے ملنے کے بعد کملا کو محسوس ہوا کہ شادی سے پہلے والی اس کی زندگی، جب وہ اپنی پڑھائی لکھائی میں مشغول رہا کرتی تھی، کتنی معنی خیز اور رومان پرور تھی۔ اس میں آج جیسی بے گانگی، خالی پن کہاں تھی۔ گھر کا سارا کام نوکروں کے ذمے ہونے کی وجہ سے کملا نے اپنی اس پڑھائی کو پھر سے جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہفتے میں ایک دو دن موہن لال اسے پڑھانے کے لیے آنے لگے، اپنے پڑھنے کے شوق اور ہر بات کو جاننے کی للک کی وجہ سے کملا ہر چیز کو آسانی سے دل میں بٹھا لیتی تھی۔ پھر موہن لال کا اس کے یہاں آنا جانا بڑھتا گیا اور ایک دن انھوں نے محسوس کیا کہ وہ کملا کو پیار کرنے لگے ہیں۔

کملا حالانکہ خاص طور سے خوبصورت نہیں کہی جا سکتی تھی لیکن ہر پل علم و آگہی میں ڈوبے رہنے والے موہن لال کے لیے وہ ایک ایسی کشش کی مرکز کی شکل میں نمودار ہوئی تھی جو کشش انھوں نے کسی بھی دوسری عورت میں نہیں پایا تھا۔ عرفان و آگہی کے تئیں اس کی پوری تلاش و جستجو اور موہن لال سے معاملات کرنے والی اس کی ذہانت، اس کی یہ خوبیاں موہن لال کو کملا کی طرف مائل کرنے میں اور مددگار ثابت ہوئیں۔ کملا کی موجودگی ان میں ایک عجیب سا جذباتی ہیجان پیدا کردیتی اور جس خاموش اور پرسکون ماحول میں ان کی ملاقاتیں ہوتی تھیں وہ آگ میں گھی کا کام کرتی تھیں۔ موہن لال کے آنے کے وقت عام طور پر نواب صاحب گھر کے باہر ہوا کرتے تھے۔ اپنی شامیں ان کو

اپنے دوست واحباب کے ساتھ شراب اور شاعری کے ماحول میں گزارنے کا شوق تھا۔ کملا کے جمع شدہ روپے پیسوں سے انھیں پہننے کے لیے شاندار کپڑے اور پینے کے لیے خوشبودار سگار مل ہی جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے ہر محفل میں نواب صاحب معروف ہوتے گئے اور ان کی موجودگی ہر بیٹھک کی شان سمجھی جانے لگی۔

کملا اس بات کو بالکل نہیں جان پائی کہ موہن لال کو اس سے اس قدر پیار ہے۔ موہن لال اس کے لیے صرف ایک دوست ایک استاد تھے۔ لیکن ایک دن کسی کڑے موضوع کو سمجھاتے ہوئے موہن لال نے ایک ایسی مثال کا استعمال کیا کہ خود اسے بھی ہنسی آ گئی۔ شروع میں وہ اپنا منھ بند کر کے ہنستی رہی لیکن دھیرے دھیرے اس کی وہ ہنسی قہقہے میں بدل گئی۔ وہ اتنا ہنسی کہ اس کے پیٹ میں بل پڑنے لگے۔ اس دن اس کو اس بات کا احساس ہوا کہ شادی کے بعد پہلی بار وہ اپنی پرانی طرز کی ہنسی ہنسی تھی لیکن اس احساس نے کملا کو خوش کرنے کے ساتھ ہی کچھ ڈرا بھی دیا۔

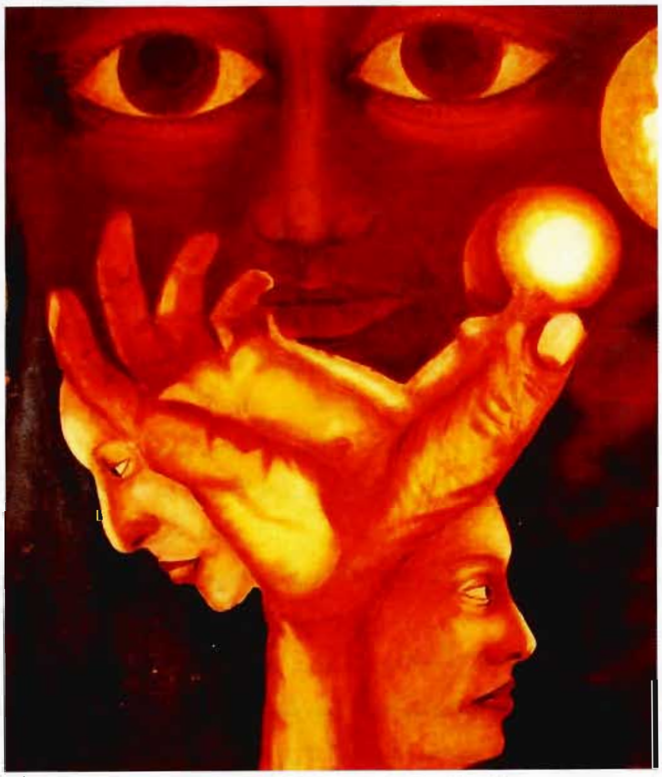

جولائی کی ایک گرم رات کو کھانے کے بعد جب وہ لوگ باہر لان میں لیمپ کے سامنے بیٹھ کر پڑھنے پڑھانے جا رہے تھے تبھی اچانک اس کا بلب فیوز ہو گیا۔ کملا نے کہا۔ ''میرے پاس ایک اور بلب ہے، میں اسے لے آتی ہوں۔''

جب وہ اندر جانے لگی تو موہن لال نے اسے آواز دے کر بلایا۔ اندھیرے میں وہ کچھ مڑی ہی تھی کہ اس نے دیکھا موہن لال اس سے لگ کر کھڑے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کملا اپنا کوئی ردعمل ظاہر کرتی، موہن لال نے اپنے ہاتھ کملا کی کمر میں ڈال کر اس کا بوسہ لے لیا۔ موہن لال کے اس جسمانی لمس سے وہ بہت زیادہ جذباتی ہو اٹھی تھی اور نتیجتاً اس نے خود اپنے کو ان سے چمٹا لیا۔ اسی وقت انھوں نے کسی تانگے کے آنے کی آواز سنی۔

تانگہ گھر کے باہر آ کر رکا اور تانگے والے نے آواز لگائی۔ ''گھر میں کوئی ہے؟'' بھرپور کوششوں کے بعد اپنے کو موہن لال سے الگ کرتی ہوئی کملا باہر نکلی۔ تانگے والے کے کندھے پر اپنا سر رکھے ہوئے نواب صاحب بے ہوش ملے۔ کملا نے تانگے سے انھیں اٹھا کر موہن لال کی مدد سے سونے کے کمرے میں پہنچایا۔ کچھ ہی دیر بعد نواب صاحب کو کچھ ہوش آیا۔ نیند بھرے لہجے میں انھوں نے موہن لال کا شکریہ ادا کیا اور پھر پوری طرح سو گئے۔ موہن لال کو وہیں چھوڑ کر کملا تانگے کا کرایہ دینے چلی گئی تھی اور جب تک تانگہ چلا نہیں گیا وہ وہیں کھڑی رہی تھی۔

لوٹنے کے بعد جب اس نے نواب صاحب کے کمرے کی روشنی بجھی دیکھی تو اس نے سمجھا کہ موہن لال شاید اسے بتانے کے بعد واپس چلے گئے ہیں لیکن پھر جب باہر کے اندھیرے میں اس نے موہن لال کو کھڑا پایا تو اس کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی۔ وہ اس کے پاس پہنچ گئی اور پھر اس طرح کہ نواب صاحب کے کمرے تک ان کی آواز نہ پہنچنے پائے دونوں محبت کی سرشاری کے ساتھ محوگفتگو ہو گئے۔ گرمی کی وجہ سے ان کے جسم پسینے سے تربتر ہو رہے تھے اور ان کے کپڑے پوری طرح سے گیلے ہو کر بدن سے چپکے جا رہے تھے۔

اسی رات کملا کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ موہن لال کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ پھر ایک ہفتے کے اندر ہی اپنا یونیورسٹی والا ٹھکانہ چھوڑ دیا اور کملا کے یہاں Paying guest بن کر آ گئے۔ تب سے آج تک اسی کے پاس رہ رہے ہیں۔

نواب صاحب کملا کے روز مرہ کے کاموں کی مشغولیت سے ہمیشہ ہی بے نیاز رہتے آئے تھے۔ اس بات پر بھی انھوں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ paying guest کا مطلب تھا پیسوں کی آمدنی۔ اور انھیں اندازہ تھا کہ کملا کے ذریعے لایا ہوا اور جمع شدہ پیسہ زیادہ دنوں تک نہیں چلنے والا ہے۔ اسی کو دیکھتے ہوئے اس انتظام سے انھیں خوشی ہوئی تھی۔ کملا کے ساتھ اکیلی زندگی گزارنا ان کے لیے ایک امتحان کی طرح مشکل ہوتا جا رہا تھا اور کملا بھی اپنی شخصیت کو پوری طرح بھلا کر عام عورتوں کی طرح اپنے وجود کو مسمار نہیں کر پائی تھی۔

شام ہوتے ہی نواب صاحب سج دھج کر اپنے دوستوں کے یہاں چل دیتے۔ تب کملا اور موہن لال کو آزادی کے ساتھ ملنے کا موقع ملتا۔ کملا کے تئیں اپنے پیار کے جوش میں موہن لال نے یہ سمجھا کہ اس سے دور رہ پانا اب ان کے لیے قطعی ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ دوسری طرف کملا نے بھی جو ہمیشہ پیار کی پیاسی رہی تھی، موہن لال کے ذریعے اپنی امنگوں کی تکمیل کا ایک مناسب ذریعہ پالیا تھا۔ میں نے اس کے پہلے اسے کبھی اتنا کھلا، اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔

موہن لال جس بے پناہ مسرتوں کے ساتھ ہنستا تھا اسی گہرائی کے ساتھ وہ پیار بھی کرتا تھا۔ کملا کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے موہن لال کے آنے سے پہلے اس کی زندگی پوری طرح بستر مرگ پر تھی۔ ابھی تک وہ اندھیرے میں رہتی آئی تھی، موہن لال کے ذریعے اسے سورج کی روشنی ملی تھی۔ سورج کی اس چمکتی روشنی میں اس کا اصلی رنگ روپ پوری طرح کھل اٹھا۔

نواب صاحب نے کملا کے اندر ہونے والی ان تبدیلیوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ دوسری طرف کملا نے بھی نواب صاحب کے تئیں اپنے روز مرہ کے برتاؤ میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی۔ نواب صاحب کو وہ اپنی ذمے داری سمجھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اپنی چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے بھی وہ کملا پر پوری طرف منحصر تھے۔ اور ان کی یہ عادت آسانی سے ختم ہونے والی نہیں تھی۔ کملا کو یہ بھی معلوم تھا کہ شروع سے ہی وہ کبھی اس کی طرف زیادہ راغب نہیں رہے اور نہ کبھی انھوں نے اس کی کوئی اداکاری ہی کی۔ ان کے ساتھ کملا کا ایک طرفہ پیار ہی رہا تھا، اس لیے وہ انھیں چھوڑنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

دھیرے دھیرے موہن لال بھی خاندان کے اصولوں کے مطابق چلنے لگے۔ نواب صاحب کو اگر کبھی اس بات کا خیال بھی آتا کہ موہن لال اور کملا ایک دوسرے کو پیار کرنے لگے ہیں تو انھوں نے اسے واہیات مان کر اڑا دیا ہوتا۔ آخر کملا میں ایسا ہے ہی کیا جو کسی مرد کو اپنی طرف مبذول کر سکے؟ نواب صاحب کے مطابق نہ تو اس میں کوئی حسن تھا اور نہ کوئی عورت پن کی خوبی۔ اس کی خاص خصوصیت اس کی صحت تھی اور ہر بات کو جاننے کی اس کی لگاتار للک، ان باتوں کا کسی عورت میں ہونا ضروری نہیں ہے۔

وہ دونوں زیادہ وقت ایک ساتھ بھی نہیں رہتے تھے۔ نواب صاحب کو ایسی سیلونوں میں جانا پسند تھا جہاں مرد اور عورتیں صرف ساتھ ساتھ ناچنے کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر وہ کملا کو اپنے ساتھ کبھی نہیں لے گئے۔ پاس پڑوس میں ان کے ان رویوں کا کبھی کوئی ذکر ہی نہیں ہوا۔ سبھی لوگوں کو اس بات کی جانکاری تھی کہ پڑھنے پڑھانے کی وجہ سے کملا کے لیے کسی سماجی پروگرام میں حصہ لینا آسان نہیں۔

اس کے بعد کملا نے تین لڑکوں کو جنم دیا۔ اسے خود بھی اس بات کا یقین نہ ہو سکا کہ وہ لڑکے نواب صاحب کے تھے یا موہن لال کے۔ ان کے چہروں سے بھی ایسی کسی بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، نواب صاحب اس سے اور بھی دور رہنے لگے۔

موہن لال اور کملا اپنی نظریاتی ہم آہنگی کے باعث ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم لگنے لگے تھے۔ نواب صاحب لگتا تھا جیسے ان کے سامنے بالکل پرائے مہمان ہوں۔ دنوں دن دبلے ہونے کے بعد بھی اپنے رہن سہن اور پوشاک کے تئیں وہ پوری طرح حاضر دماغ رہتے۔ اور یہی وجہ تھی کہ دوسرے افراد کے مقابلے وہ سبھوں سے مختلف تھے۔ اگر انھوں نے کبھی دیکھا بھی کہ ان کے رہنے کے ڈھنگ میں بدلاؤ آتا جا رہا ہے یا کملا نوکروں کی تعداد دن بدن کم کرتی جا رہی ہے یا گھر کا چرخہ چلانے کے لیے اسے اپنے زیورات بیچنے پڑ رہے ہیں تب بھی وہ کچھ نہیں بولے۔ کملا کو کسی طرح گھر چلانا ہی تھا اور اپنے اس فرض کے تئیں وہ پوری طرح مستعد تھی۔ موہن لال کی تنخواہ ان کے ذریعے لکھے گئے مضامین کے محنتانے اور کملا کے اپنے جمع کیے ہوئے پیسوں کے ذریعے تینوں لوگوں کا خرچ چل رہا تھا۔ اسے کسی دوسرے کی مدد لینے کی عادت بھی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے جب اس نے اپنا پرانا مکان بیچنے کا ارادہ کیا تو نواب صاحب نے بھی سوچا کہ اتنے بڑے مکان کی ضرورت آخر کیا ہے؟

لکھنؤ چھوڑنے سے پہلے جب میں آخری بار کملا کے یہاں گئی تو اس نے بتایا کہ نواب صاحب غسل کر رہے ہیں۔ موہن لال کے ساتھ میں نے اس کی چائے میں شرکت کی۔

''کیا وہ اب بھی ہر شام باہر جاتے ہیں؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''ہاں!'' کملا نے بتایا تھا۔ وہ شام کو گھر میں نہیں بیٹھ سکتے۔ گھر میں رہنے سے ان کی اداسی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی باہر گھومنے پھرنے سے ان کی تندرستی ٹھیک رہتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ تم نے اپنی پڑھائی کیوں بند کر دی؟ تمھیں تو اب تک اونچی ڈگری مل جانی چاہیے تھی۔''

کملا گزری ہوئی باتوں کو یاد کر کے مسکرائی، بولی۔ ''تم بھی کیا سوچتی ہو؟ میں نے ڈگری لی ہے، وہ بھی آنرز۔ موہن لال کو میرے ساتھ بہت محنت کرنی پڑی۔ کاش! آج پاپا زندہ ہوتے تو انھیں کتنا اچھا لگتا۔''

میں سوچ رہی تھی کہ یہ اچھا ہی ہوا جو کملا کو اس حالت میں دیکھنے کے لیے وہ زندہ نہیں رہے۔ اس حالت میں اپنی پیاری بیٹی کو دیکھ کر کیا انھیں گہرا دکھ پہنچتا؟ تبھی نواب صاحب غسل کر کے باہر نکلے۔ بالکل صاف، سنورے اور چست درست! انھوں نے ٹاٹا کے لہجے میں اپنا ہاتھ ہلایا اور بتایا کہ کسی ضروری کام سے انھیں فوراً ہی کہیں جانا ہے۔ مہنگے پاؤڈر کلون کی خوشبو ہوا میں پھیلاتے ہوئے وہ گھاس بھرے راستے سے باہر نکل رہے تھے۔ لکھنؤ میں پرانے سیلون اب قریب قریب ختم ہو چکے تھے۔ شعر و شاعری اور ناچ گانا اب بھی شام کو تفریح کا ذریعہ تھے۔ لیکن بہت ہی کم لوگ اس طرف توجہ دے پاتے تھے۔ نواب صاحب ایسے ہی گنے چنے لوگوں میں تھے۔

مجھے لگا کہ مجھے کملا کی کوئی مدد کرنی چاہیے۔ پاپا میرے لیے کافی کچھ چھوڑ گئے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ کملا ان کی سب سے لاڈلی بیٹی تھی۔ اسی لیے میں نے کملا سے یہ کہنا چاہا کہ میرے پاس جو کچھ ہے اس پر اس کا بھی حق ہے۔ جانے سے پہلے میں نے اس سے پھر پوچھا۔ ''کیا کوئی ایسی بات ہے جو میں تمھارے لیے کر سکوں؟ اب میں تمھارے پاس جلدی جلدی آتی رہوں گی۔''

کملا میری بات سن کر اچانک مغموم ہو اٹھی۔ لگتا تھا، اس کے منھ سے لفظ ہی نہیں نکل پائیں گے۔ تبھی بے حد شرماتی ہوئی سی وہ بولی۔ ''ایک کام ضرور بتا سکتی ہوں۔ نواب صاحب کو جس طرح کے سگریٹ پسند ہیں ان کو خرید پانا میرے لیے ممکن نہیں لگتا۔ ان کے دام بھی یکا یک ہی چوگنا ہو گئے ہیں۔ اگر تم کبھی بھیج سکو تو...

''ہاں... ہاں... کیوں نہیں...'' میں نے جواب دیا تھا۔ پھر بولی تھی۔ ''لیکن کملا میں تو کچھ اور ہی دینا چاہتی تھی۔ کیا تمھیں اپنے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں؟''

اپنی آنکھوں میں ایک انوکھی سی چمک لاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ''پگلے! میرے پاس تو سب کچھ ہے۔''

میں ہاتھ ہلا کر اس سے رخصت ہوئی۔ نوکر رسوئی گھر کے باہر چائے کے برتن صاف کر رہا تھا اور شام کے اخبار کے صفحے آرام کرسی سے اڑ کر گھاس پر بکھر رہے تھے۔ کملا موہن لال کو ساتھ لے کر اندر جا چکی تھی۔

■

Shaista Fakhri, C-9, Radio Colony, Auckland Road, Allahabad - 211001 (UP

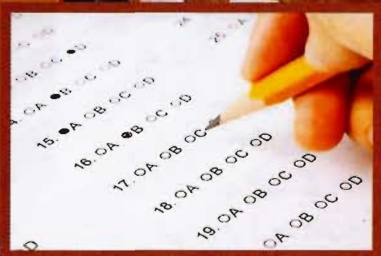

■ خورشید عالم

سول سروسیز

کے لیے نیا پیٹرن سی سیٹ

الائیڈ سروسیز یعنی ملک کے انتظام و انصرام سے متعلق سول سروسیز میں شامل ہونا ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر طلبہ کی لگن، محنت اور جستجو میں پوشیدہ ہے۔ ملک گیر سطح پر ہونے والی اس سروس کے تعلق سے دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دو مرحلوں میں ہونے والے اس امتحان کے لیے لاکھوں طلبا شریک ہوتے ہیں اور اپنی قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ چونکہ حکومت کا سارا دار و مدار اور انحصار، اسی سول سروسیز پر ہوتا ہے اس کے لیے وہ اس کے تئیں خصوصی اقدامات کرتی ہے اور وقتاً فوقتاً اس کے معیار کا جائزہ بھی لیتی رہتی ہے۔ گزشتہ دنوں سول سروسیز کے جائزہ پر مبنی آئی رپورٹ میں اس بات کا انکشاف کیا گیا کہ سول سروسیز کے حوالے سے طلبا میں ذہانت نہیں پروان چڑھ رہی ہے بلکہ ان میں رٹنے کی عادت عام ہو رہی ہے۔ جس کے سبب ان کی انتظامی صلاحیتوں پر اثر پڑ رہا ہے اور وہ کوئی ٹھوس فیصلہ لینے کے بجائے روایتی طریقوں یا لیٹ لطیف طرز عمل کو اختیار کرتے ہیں۔ اس سے انتظامی امور میں فعالیت متاثر ہو رہی ہے۔ اس جائزے میں صورت حال کا تجزیہ کر کے حکومت ہند کو اس ضمن میں مشورہ دیا گیا کہ وہ اس امتحان میں اپٹی ٹیوڈ ٹسٹ کو بھی شامل کرے تا کہ طالب علم کی بروقت فیصلہ لینے کی صلاحیت پروان چڑھ سکے اور ان میں رٹنے کے بجائے حالات و واقعات کو سمجھنے اور اس سے نمٹنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اس کے پیش نظر اس نے سول سروسیز میں کچھ بنیادی تبدیلیاں کی ہیں تا کہ طلبہ کو بدلتے زمانے و حالات کے مطابق کسی معاملے کو سلجھانے میں ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جاسکے۔

سول سروسیز کا ابتدائی امتحان اب سی سیٹ کے نام سے ہو رہا ہے اور اپٹی ٹیوڈ ٹسٹ کی شروعات کی جارہی ہے۔ اس سے طلبا کے درمیان مقابلہ آرائی کی سطح بڑھنے کی توقع ہے۔ ابھی تک کیٹ، جی میٹ اور ایم بی اے جیسے امتحانات میں ہی اپٹی ٹیوڈ ٹسٹ ہوتا ہے۔ اکثر اپٹی ٹیوڈ ٹسٹ کے تحت دو طرح کے سوال پوچھے جاتے ہیں۔ اسپیڈ ٹسٹ اور پاور ٹسٹ۔ اسپیڈ ٹسٹ میں سوالات سیدھے سیدھے ہوتے ہیں اور اس کا مقصد امیدوار کی اسپیڈ اور ایکوریسی دونوں کا امتحان لینا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں متعین وقت کے اندر سوالوں کو حل کرنا ہوتا ہے تو دوسری جانب پاور ٹسٹ میں سوالوں کی تعداد کم ہوتی ہے لیکن ان کا معیار کافی بلند ہوتا ہے۔

یونین پبلک سروس کمیشن نے سول سروسیز کے ابتدائی نصاب اور پیٹرن میں کئی تبدیلیاں کی ہیں جس کے بعد اسے سی سیٹ کا نام دیا گیا ہے۔ اپٹی ٹیوڈ ٹسٹ کے تحت امیدوار کو اب متبادل مضامین میں سے کسی ایک کا انتخاب نہیں کرنا ہوگا بلکہ اس کی جگہ پر سبھی طلبا کے عام مطالعے کے علاوہ اپٹی ٹیوٹ ٹسٹ کا ایک جیسا ہی امتحان ہوگا۔ ماہرین کے مطابق سی سیٹ کے لاگو ہونے سے طلبا کو سوالنامے میں اپنی صلاحیتوں اور کارکردگی کو بہت ڈھنگ سے جانچنے کا موقع ملے گا۔ بینک، ریلوے، ٹیچنگ وغیرہ کے مقابلہ جاتی امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ ایسے میں جو طالب علم پہلی بار آئی اے ایس (ابتدائی) امتحان دے رہے ہیں ان کو جنرل اپٹی ٹیوڈ ٹسٹ کے سوال نامے میں سہولت ہوگی۔

قابل ذکر ہے کہ سی سیٹ کی تجویز ڈاکٹر وائی کے الگھ نے سول سروسیز پر نظر ثانی کے تحت 2001 میں دی تھی۔ انھوں نے امتحان کے طریقۂ کار میں بڑے پیمانے پر تبدیلی کی سفارش کی تھی۔ انھوں نے ہی متبادل مضامین کے مقابلے یکساں مضامین کی بنیاد پر امیدوار کا امتحان لینے کی تجویز پیش کی تھی۔ سی سیٹ کے نصاب اور طریقۂ کار کو متعین کرنے کے لیے یونین پبلک سروس کمیشن (یو پی ایس سی) کے صدر پروفیسر ڈی پی اگروال نے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے سابق نائب صدر پروفیسر ایس کے کھنہ کی صدارت میں ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی تھی جس نے اپنی تجویز اپریل 2010 کے آخر میں پیش کی۔ اس

کی بنیاد پر ہی یو پی ایس سی نے سی سیٹ کے نصاب اور طریقۂ کار کو تجویز کیا ہے۔

تعلیمی ماہرین کے مطابق آئی آئی ٹی اور آئی آئی ایم کے امتحان میں اعلیٰ دماغ کا ہی انتخاب ہوتا ہے۔ سول سروسیز کا ابتدائی امتحان اس معاملے میں کھرا نہیں اتر پارہا تھا۔ کوئی بھی امتحان تبھی بہتر اور معیاری مانا جاسکتا ہے جب اس میں شریک ہونے والے طلبا کو ایک ہی ترازو سے تولا جائے۔ آئی اے ایس کے ابتدائی امتحان میں پہلے جی ایس (جنرل اسٹڈیز) کے علاوہ متبادل مضامین کا انتخاب کرنا پڑتا تھا۔ سبھی متبادل مضامین کا نصاب الگ الگ ہوتا تھا۔ اس کی وجہ سے کوئی اچھا اسکور کرلیتا تو کوئی سخت محنت کے بعد بھی کامیاب نہیں ہوپاتا۔ اس سے طلبا کی صلاحیتوں کا تجزیہ نہیں ہوپارہا تھا۔ سی سیٹ کا نصاب اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ اس سے بہتر امیدوار کا انتخاب آسان ہوگیا ہے۔

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ کسی بھی امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے خوداعتمادی بہت اہم ہوتی ہے لیکن آئی اے ایس کا امتحان پاس کرنے میں اس کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہوتی ہے۔ اس امتحان میں شریک ہونے کے لیے ایک طالب علم کو چار مواقع ملتے ہیں اور آخری موقع میں بھی اس کا انتخاب ہوسکتا ہے بشرطیکہ اسے خود پر اعتماد ہو اور پرانی غلطیوں سے سبق لے کر سخت محنت کرنے کا جذبہ ہو۔ اگر اس امتحان میں پاس ہونے والے ٹاپ 25 طلبا کی بات کریں تو ان میں 9 طلبا ایسے ہیں جنھوں نے تیسرے مرحلے میں یہ امتحان پاس کیا ہے۔ وہیں چار امیدواروں نے اپنے دوسرے مرحلے میں اس کامیابی کو حاصل کیا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ طالب علم ذہنی طور پر مضبوط رہتے ہوئے ناکامی کے خوف کے بغیر اپنا ہدف حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

آئی اے ایس امتحان کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ یہ قسمت کا کھیل ہے۔ ہر سال 3 لاکھ امیدوار آئی اے ایس بننے کے لیے امتحان میں شریک ہوتے ہیں۔ اس لیے آئی اے ایس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ امیدوار 100 رینک کے تحت آئے۔ زیادہ تر، امتحان میں پہلے 30 سے 40 رینکوں کے امیدوار تقریباً سبھی نمبر حاصل کرتے ہیں جب کہ ایک غلط جواب امیدوار کو اس دوڑ سے باہر کردیتا ہے۔ ایک سوال نامے کو تین بار حل کرنے کی مشق سے اچھا گریڈ بنانے کے لیے مناسب موقع حاصل ہوجاتا ہے۔

آئی اے ایس امتحان کے ذریعے ملک کی اعلیٰ ترین بیوروکریسی کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ ملک کا کٹھن امتحان مانا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس میں الگ الگ بیک گراؤنڈ کے طالب علم شامل ہوتے ہیں اور اعلیٰ دماغ کا انتخاب کرنے کے لیے تین مرحلوں بشمول انٹرویو امتحان لیتی ہے۔ ان تین مرحلوں میں اچھی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے والے طالب علم کا آخر میں انتخاب ہوتا ہے۔ پروفیشنل امیدوار زیادہ کامیاب ہوتے ہیں، گو کہ اس امتحان میں صرف گریجویشن کی ڈگری مانگی ہے لیکن اس میں پروفیشنل ڈگری والے طالب علم کافی تعداد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ٹاپ 25 پوزیشن پر آنے والے امیدواروں کے بیک گراؤنڈ کو

سی سیٹ 2013 کے امتحان میں دو پیپر ہوں گے اور دونوں میں پیپروں کے نمبر 200 اور وقت 2 گھنٹے متعین کیا گیا ھے۔ دونوں میں پیپروں کے لیے یکساں سوال نامے ہوں گے نیز جی ایس اور اپٹی ٹیوڈ ٹسٹ میں یکساں نمبروں کا نظم ھے۔ اسی کے ساتھ نگیٹو مارکنگ بھی ھے۔ جہاں تک اس کے نصاب کا سوال ھے۔ اس سلسلے میں یونین پبلک سروس کمیشن کے ذریعے جاری نصاب میں امیدوار کے لیے بنیاد ھے جس کی روشنی میں امیدوار اپنی تیاری کرسکتا ھے۔

دیکھنے سے صاف اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان 25 پوزیشن پر آنے والے امیدواروں میں 20 مقام پروفیشنل کے نام رہے ہیں۔ جس میں قریب 15 طلبا انجینئرنگ گریجویٹ اور پانچ میڈیکل بیک گراؤنڈ سے ہیں۔ اس امتحان کی تیاری میں لگنے والا لمبا وقفہ اور اس سے جڑی دیگر غیر یقینی کیفیت کے چلتے اب اس میں بیٹھنے والے طالب علم پہلے خود کو اقتصادی طور پر خودکفیل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ویسے اس امتحان میں کافی تعداد میں نان پروفیشنل امیدوار بھی کامیاب ہوتے ہیں لیکن اگر طالب علم کے پاس ایک کیریئر بطور متبادل رہے گا تو ناکامی کے باوجود بے روزگاری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

سی سیٹ 2013 کے امتحان میں دو پیپر ہوں گے اور دونوں میں پیپروں کے نمبر 200 اور وقت 2 گھنٹے متعین کیا گیا ہے۔ دونوں میں پیپروں کے لیے یکساں سوال نامے ہوں گے نیز جی ایس اور اپٹی ٹیوڈ ٹسٹ میں یکساں نمبروں کا نظم ہے۔ اسی کے ساتھ نگیٹو مارکنگ بھی ہے۔ جہاں تک اس کے نصاب کا سوال ہے۔ اس سلسلے میں یونین پبلک سروس کمیشن کے ذریعے جاری نصاب میں امیدوار کے لیے بنیاد ہے جس کی روشنی میں امیدوار اپنی تیاری کرسکتا ہے۔

اس امتحان میں اہم مقام پانے والی ایس دویا درشنی مانتی ہیں کہ سی سیٹ کے بدلے پیٹرن سے طالب علم کو کافی فائدہ ہوگا اور یہ سبھی طالب علم کو یکساں مقابلے کا موقع دے گا۔ سی سیٹ بہتر تجربہ ثابت ہوگا اس سے امیدوار کی صلاحیتوں اور کارکردگی کو بہتر انداز سے جانچا پرکھا جاسکے گا۔ اس لیے اس پیٹرن سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی تبدیلی بہتری کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے تبدیلی کو خوش آمدید کہنا چاہیے اور اسی کے مطابق خود کو ڈھال لیں تو سی سیٹ قطعی طور پر ہوّا نہیں رہے گا۔ یاد رکھیں مسائل سب کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن ان سے نبرد آزما ہونے اور اس سے نکلنے کی صلاحیت اگر طالب علم میں ہے تو اس امتحان میں کامیابی آپ کی منتظر ہے۔ کوئی بھی مسئلہ ہمیشہ نہیں رہتا۔ شرط امیدوار کی لگن، محنت اور مستقل مزاجی کی ہے۔

اس امتحان کا ایک اہم اور آخری پڑاؤ انٹرویو پر مبنی ہوتا ہے۔ اس میں جہاں خوداعتمادی اور باڈی لینگویج کو دیکھا جاتا ہے۔ وہاں آنکھوں کا رول بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ آنکھ انسان کی چغلی کھاتی ہے۔ اس کو اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر امریکی صدر براک اوبامہ دھوپ کا چشمہ پہن کر بولتے ہیں تو ان کی آنکھیں دھوپ کے اندر چھپی رہتی ہیں صرف باڈی لینگویج نظر آتی ہے اس سے یقینی طور پر ان کی تقریر کا اثر آدھا ہوجائے گا۔ یہ بات بھی کم اہم نہیں ہے کہ انٹرویو ختم ہونے کا مرحلہ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا انٹرویو کے لیے میٹنگ ہال میں داخل ہونے کا ہے۔ حقیقت میں، انٹرویو کے بعد میٹنگ ہال سے باہر زیادہ اہم ہوتا ہے۔ کیونکہ امیدوار جیسے ہی انٹرویو سے فارغ ہوکر ہال کے باہر آتا ہے، بورڈ کے ممبران امیدوار کی خوبیوں اور خامیوں پر گفتگو شروع کردیتے ہیں۔ اس لیے میٹنگ ہال سے رخصت ہوتے وقت ضروری ہے کہ چہرہ کسی بھی طرح کے تناؤ سے خالی ہو اور بورڈ ممبران کا شکریہ ضرور ادا کریں۔

■

Khursheed Alam,666/12, Zakir Nagar, New Delhi - 110025

عبدالقادر صدیقی

سینما میں مردانہ بصری تسکین کا تصور

ایک تانیثی جائزہ

لارا ملوی Laura Mulvey نے اپنے مضمون "Visual Pleasure and narrative cinema 1975 " میں تانیثیت Faminisit کی دوسری لہر کے فلمی تانیثی تصور Male Gaze یا مردانہ بصری تسکین کو بحیثیت لاتماثل Asymmetry خصوصیت کے متعارف کرایا تھا۔ یہ تصور بصری تسکین یا Gaze کے ابتدائی مطالعہ میں موجود تھا۔ لیکن ملوی نے اسے نسوانی مسئلہ کے تحت صفِ اول میں لا کھڑا کر دیا۔ Mulvey نے کہا کہ خواتین فلموں میں Objectified ہوتی ہے کیونکہ Heterosexual مرد فلم کی کہانی ، ڈائیلاگ اور نغمے لکھتا ہے، ڈائرکٹ کرتا ہے اور فلمی کیمرہ کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس طرح فلموں میں خواتین کی شرکت استراق النظر (Voyeurism) اور Scopophilia کا ماڈل پیش کرتی ہیں۔ (Practice of looking : 2001, p76) اس تصور نے فیمنسٹ فلمی نظریات اور میڈیا اسٹڈی پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس تصور کے مطابق میڈیا میں Male Gaze اس وقت ہوتا ہے جب کیمرہ Hetrosexual مرد ناظرین کے مطابق خواتین Telent کے جسم پر فوکس ہوتا ہے۔ یہ ایک خاتون کے جسم کے منحنی یا Curves خطوط پر دیر تک فوکس رہ سکتا ہے بطور مثال کے فلم میں ایک خاتون کو شہوانی تلذذ پہنچانے والی شئے کے طور پر اکثر دو مختلف سطحوں پر ظاہر کیا جاتا ہے۔ پہلے فلم میں کام کرنے والے مرد کردار کے لیے اور پھر اس طرح سے مرد ناظرین کے لیے جو فلم دیکھتے ہیں۔ خواتین مرد کی جانب سے غیر فعال (Passive) سے فعال Gaze(Active) بنتی ہیں۔ یہ اضافی عناصر پدرسری Patriarchal نظام کے طور پر اکثر داستانی (illusionistic) فلم میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (p.14 Mulvey1975.) ملوی دلیل دیتی ہیں کہ مین اسٹریم سینما میں Male gaze یا مردانہ بصری تسکین عام طور پر زنانہ بصری تسکین یا Female gaze پر مقدم ہے۔ جو پدرسری نظام کے ایک بنیادی لاتماثل asymmetry طاقت کی عکاسی کرتا ہے۔ mulvey کا مضمون یہ بھی کہتا ہے کہ زنانہ بصری تسکین یا Female gaze بھی مردانہ بصری تسکین (Male gaze) کی طرح ہی ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواتین بھی خود کو مرد کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ مردانہ بصری تسکین یا male gaze کو غیر مساوی طاقت کے مظہر کے طور پر دیکھے جانے والے (Gazed) اور دیکھنے والے (Gazer) کے درمیان ہوش و حواس یا نا خود آگہی عدم مساوات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے تحت جو خاتون خود نمائی (Objectifying) یا Gazel کا استقبال کرتی ہیں ہو سکتا ہے کہ آسانی سے مرد کو جنسی تلذذ پہنچا رہی ہیں۔ اس طرح کے استقبال کو کسی نمائش یا Exhibitionism کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ فلموں میں ہیروئن کی پیشکش ہوتی ہے۔ خواہ جنسی جذبات بھڑکانے کے لیے ہو یا ڈر، خوف، کو دکھانا ہو یا پیار محبت جتانا ہو۔ وہ ہیرو کی حوصلہ افزائی کرے یا اس کی کمزوری بن جائے کوئی معنی نہیں رکھتا ہے کیوں یہ سب ہیرو کے مطابق ہوتا ہے وہ جس طرح سے چاہتا ہے اس طریقے سے ہیروئن کی پیشکش ہوتی ہے۔ خود خواتین کی فلم میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔

Who count is what the heroine provokes and rather what she represents. She is the one or rather than love of fear she inspire in the hero or, else the concern He feels for her, who makes him act the way he does in herself the women has not the importance (Quoted by mulvey ,film& feminism , jasbir jain & Sudharaj p.52)

اس میں یہ نکتہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ فلموں میں اسکرین پر جو کہانی دکھائی جاتی ہے وہ مردوں کے نقطہ نظر سے ان کے انتقام، Ego، خواہش Ambition پر ہوتی ہے۔ ڈراما ہو یا ٹریجڈی ہیروازم Heroism اس میں مقدم ہوتا ہے۔ جب کہ خواتین کی پیشکش اس کے سپورٹنگ ایکٹر کے طور پر بحیثیت معشوقہ کے یا دیگر کردار جیسے ماں، بہن، بھابھی کے طور پر ہوتی ہے۔ یہ تلاش کرنا بہت مشکل ہوتا ہے جب کوئی فلم صرف اور صرف خواتین کے نقطہ نظر سے بنی ہو اور اس کے مسائل کے ارد گرد گھومتی ہو۔ مردانہ بصری تسکین یا Male gaze کے نظریاتی

تصورات کو John Berger کی تحقیق "Ways of Seeing" میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔جان برجر نے سب سے پہلے مردانہ بصری تسکین کے نظریہ کو اپنی مذکورہ تخلیق میں پیش کیا اور 'دیکھنے' یا Seeing کی تعریف کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اور جو کہتے ہیں اس میں دیکھنے اور تسلیم کرنے کا معاملہ الفاظ سے قبل آتا ہے۔ جیسے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا ایک مقام ہے جہاں ہم رہتے ہیں، پھر اس کی وضاحت کے لیے ہم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔لیکن بعض اوقات ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اور جو کچھ جانتے ہیں ان میں فرق ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سورج زمین کے اطراف گردش کر رہا ہے لیکن اس کے برعکس ہم جانتے ہیں کہ زمین سورج کے اطراف چکر لگا رہی ہے۔ Berger اس مثال سے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ آئل پینٹنگ میں خواتین کی تصاویر بنائی گئی ہے اور جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس کے دیکھنے اور سمجھنے میں بہت فرق ہے۔ اس کے مطابق تصویر ایک نظر یا سائٹ ہے جس کا رشتہ اس کے بنانے والے سے ہے کہ وہ اسے کس نقطہ نظر اور زاویہ سے دیکھتا ہے۔ہم جب کسی تصویر کو دیکھتے ہیں تو یہ ہمارے دیکھنے اور سمجھنے کے نظریہ پر منحصر ہوتا ہے۔(Ways of Seeing, pg,9) اگر ہم ماضی کے آئل پینٹنگ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں آرٹ میں ایسی تصاویر دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔لیکن آرٹ کی شعبدہ بازی ہمیں تصویر کی اصلیت کو سمجھنے سے روکتی ہے۔ بالآخر مرد اداکاری کرتا ہے عورت کی نمائش ہوتی ہے، مرد اسے دیکھتا ہے اور وہ خود کو دیکھتی ہے جیسے کہ وہ دیکھنے والی شئے ہو اور یہی عمل اسے ایک شئے یا object بناتی ہے۔

He acts, she appears and she watches herself being looked at. The surveyor of women in herself is male the served female. Thus she turns herself in to an object of vision a sight (Way of seeing,p.47)

برجر کے مطابق یورپی پینٹنگ کے ایک زمرے میں عورت مرکزی موضوع رہی ہے۔ Nude تصویروں سے پتا چلتا ہے کہ خواتین کس طرح سے دیکھی جاتی ہیں۔ وہ مثال دیتا ہے کہ فرض کیجیے کسی جنگل میں مرد اور خاتون کا ایک جوڑا ہے اور دونوں ہی بے لباس ہیں۔ دونوں اپنا شکم بھرنے کے لیے سیب کے پیڑ کے پاس جاتے ہیں۔ عورت درخت سے سیب توڑ کر جب مرد کی جانب بڑھاتی ہے اور مرد اسے لینے کے لیے اس کی جانب ہاتھ بڑھاتا ہے اور اسے دیکھتا ہے تو اس کی نظر سیب کے بجائے اس کے مادرزاد جسم پر پڑتی ہے اور وہیں چپک جاتی ہے، اس طرح خواتین کا جسم آدمی کے لیے مردانہ بصری تسکین یا Male-Gaze بن گیا۔ اس کہانی میں سب سے پہلے جب وہ دونوں سیب لینے کے لیے ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہیں تو یہ تن دیکھنے کا زاویہ تھا اور پھر دوسرا یہ کہ اس کے بعد اس Male Gaze کی وجہ سے (یعنی خواتین کا جسم دیکھنے کے لیے ہے) خاتون مجرم ٹھہری اور مرد کو اس

پر مسخر کر دیا گیا۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے قبل درمیانی زمانے میں برہنہ ہونا یا Nakedness قابل شرم بن گیا تھا۔لیکن نشاۃ ثانیہ کے بعد شرم آئل پینٹنگ میں نظر آنے لگی جو آہستہ آہستہ ڈسپلے کی ایک قسم بن گئی، یہاں تک کہ جب oilpainting میں سیکولر مضامین کو استعمال کیا جانے لگا تو نتیجہ یہ نکلا کہ خواتین اس لیے Naked نہیں ہو رہی تھیں کہ یہ ان کا حق ہے بلکہ وہ ایسا اس لیے کر رہی تھیں کہ یہ مرد کی چاہت تھی۔ (ways of seeing, p.49) آئیل پینٹنگ میں آئینہ کا استعمال اکثر خواتین کی خودنمائی اور حسن مغروریت کو دکھانے کے لیے بطور علامت (symbol) کے استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ آدمی کی اخلاقی منافقت ہے کہ وہ ایک مادرزاد ننگی خاتون کی تصویر پینٹ کرتا ہے کیونکہ وہ اس کو دیکھ کر جنسی تلذذ حاصل کرنا چاہتا ہے اور اسے خاتون کے حسن کا غرور یا خودنمائی (Vanitly painting) کا نام دینے کے لیے اس کے ہاتھ میں آئینہ تھما دیتا ہے یا پھر اسے آئینہ کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے (ایسی پینٹنگ کی کچھ مثال سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کے ویسٹرن گیلاری میں بھی دیکھی جا سکتی ہے) تا کہ اسے خودنمائی کا نام دے کر خود کو بچا سکیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اس (مرد) نے خود اپنی خوشی اور آسودگی کے لیے کیا ہے۔

Hypocritical You painted a naked woman because you enjoyed looking at her. You put a mirror in her hand and you called the painting vanity. Thus morally condoning the woman whose nakedness you had depicted for your own pleasure (Ways of Seeing,pg 51)

برجر اس نقطہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سماج میں مرد کی صلاحیت اس کی طاقت اور اثر و رسوخ سے پیمائش کی جاتی ہے یہ طاقت مختلف شکلوں میں ہو سکتی ہے جیسے جسمانی قوت، معاشی قوت، سماجی حیثیت وغیرہ۔ اس لیے سماج میں مرد کی موجودگی کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ کیا کرنے کے قابل ہے اور کیا کرنے کے قابل نہیں ہے۔اس کے برعکس ایک خاتون ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے اور کیا نہیں کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کا انحصار مرد پر ہوتا ہے۔ وہ مردوں کی غلبہ والے سماج کی نگرانی میں پیدا ہوتی ہے اور اسے بچپن ہی سے اپنے تئیں جانچنا پرکھنا سکھایا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر اس کا وجود دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ Serveyed اور Seveyor آخر اپنا احساس دوسرے احساس کی سراہنا حاصل کرنے کے لیے تبدیل ہو جاتا ہے۔

برجر (Berger) کے اس نظریہ کو Mulvey نے فلموں میں خواتین کی جنسی شئے کی حیثیت سے پیش کی ہے۔ جہاں ہیرو کے ساتھ ہیروئن ہیرو کو جنسی آسودگی پہنچانے کے لیے اور پھر ناظرین (مرد) کو جنسی تسکین پہنچانے کے لیے پیش کی جاتی ہے۔اس میں کیمرہ کے ذریعے مختلف زاویے سے خواتین کے نسوانی عضو کو فوکس کر کے اس کی جنسی شبیہ Sexual image پیش کی جاتی ہے۔ مرد کردار کا Gaze خواتین کی توجہ حاصل کرتا ہے، ایسے ہی خواتین کا Gaze مرد کو متوجہ کرتا ہے۔لیکن کسی بھی فلم، اشتہار، Reality Show اور TV سیریلس میں یا نیوز میں خواتین کی پیش کشی Male Gaze کے

مطابق کی جاتی ہے۔ Luara Mulvey لکھتی ہیں ''عورت دو حیثیت سے اپنی کارکردگی پیش کرتی ہیں، پہلا ناظرین کو جنسی تلذذ پہنچانے کے لیے اور دوسرا ساتھ کام کرنے والے مرد کرداروں کو جنسی تسکین پہنچانے کے لیے''۔ عریانیت یہاں پر اہمیت کی حامل ہے جو کہ مرد کو نظارہ کے لیے دعوت دیتی ہے۔ یہ تصور مرد عورت تک ہی نہیں جانور تک پر محیط ہے کیونکہ کمرشیل اشتہار میں بعض اوقات وہ بھی خواتین کے پرکشش جسم کے ناظر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ آسٹریلیا کے Optus-3G موبائل نیٹ ورک کے اشتہار میں ایک زراف کو دکھایا جاتا ہے جو راستہ بھول جاتا ہے۔ وہ اپنی لمبی گردن اٹھا کر ایک رہائشی اپارٹمنٹ کے کسی کمرہ میں جھانکتا ہے جہاں ایک لیڈی تنہائی میں اپنا لباس تبدیل کر رہی ہوتی ہے اور صرف بکنی پہنے ہوتی ہے۔ زراف پوچھتا ہے : Would you please tell me where I am ? زراف کو دیکھ کر وہ لیڈی چیخ مارتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے اپنے ستر کو چھپا کر دوسرے کمرہ کی طرف بھاگتی ہے۔ خاتون کا یہ ردعمل بالکل ویسا ہی ہوتا ہے جیسے اگر کوئی اجنبی مرد اسے اس حالت میں دیکھتا اور اس کا جو ردعمل ہوتا۔ اس طرح اس اشتہار میں ایک جانور کو Male Gaze کی جگہ پیش کیا گیا ہے۔
(http://www.youtube.
fa5rmSWdVs)com/watch?v=P

بالی ووڈ میں خواتین کی مردانہ بصری تسکین Male Gaze کی پیشکش

کسی بھی فلم یا TV پروگرام میں جب کسی ہیروئن یا خاتون Portagonist کی Entry ہوتی ہے یا مرد کردار پہلی بار خاتون کردار کی جانب دیکھتا ہے تو یہ موقع بڑا ہی عجیب ہوتا ہے۔ پہلے ایکشن اور میوزک کے ذریعے منظر اور پس منظر تیار کیا جاتا ہے۔ ہیرو اپنی آنکھ سے چشمہ نکالتا ہے اور ہیروئن کی کی آنکھ، ٹانگ، زلف اور ہونٹ دیکھ کر کہتا ہے ''کیا دیکھتی ہے''، مثلاً فلم پھول اور کانٹے میں ہیروئین مدھو اور فلم کچھ کچھ ہوتا ہے میں رانی مکرجی کی انٹری اور حالیہ فلم 'جب تک ہے جان' اور 'مٹرو کی بجلی کا من ڈولا' میں ہیروئن انوسکا شرما کی انٹری کو آپ دیکھ کر اس male gaze یا مردانہ بصری تسکین کے تصور کو سمجھ سکتے ہیں جس میں سب سے پہلے ہیروئن کی ننگی ٹانگ، کولھا، سینہ، hip، bust اور پھر لب و رخسار اور چہرے پر کیمرہ Traveling ہوتا ہے اور مرد ناظرین کو جنسی تسکین پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ Audience gaze کردار کو اس سے قریب کرتی ہے اور اس کے برعکس اداکارہ Actress gaze ناظرین کو کردار کے قریب کرتا ہے (Films feminism P-53) خواتین کردار کی پیشکش بالخصوص آئٹم گانے میں ایک شئے (Object) کی طرح ہوتی ہے جس کا مقصد فلم کے پروموشن کے لیے ناظرین کو اس جانب راغب کرنا ہوتا ہے اس طرح تجارتی اغراض کے تحت Items song میں خواتین کی پیشکش سراپا Male gaze کے طور پر ہوتی ہے جیسے فلم 'خوددار 1994' میں کرشمہ کپور کا نغمہ Sexy sexy مجھے لوگ بولے، ایسے ہی 'فلم جانور 2001' میں 'انگوری انگوری'، فلم دبنگ 2011 میں 'منی بدنام ہوئی'، فلم تیس مار خان میں 'مائی نیم از شیلا، شیلا کی جوانی' اور فلم 'اگنی پتھ' 2012 میں 'چکنی چمیلی'، وغیرہ۔ اس طرح کے نغموں میں خاص طرز کے کاسٹیوم اور میک اپ میں خواتین کو پیش کیا جاتا ہے اور مخصوص زاویوں سے کیمرہ کا استعمال خواتین کے نسوانی اعضا پر مردانہ بصری تسکین یا male gaze کے نظریہ سے ہوتا ہے۔ اس طرح کے نغموں میں اداکارہ کی حرکات و سکنات اور اسے ایک Spectacle میں تبدیل کر دیتا ہے جس میں آنکھ، ہونٹ، کولھا، سینہ، لب و رخسار مرد ناظرین کے لیے بصری تسکین gaze کا سامان فراہم کرتے ہیں اور خواتین اداکارہ مکمل طور پر ایک Sexual object نظر آتی ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مشہور فلمی اداکارہ اور سماجی کارکن شبانہ اعظمی اس طرح کی پیش کش کے خلاف ہیں وہ محسوس کرتی ہیں کہ فلموں میں کام کرنے والی خواتین کو چاہیے کہ سماج میں زندگی گذارنے والی خواتین کے طرز زندگی اس کی حرمت اور وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کام کرے۔ یہ کوئی معنی نہیں رکھتا کہ وہ کس status سے تعلق رکھتی ہیں۔ شبانہ اعظمی کا کہنا ہے کہ فلموں میں ہاتھ میں بندوق پکڑ نے، کراٹے دکھانے کا مطلب مرد کی برابری نہیں ہے، فلموں میں جس طرح سے ہیروئن خود کو پیش کرتی ہیں وہ مجھے فکر مند بنا رہی ہے۔ فلموں میں جسم کی نمائش کرنے والی ہیروئن کہتی ہیں کہ وہ اپنی جنسی کشش کے ذریعہ وہ شہرت حاصل کر رہی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں ان سے پہلے خود کو اس (جسمانی نمائش) کے مطابق پیش کرتی ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری ہیروئن male gaze کے لیے خود کو سپرد کر دیتی ہیں۔

ہندوستان میں Rexx اور دیگر پرفیوم اور کئی انڈر گارمنٹس کے اشتہار اسی قبیل کے ہوتے ہیں۔ جس میں خواتین کو بطور Male-Gaze کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ کرکٹ میچ، فٹبال میچ، یا دیگر بین الاقوامی کھیل کے دوران، چیئر لیڈرس cheerleaders کی پیش کش مردانہ بصری تسکین Male-gaze کے زاویے سے ہوتی ہے۔ خواتین کی اس طرح کی پیش کش سے سوسائٹی اور بالخصوص مردوں میں خواتین کے تعلق سے منفی رجحان پنپتا ہے اور پدرسری کے اس تصور کو تقویت ملتی ہے کہ خواتین کی ذات مردوں کی جنسی ہوس پوری کرنے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔ اس طرح کی سوچ سماج میں حاشیہ نشیں خواتین کی خود مجازیت اور ترقی میں بڑی رکاوٹ ہے۔

ماخذ:

Visual Pleasure and Narrative Cinema (1975) - Laura Mulvey
Originally Published - Screen 16.3 Autumn 1975 pp. 6-18
http://www.jahsonic.com/VPNC.html
Karen Boyle, Media and Violence 2005, Sage publication,London,New Delhi
Practice of looking:2001. and introduction of visual oxford University press.in

■

Abdul Qadir Siddiqui, Research Scholar, M.Phil, Dept Taleeme-Niswan, Room No. 107, Boys Hostel, MANUU, Telecom Nagar, Gachchi Bowli, Hyderabad -500032 (AP)

ماحولیاتی آلودگی...

ایک بڑا مسئلہ

سمیع الدین خاں 'شاداب'

پانچ(5) جون پوری دنیا میں یومِ ماحولیات کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس دن دنیا بھر میں ماحول کو درست رکھنے اور آلودگی سے تمام کرۂ ارض کو پاک رکھنے کی تراکیب پر غور و فکر کیا جاتا ہے۔ ہماری زمین، ہمارے رہنے کی جگہ، ہمارے چاروں طرف کا ماحول، ہوا، پانی، مٹی ہمیں قدرت نے جس طرح سونپی ہے وہ ہماری زندگی کے لیے مناسب ترین جگہ و ماحول ہے۔ سطحِ سمندر سے تقریباً 8 کلومیٹر گہرائی تک اور 6 کلومیٹر اونچائی تک مختلف جاندار (جن میں پیڑ پودے اور جرثومے بھی شامل ہیں) پائے جاتے ہیں۔ اس حصے کو Biosphere کہا جاتا ہے۔ عام حالات میں یہاں تمام عناصر ایک خاص توازن اور تناسب میں جس طرح موجود ہوتے ہیں وہی توازن و تناسب ایک صحت مند زندگی کے لیے از حد ضروری ہے۔

لیکن ہوا، پانی، مٹی یعنی ہمارے اطراف کے ماحول میں جب توازن و تناسب و تبدل ہونے لگتا ہے تو اس کے برے اثرات زمین پر رہنے والے جانداروں اور نباتات کو متاثر کرتے ہیں تو اس عدم توازن کی حالت کو ہی ماحولیاتی آلودگی (Environmental pollution) کہتے ہیں۔ یہ ماحولیاتی آلودگی کئی طرح کی ہو سکتی ہے، مثلاً ہوائی آلودگی، میں بھی اضافہ ہوا ہے اور اب تو یہ آلودگی نہایت خطرناک رُخ اختیار کر چکی ہے۔ ہوا، مٹی، پانی آلودہ ہو کر عام آدمی کی صحت کو بُری طرح متاثر کر رہے ہیں اسی آلودگی کی وجہ سے عالمی اضافہ حرارت یعنی گلوبل وارمنگ (Global Warming) کا خطرہ بھی پیدا ہوا ہے جس سے زمین پر موسم کا توازن تیزی سے بگڑ رہا ہے حالانکہ سرکاری سطح پر آلودگی کی روک تھام کی ملکی و عالمی کوششیں جاری ہیں لیکن وہ ناکام ہیں۔ شاید ہم ابھی اس آلودگی کے تئیں زیادہ سنجیدہ نہیں ہیں۔

زندہ رہنے کے لیے سب سے پہلی ضرورت ہے 'ہوا' ہماری زمین پر قدرت نے ہوا کو مختلف گیسوں کے مرکب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس مرکب میں نائیٹروجن کی مقدار سب سے زیادہ یعنی 78 فی صد موجود ہے۔ آکسیجن تقریباً 71 فی صد اور کاربن ڈائی آکسائڈ 0.03 فی صد ہوتی ہے، باقی ماندہ دوسری گیسیں بہت قلیل مقدار میں ہیں۔ تمام جانداروں اور پیڑ پودوں کو زندہ رہنے کے لیے جو حیاتیاتی عمل اور تال میل ہوتا ہے وہ نہ صرف اس قدرتی تناسب کو بگڑنے نہیں دیتا بلکہ وہ اس قدرتی تناسب او توازن کو قائم رکھنے میں مددگار بھی ہے۔

لیکن جب کچھ وجوہات سے گیسوں کا یہ تناسب بدل جاتا ہے اور ان کی مقدار میں کمی بیشی ہو جاتی ہے تو اسی کیفیت کو ہوائی آلودگی (Air Pollution) کہا جاتا ہے۔ ہوائی ذخیرے کی قدرتی بناوٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے غیر قدرتی ڈھنگ سے برتاؤ کرنے پر طرح طرح کی زہریلی گیسیں، کاربن، دھواں، اور مختلف دھاتوں کے مہین ذرّے ہوا میں مل جاتے ہیں۔ پٹرول کی صفائی کرنے والے کارخانے، کھاد سیمنٹ، کاغذ، شکر، کانچ وغیرہ بنانے والے کارخانوں سے ہائیڈروجن سلفائڈ (H_2S)، گندھک، کاربن اور نائٹروجن کے مختلف آکسائڈ اور کئی طرح کی گیسوں کا بڑی مقدار میں اخراج ہوتا رہتا ہے۔ ریل گاڑیوں، موٹروں، ٹرکوں وغیرہ میں کوئلہ، پٹرول، ڈیزل جیسے ایندھن جلتے ہیں جن سے نائٹروجن اور کاربن کے کئی آکسائڈ بنتے ہیں اس کے علاوہ ان سے خارج ہونے والے دھوئیں میں سیسہ، کیڈمیم، جستہ وغیرہ کے ذرّات ہوتے ہیں جو ہوا کو آلودہ کرتے ہیں۔ ایک ٹن کوئلہ جلانے سے 5 سے 10 کلوگرام تک نائٹروجن کے مختلف آکسائڈ [خاص طور سے نائٹرس آکسائڈ (N_2O)] بنتے ہیں اور موٹر کار، بس، ٹرک، اسکوٹر وغیرہ میں ایک ٹن ڈیزل جلنے پر 25 سے 30 کلوگرام نائٹرس آکسائڈ (N_2O) اور اِس جیسی کئی گیسیں پیدا ہوتی ہیں۔

گندھک کے آکسائڈ (بالخصوص سلفر ڈائی آکسائڈ SO_2) نمی کے ساتھ مل کر گندھک کا ہلکا تیزاب بناتے ہیں جو جانداروں کے نظامِ تنفس پر بہت برا اثر ڈالتا ہے اور پھیپھڑوں کے لیے نہایت نقصان دہ ہے۔ یہ پھیپھڑوں کے کینسر کے لیے بھی ذمے دار ہے۔ کاربن کے آکسائڈوں میں کاربن مونو آکسائڈ (CO) خون کے سرخ ذرّات (ہیموگلوبین) کو تباہ کر دیتا ہے اس کی وجہ سے جسم میں آکسیجن کی سپلائی میں کمی آجاتی ہے۔ اس سے دماغ کی صلاحیتوں پر سب سے برا اثر پڑتا ہے۔ نائٹروجن کے آکسائڈ انسانی جسم کی قوتِ مدافعت کو کم کرتے ہیں جس سے بیماریوں سے حفاظت کرنے کی قدرتی قوت کم ہونے لگتی ہے اور انسان جلد جلد بیمار پڑنے لگتا ہے۔ ہوا میں موجود نائٹروجن کے آکسائڈ کی زیادتی سے ہونٹوں کا پھٹنا، مسوڑھوں کا ورم، موتیابند اور مختلف امراضِ چشم، آکسیجن کی کمی سے نمونیہ اور پھیپھڑوں کا کینسر جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں۔

اوزون (O_3) جو ہماری زمین کی حفاظت کا کام کرتی ہے اس کی ہوا میں زیادتی سے آنکھوں اور سینے کے امراض ہوتے ہیں۔ کیڈمیم سے امراضِ قلب بڑھتے ہیں دیگر زہریلی گیسیں بھی کینسر، ٹی بی، اور نظامِ تنفس کی خرابیوں کو جنم دیتی ہیں۔

جاپان کا دارالحکومت ٹوکیو کاربن ڈائی آکسائڈ (CO_2) سے امریکہ اور جرمنی کے مختلف شہر سلفر ڈائی آکسائڈ (SO_2) سے بری طرح آلودہ ہیں۔ ہندوستان میں کولکاتا، ممبئی، کان پور، دہلی وغیرہ بڑی آبادی والے شہر بھی ہوائی آلودگی سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ان ہندوستانی شہروں کی ہوا میں تو دھول کی مقدار دنیا کے کئی بڑے شہروں جیسے لندن اور نیو کارک سے بھی زیادہ ہے۔

تیز رفتار زندگی جن پہیوں پر سوار ہو کر ترقی کے مختلف مراحل طے کر رہی ہے اور اُن پہیوں کو چلانے کے لیے جس ایندھن کا استعمال کیا جا رہا ہے اُسی ایندھن کے دھوئیں اور دیگر فضلے ہوائی آلودگی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ 33 فیصد سے زیادہ ہوائی آلودگی مختلف گاڑیوں سے نکلنے والے دھوئیں کے باعث ہوتی ہے۔ 2001 میں سرکار نے طے کیا تھا کہ ریل گاڑیوں کے علاوہ دیگر تمام گاڑیوں کے لیے ڈیزل کا نعم البدل استعمال کیا جائے جس سے ڈیزل کی بہ نسبت کم آلودگی ہو لیکن اس بات کو

پورے ملک میں لاگو کرنا ابھی دشوار کام ہی مانا جا رہا ہے۔ تمام کوششوں کے باوجود عالمی صحت تنظیم کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان کے سب ہی بڑے شہروں میں فضائی آلودگی کی سطح طے شدہ پیمانوں سے دو تین گُنا زیادہ ہے۔

کارخانوں، مشینوں وغیرہ سے نکلنے والی کاربن ڈائی آکسائڈ (CO_2)، کاربن مونو آکسائڈ (CO)، سلفر ڈائی آکسائڈ (SO_2) وغیرہ ایسی زہریلی گیسیں ہیں جو ہوا کی آلودگی کے ساتھ ہی 'گلوبل وارمنگ' (Global Warming) کا خطرہ بھی بڑھا رہی ہیں۔

ہماری زمین کے چاروں طرف ہوا کی جو پرت ہے اس کو کرہ باد یا Atmosphere کہا جاتا ہے۔ یہ زمین کی سطح سے تقریباً 650 کلومیٹر کی اونچائی تک موجود ہے۔ ہوا کی اس پرت کا سب سے نچلا حصہ زمین کی سطح سے 10 سے 12 کلومیٹر تک ہے اس کو ٹروپواسفیئر Troposphere کہا جاتا ہے اس حصے کا درجہ حرارت اونچائی بڑھنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتا جاتا ہے۔ Atmosphere کا یہی حصہ مختلف موسمی تبدیلیوں کے لیے ذمے دار مانا جاتا ہے۔ Troposphere سے تقریباً 40 سے 60 کلومیٹر کی اونچائی تک پھیلے فضائی علاقے کو اسٹریٹواسفیئر Stratosphere کہتے ہیں اس میں ہوا نہیں ہوتی اس کا درجہ حرارت 90°C تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی سطح پر اوزون گیس (O_3) کی پرت ہوتی ہے۔

ایک اہم بات اور! وہ یہ کہ سورج جو ہماری زمین کے لیے توانائی کا منبع ہے اسی سورج سے اور دوسرے تاروں سے مختلف شعاعیں اور توانائی سے بھرپور ذرّات ہماری زمین کی فضا میں مسلسل آتے رہتے ہیں اور زمین کی فضا میں ان ذرات میں ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے جس سے مزید مہین ذرّات بنتے رہتے ہیں۔ نتیجتاً پوری فضا ان ذرّات اور شعاعوں (الیکٹران، پروٹان، میسان، گاما شعاعوں، ایکس شعاعوں، بالا بنفشی شعاعوں وغیرہ) سے بھری رہتی ہے۔ فضا کی الگ الگ بلندیوں پر ان کا گھناؤ (Density) الگ الگ ہوتا ہے۔ ان کیمیاوی اعمال اور تبدیلیوں کے سبب ایٹمی آکسیجن، نائٹروجن اور اوزون (O_3) کے علاوہ کئی گیسوں کے مرکبات بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ یہ بناؤ اور بگاڑ قدرتی طور پر چلتا رہتا ہے اور یہ عمل نہایت اہم بھی ہے کیونکہ اسی عمل کے ذریعے بیرونی مہلک اور خطرناک شعاعوں و ذرّات سے

زمین پر موجود زندگی کی حفاظت ہوتی ہے۔

اسٹریٹوسفیئر Stratosphere کی سطح پر ہی اوزون (O_3) کی حفاظتی پرت بھی موجود ہوتی ہے۔ یہ پرت مختلف نقصان دہ شعاعوں کو بے اثر کر دیتی ہے اور اس طرح زمین پر موجود جانداروں کے لیے زرہ بکتر کا کام کرتی ہے۔

افسوس! ہماری نادانی سے یہ زرہ بکتر روز بروز کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ اس پورے کرہ ارض پر ہر ذی روح شے کے لیے خطرہ پیدا ہوگیا ہے اوزون پرت کی کمزوری Ozone Layer Deplection کی وجہ سے سورج کی خطرناک بالا بنفشی شعاعیں Ultraviolet Rays زمین تک پہنچنے لگی ہیں جس سے کئی بیماریاں خصوصاً کینسر جیسی مہلک بیماری کا خطرہ بڑھ گیا ہے۔

ایئر کنڈیشن، فریجنگ، پلاسٹک، فوم ہیئر ڈرائر، اسپرے، مختلف حسن افزا اشیا کی تیاری اور ان کی پیکجنگ، ڈسپنسر، آگ بجھانے کے آلات وغیرہ میں کثرت سے استعمال ہونے والی کلورو فلورو کاربن (CFC s) اور جیٹ ہوائی جہازوں سے نکلنے والی گیس نائٹروجن کے آکسائڈوں خاص طور سے نائٹرس آکسائڈ (N_2O) کی وجہ سے اوزون کی پرت کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے۔

ایک اندازے کے مطابق ہمارے کرہ باد میں ہر سال فری آن (Freon) گیس کی مقدار 13 سے 18 فیصد تک بڑھتی جا رہی ہے یہ کلورو فلورو کاربن (CFCs) جیسی گیس کو پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ ذمے دار ہے۔ اس کا استعمال ریفریجریٹر، ایئر کنڈیشنز، فوم، ایروسال، اسپرے وغیرہ بنانے میں کیا جاتا ہے ہوا میں اس کی زیادتی سے انسانوں کو اس کا بہت زیادہ خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور جلد کے مختلف امراض کے ساتھ ہی کینسر جیسے مہلک مرض کا خطرہ کئی گنا بڑھ جائے گا۔

اوزون کی پرت کو لگاتا کمزور کرنے والی حرکات میں سے ایک ہے 'گرین ہاؤس اثرات'۔ گرین ہاؤس یوں تو ہرے پودے اگانے کے لیے ہی بنائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ شیشے کے بنائے جاتے ہیں اس لیے ان میں روشنی اور گرمی اندر تو چلی جاتی ہے لیکن گرمی واپس نہیں ہو پاتی نتیجتاً ان کے اندر کی فضا گرم ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح کاربن ڈائی آکسائڈ (CO_2) کا طرزِ عمل بھی ہوتا ہے۔ کسی حد تک میتھین (CH_4)، نائٹرس آکسائڈ (N_2O) بھی ایسا ہی کرتی ہے لیکن کاربن ڈائی آکسائڈ (CO_2) بھی ایسا ہی کرتی ہے لیکن کاربن ڈائی آکسائڈ (CO_2) ان میں سے سب سے زیادہ اس کام کو انجام دیتی ہے۔ وہ سورج کی روشنی کو تو کرہ باد سے گزر کر زمین تک پہنچنے دیتی ہے لیکن کرہ باد سے واپس نہیں جانے دیتی اس طرح کاربن ڈائی آکسائڈ (CO_2) ماحول کی گرمی کو قائم رکھنے کا قدرتی عمل کرتی ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ زمین پر کاربن ڈائی آکسائڈ (CO_2) کی مقدار صرف 0.03 فی صد ہی ہے اگر کن ہی وجوہات سے کاربن ڈائی آکسائڈ (CO_2) کی اس مقدار میں اضافہ ہو جائے گا۔ گرمی کا اس طرح سے زمین کے چاروں طرف کرہ باد کے اندر ہی رُک جانا 'گرین ہاؤس اثر' کہلاتا ہے۔ ایندھنوں کے بہت زیادہ جلنے سے کاربن ڈائی آکسائڈ (CO_2) ہرے پودوں کے ذریعے استعمال کی جاتی ہے اس سے زیادہ وہ پیدا ہو رہی ہے اور فضا میں اس کی مقدار میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ کاربن ڈائی آکسائڈ (CO_2) سورج کی شعاعوں کو زمین تک بآسانی پہنچ جانے دیتی ہے لیکن حرارت پیدا کرنے والی شعاعوں کو (خصوصاً انفراریڈ شعاعوں) کو واپس جانے نہیں دیتی اور اس طرح کاربن ڈائی آکسائڈ (CO_2) ہی گرین ہاؤس اثرات کی وجہ بنتی ہے۔

گرین ہاؤس اثرات سے عالمی اضافۂ حرارت یعنی گلوبل وارمنگ (Global Warming) پیدا ہوتی ہے جس سے زمین پر زندگی بخش ماحول تبدیل ہونے لگتا ہے۔ اگر گلوبل وارمنگ (Global Warming) اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو برف کے بڑے بڑے تودے یعنی گلیشیر پگھل جائیں گے اور سمندر کی سطحِ آب میں اضافہ ہوگا اور اُس میں طغیانی آئے گی جس سے سمندر کے کنارے بسی ہوئی آبادیوں کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

گرین ہاؤس اثرات، ماحول میں کلوروفلوروکاربن (CFCs) کی زیادتی، میتھین (CH_4)، نائٹرس آکسائڈ (N_2O) وغیرہ سے اوزون (O_3) کی پرت کمزور ہوتی جاتی ہے جس کی وجہ سے ماحول میں ہوا کی مختلف گیسوں کا توازن بگڑ جائے گا اس پرت کے ہلکے پڑنے سے Troposphere میں ہائڈروجن پرآکسائڈ (H_2O_2) کی مقدار بہت تیزی سے بڑھ جائے گی جس سے نچلے علاقوں میں موجود بستیاں زیرِآب چلی جائیں گی، موسم میں تبدیلی آئے گی، خاص طور سے بارش کا جوایک تسلسل زمین پر موجود ہے اس کا Patern بدل جائے گا۔ سب سے زیادہ خطرہ تو بالا بنفشی شعاعوں Ultraviolet Rays سے ہے جن کو اوزون (O_3) اپنے اندر جذب کرلیتی ہے اگر یہ شعاعیں زمین تک آنے لگی تو مختلف مہلک و لاعلاج امراض کو بڑھائیں گی جلد کا کینسر اور دوسرے جلدی امراض بڑھائیں گی، آنکھوں کے کارنیا کو آہستہ آہستہ دھندلا کردیں گی جس سے اندھاپن بڑھے گا۔ سمندری جانداروں پر بھی اِن کا برااثر مرتب ہوگا جس سے غذائی چین Food Chain بھی متاثر ہوگی۔

صرف چند تدابیر اپنا کر ہم فضائی آلودگی کو کافی حد تک کم کرسکتے ہیں۔ جیسے کارخانوں اور فیکٹریوں کو آبادی سے کافی دور ہی لگایا جائے، گاڑیوں سے پیدا شدہ دھوئیں کو فلٹر وغیرہ لگا کر کم سے کم کردیا جائے، پیٹرول کو سیسہ جیسے زہریلے عناصر کو دور کرکے ہی استعمال کرایا جائے، کارخانوں کی چمنیاں اونچی رکھی جائیں اور ان میں فلٹر وغیرہ کا استعمال لازمی قرار دیا جائے۔ اوزون (O_3) کو تباہ کرنے والی گیسوں اور گرین ہاؤس اثرات پیدا کرنے کے لیے ذمے دار گیسوں کے استعمال پر پوری طرح پابندی لگائی جائے اور اِن کے نعم البدل استعمال کرنے پر زور دیا جائے۔ زیادہ تعداد میں پیڑ پودے لگانے کا بندوبست کیا جائے اور موجودہ پیڑوں کا کاٹنا روکا جائے۔ جہاں زیادہ گاڑیاں چلتی ہوں وہاں کی سڑکیں زیادہ پکی ہوں تاکہ دھول وغیرہ نہ اُڑے اس طرح کی تدابیر اپنا کر ہوا کی آلودگی پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

ہوا کے بعد پانی زندگی کی سب سے بڑی دوسری ضرورت ہے۔ ہم جو بھی غذا لیتے ہیں اس کو پانی ہی اپنے اندر گھول کر پورے جسم میں لیے پھرتا ہے اور تمام اعضا تک اُن کی ضرورت کے مطابق غذائی اجزا پہنچاتا ہے اگر پانی ہی آلودہ ہوجائے تو ظاہر ہے کہ جسم کے ہر حصے پر اس کا برااثر پڑے گا۔

جب پانی میں کارخانوں سے خارج ہونے والے زہریلے اجزا کیمیاوی اخراج، گندہ پانی، کوڑا کرکٹ وغیرہ مل جاتے ہیں تو پانی آلودہ ہوجاتا ہے۔ کھیتی میں استعمال ہونے والے جراثیم کش، کیڑے مار دوائیں، Weedisides وغیرہ بہتے ہوئے پانی میں پہنچتے ہیں تو پانی زہریلا ہوجاتا ہے۔ گھریلو گندا پانی، سیویج Sewage کی گندگی وغیرہ بھی پانی کو گندہ کردیتی ہے۔ ہندوستانی ندیاں جن میں کبھی آبِ حیات کے سوتے ملتے تھے اور زندگی بخش پانی بہتا تھا آج وہی ندیاں زہرآلودہ ہوچکی ہیں اور ان کی دھاروں میں پانی کی شکل میں موت بہہ رہی ہے۔

آبی آلودگی آج ملک بھر کا ایک اہم اور بڑا مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ گنگا اور جمنا ندیاں جن کو ہندوستان کی بڑی آبادی مقدس دریا بھی مانتی ہے آبی آلودگی کی زبردست شکار ہیں۔ گزشتہ دنوں ٹی وی کے ایک چینل اور قومی چینل پر ایک ساتھ نشر ہونے والے ایک شہرت یافتہ پروگرام میں جمنا سے جڑی اس سچائی پر سے پردہ اٹھایا گیا تھا کہ جمنا کا اصلی پانی تو دہلی سے بہت پہلے ہی مکمل طور پر روک لیا جاتا ہے۔ اب دہلی میں موجود جمنا میں جو پانی بہہ رہا ہے وہ تو گندے نالے، نالیوں فلش اور گٹر کا پانی ہے۔

گنگا کے پانی کی حالت بھی بدتر ہوچکی ہے۔ گنگا کے 100 ملی لیٹر پانی کے نمونے میں تقریباً 60 ہزار فیکل کالی فارم بیکٹر یا موجود ہوتے ہیں جو نہانے کے صاف پانی کی بہ نسبت 120 گنا زیادہ ہیں۔ دریائے جمنا کو صاف کرنے کے پندرہ سالہ منصوبے کے باوجود حالات یہ ہیں کہ اس کے پانی میں نہانے لائق پانی کے لیے تیار کردہ پیمانوں سے 10 ہزار زائد فیکل کالی فارم بیکٹر یا موجود ہیں۔ یہ نہایت افسوس ناک اور خطرناک حالات ہیں۔ اِس گندے پانی کا نقصان سب ہی جانداروں کو جھیلنا پڑتا ہے۔

آبی آلودگی کے باعث ملک بھر میں روزانہ تقریباً 1000 بچے ڈائریا جیسی مہلک بیماری کا شکار ہوکر موت کی آغوش میں سوجاتے ہیں۔ انسانی جسم کا وہ نظام جو زہریلے اجزا کو جسم سے باہر نکالنے کا کام کرتا ہے ایک حد تک ہی گندگی کو باہر نکال پاتا ہے اس کے بعد یہ زہریلے اجزا جسم میں جمع ہوکر طرح طرح کی بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ آنتوں کے امراض، یرقان معیادی بخار، ٹائفائڈ ہیضہ پیچش وغیرہ امراض اسی گندے پانی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

سیویج Sewage کی گندگی سے آلودہ پانی کے استعمال سے فالج، پیلیا، ٹائفائڈ جیسے امراض ہوتے ہی ہیں اس کے علاوہ اس گندگی سے دریاؤں، تالابوں وغیرہ کے پانی میں کاربن کے مرکبات (Organic Compounds) کی مقدار بڑھ جانے سے مختلف جرثوموں، بیکٹر یا وغیرہ کے لیے آکسیجن کی مانگ بڑھ جاتی ہے جس کو (B.O.D) Biological Oxygen Demand کہا جاتا ہے اور آکسیجن کی کافی مقدار نہ ملنے کے باعث آبی جانداروں کی اموات ہونے لگتی ہیں۔ نتیجتاً پانی مزید گندا اور بدبودار ہوجاتا ہے۔ گھریلو گندے پانی میں موجود فاسفورس اور نائٹروجن کے مرکبات کی زیادتی سے پانی کی سطح پر پھیلنے والی کائی (Moss) میں غیرمعمولی اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ کائی پانی کی سطح پر پھیل جاتی ہے اور پانی کی نچلی سطح تک آکسیجن کو نہیں پہنچنے دیتی جس کی وجہ سے آبی جاندار مرنے لگتے ہیں۔ پانی میں گھلے ہوئے فلورائڈس سے فلوروسس ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے آنتوں کی سوزش، ہڈیوں کا کمزور ہوجانا اور وزن میں کمی جیسے امراض ہونے لگتے ہیں۔

سیسے اور پارے کے مرکبات پانی اور آبی نباتات کے ذریعے مچھلیوں کے جسم میں جمع ہونے لگتے ہیں اور اس طرح انسانی جسم تک ان کی رسائی ہوجاتی ہے جس سے انسان کا ہر عضو بالخصوص دل، دماغ اور آنکھیں بہت زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ یہی گندہ اور زہریلا پانی جب کھیتی میں بطور آبپاشی استعمال کیا جاتا ہے تو ایک طرف مٹی کی زرخیزی کو کم کردیتا ہے تو دوسری جانب ترکاریوں، سبزیوں کے ذریعے انسانی جسم میں زہریلے اجزا پہنچ جاتے ہیں۔

آلودہ ہوچکے دریاؤں، جھیلوں، تالابوں کو دیکھ کر اگر کوئی شخص یہ سوچ کر مایوس و ناامید ہو کہ اب کیا ہوسکتا ہے؟ اب تو کافی دیر ہوچکی ہے، ہندوستان اور دیگر ممالک کے زہریلے اور گندے اجزا سے آلودہ دریا اب کس طرح صاف ہوسکتے ہیں؟ تو اُس کو انگلینڈ کے مشہور دریا 'ٹیمس' (Thames) کی طرف بھی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ بہت بڑی آبادی والا، عالمی شہرت اور اہمیت کا حامل شہر لندن اسی ٹیمس ندی کے کنارے آباد ہے۔ اب سے تقریباً پچاس سال پہلے پورے شہر کا کوڑا کرکٹ اور کارخانوں کے فضلے اسی دریا میں انڈیل دیے جاتے تھے جس کی وجہ سے یہ دریا اس قدر آلودہ تھا کہ عوام میں یہ بات مشہور تھی کہ اگر کوئی شخص اس دریا میں گر جائے تو وہ شخص ڈوب کر مرنے سے پہلے ہی اس دریا کے پانی کے زہریلے پن سے مرجائے گا لیکن یہی

ندی آج اپنے شفاف پانی کے لیے پوری دنیا میں نمونے کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔

1960 میں ایک بڑے پروگرام کے تحت اس دریا کی صفائی کا کام شروع ہوا۔ پرانے سیویج Sewage نظام کو بدلا گیا۔ کارخانوں اور فیکٹریوں کے لیے نئے قانون بنائے گئے۔ جن کے مطابق کوئی بھی کارخانہ اپنا گندا پانی اور فضلہ دریا میں نہیں ڈال سکتا۔ کئی کارخانوں نے تو ازخود اپنے یہاں ایسے پلانٹ لگا لیے جو فضلے کو صاف کرتے تھے۔ یہ طے کیا گیا کہ پانی کو صاف کرنے کے لیے ایسے پلانٹ لگائے جائیں جو پانی کو پینے کے لائق بنائیں بعد ازاں اس صاف پانی کو شہر کے گھروں میں سپلائی کیا جائے۔ ساتھ ہی گھروں سے واپس آنے والے استعمال شدہ گندے پانی کو پہلے صاف کیا جائے بعد میں اس کو دریائے ٹیمس میں ملنے دیا جائے۔ نتیجتاً صرف ٹیمس ندی ہی صاف نہیں ہوئی بلکہ شہر کے لوگوں کی تندرسی میں بھی قابل ذکر سدھار ہوا۔ ٹیمس کو پوری دنیا میں بطور نمونہ لیا جاسکتا ہے۔

اگر اسی طرح ہر جگہ کارخانوں، فیکٹریوں اور گھروں سے نکلنے والے گندے پانی کو حتی الامکان صاف کرنے کے بعد ہی دریاؤں میں بہایا جائے اس کے علاوہ زراعت میں استعمال ہونے والی دواؤں کو پانی میں بہہ کر تالابوں اور ندیوں میں جانے سے روک دیا جائے۔ جو ندیاں تالاب وغیرہ کافی آلودہ ہیں ان کو صاف کرنے کی مہم چلائی جائے۔ ندیوں میں زہریلے اجزا بہانے والی فیکٹریوں اور کارخانوں کے لیے اور زیادہ سخت قانون بنائے جائیں اور ان قوانین پر عمل بھی کرایا جائے تو کافی حد تک آبی آلودگی پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

جب پانی اور ہوا کی آلودگی کا ذکر ہوتا ہے تو ایک اور آلودگی کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ ہاں! وہی گاڑیاں اور کارخانے جو ہوائی آلودگی پھیلاتے ہیں وہی ایک اور قسم کی آلودگی تیزی سے بڑھا رہے ہیں اور وہ ہے 'صوتی آلودگی' یعنی شور۔ یہی کارخانے، گاڑیاں اور مختلف مشینیں ہمارے ماحول میں لگاتار شور انڈیلتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ لاؤڈ اسپیکر، ہوائی جہازوں کی تیز آوازیں وغیرہ بھی اس بڑھتے ہوئے شور کے لیے ذمے دار ہیں۔ کئی گھریلو مشینیں مثلاً ٹی وی، ریڈیو، اے سی، ایکزاسٹ پنکھے، ٹیپ ریکارڈر وغیرہ اور ٹیکسٹائل کی مشینیں، اسٹون گرائنڈر، آرا مشینیں وغیرہ بھاری بھرکم مشینیں تو اس شور کو بڑھا ہی رہی ہیں ساتھ ہی دعوتوں، پارٹیوں، شادی بیاہ، میلوں میں ہونے والے شور، بینڈ باجے، آتش بازی وغیرہ بھی صوتی آلودگی کو بڑھا رہے ہیں۔ پہاڑوں کو توڑنے کے لیے کیے جانے والے دھماکے، افواج کی مشق میں ہتھیاروں کے استعمال سے پیدا شدہ بھی صوتی آلودگی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ 2005 میں سپریم کورٹ کے ایک فیصلے میں بھی اس بابت آگاہ کیا گیا تھا۔ چند سال قبل سرکار نے بھی صوتی آلودگی کو روکنے کی غرض سے قابل برداشت شور کا پیمانہ جاری کیا تھا مگر اس پر کس طرح عمل ہوگا؟ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

آواز کو ناپنے کے پیمانے کا نام بیل (bel) ہے بیل ایک بہت چھوٹی اکائی ہے۔ 10 بیل کا ایک ڈیسی بیل (dB) ہوتا ہے اور عموماً اسی dB کو استعمال کیا جاتا ہے۔ 20-30 dB پر آدمی سرگوشی کرتا ہے اور عام بول چال کی آواز میں 60 dB آواز پیدا ہوتی ہے۔ 80 dB سے زیادہ کی آواز شور کہلاتی ہے۔ ریڈیو، ٹی وی، واشنگ مشین وغیرہ 75 dB سے 120 dB کی آواز پیدا کرتے ہیں مختلف گاڑیاں، بس، ٹرک، موٹریں وغیرہ 90 dB تک شور پیدا کرتے ہیں، جب کہ جیٹ ہوائی جہازوں سے 50 dB سے 180 dB تک اور راکٹوں سے 180 dB تک شور پیدا ہوتا ہے۔ انسانی کان 0 dB سے 180 dB تک کی آواز محسوس کرتے ہیں لیکن 90 dB سے زیادہ شور انسان کی صحت خصوصاً اعصاب، دماغ اور کانوں کے لیے نقصان دہ ہے۔

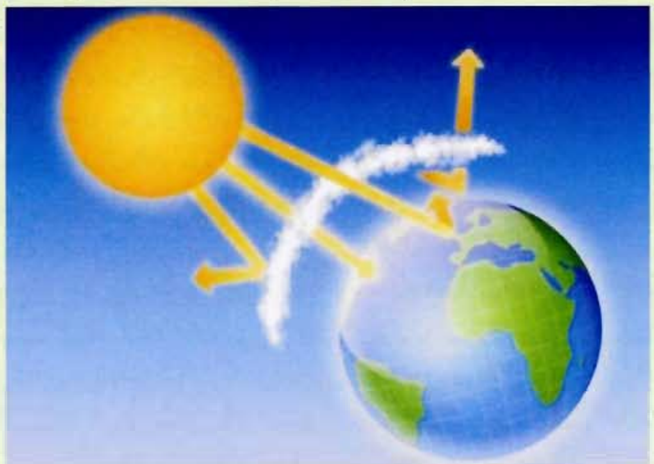

تیز آواز جہاں ایک طرف قوت سماعت پر برا اثر ڈالتی ہے وہیں تیز آواز سے خون کی شریانیں سکڑنے لگتی ہیں جس سے خون کے بہاؤ پر برا اثر پڑتا ہے اور خون کا دباؤ (Blood Presure) بڑھ جاتا ہے۔ 90 dB سے 100 dB تک کے شور سے انسانی قلب کی رفتار میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

تیز آواز سے نیند میں خلل پڑتا ہے جس سے اعصاب کو ٹھیک سے آرام نہیں مل پاتا اور ذہنی سکون نہ ملنے کی وجہ سے آدمی چڑچڑا ہوجاتا ہے اُسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ آنے لگتا ہے۔ آدمی کی قوت برداشت کم ہونے لگتی ہے اور اکثر یہ کیفیت اعصابی اور دماغی امراض کو جنم دیتی ہے۔

اگر گاڑیوں اور مشینوں میں اس طرح کی تدابیر استعمال کی جائیں جو شور کو کم کرتی ہیں تو یقیناً صوتی آلودگی میں کمی آئے گی۔ اگر روزمرہ کی زندگی میں تھوڑا سا احتیاط برتیں تو شور پر بڑی حد تک قابو پاسکتے ہیں۔ شادی بیاہ، پارٹیوں، تیوہاروں اور مذہبی تقاریب میں ہم صرف تفریح کو ہی مدِنظر نہ رکھیں بلکہ اس بات کا بھی دھیان رکھیں کہ ان مواقع پر پیدا ہونے والے شور کی زد میں دوسرے ہی نہیں آرہے ہیں بلکہ ہم خود بھی اس سے اتنا ہی نقصان اٹھا رہے ہیں تو شور پر قابو پاسکتے ہیں۔

ہوا کی آلودگی، پانی کی آلودگی، صوتی آلودگی اور ماحول میں طرح طرح کی آلودگیاں انسان سمیت ہر جاندار کے لیے نقصان دہ ہیں اس لیے ان پر قابو پانے کی ذمے داری بھی سب کی ہے۔ اگر حکومتوں اور حکام کے بھروسے بیٹھے رہے تو یقیناً اس مسئلے کو حل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ حکام کو اور بہت سے کام ہیں وہ آپ کے آلودہ ماحول کو صاف کرنے کا جو قدم اٹھا سکتے ہیں اٹھاتے ہیں۔ لیکن عوام کے تعاون کے بغیر ان کی کاوشیں اثر دار نہیں ہوسکتیں۔ آلودگی ہمیں نقصان پہنچا رہی ہے اس لیے اس سے نمٹنے کا کام بھی ہم کو ہی کرنا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ بروقت ہم کیا کرسکتے ہیں؟ کیا اپنی آئندہ نسلوں کو ہم اس خوبصورت دنیا کو گندا کرکے سونپیں گے یا اس کو مزید خوبصورت پاک وصاف بنا کر دے جائیں گے؟

□

Dr. Samiuddin Khan "Shadab", (Lecturer, Urdu Dept. Hindu (P.G) College, Moradabad UP) Masjid Zahuruddin, Gujar Tola, Rampur - 244901 (U.P)

تبصرہ و تعارف

کلیات آل احمد سرور

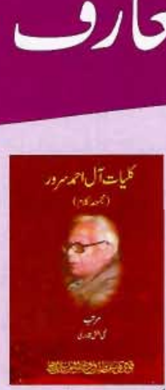

مرتب: محی بخش قادری
صفحات: 694، قیمت: 140روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر محمد ہادی رہبر

پروفیسر آل احمد سرور کا شمار اردو کے دیدہ ور نقادوں میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایک اعلیٰ درجے کے ناقد اور دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش فکر شاعر بھی تھے، جس کی گواہی ان کے چار شعری مجموعے بخوبی دے رہے ہیں۔ آل احمد سرور کی تنقیدوں اور دیگر علمی تحریروں سے استفادہ کرنے والوں نے ان کی شاعری پر کما حقہ توجہ نہیں دی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس شخص کی نثر خاص کر تنقید مشہور و مقبول ہوجاتی ہے اس کی شاعری کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ اس ضمن میں حالی، محمد حسین آزاد، شبلی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ موجودہ دور میں اختصاص کے تصور نے اس خیال کو اور بھی عام کردیا ہے کہ ایک شخص میں تنقید اور تخلیق کا اجتماع نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ الگ الگ چیزیں ہیں۔

سرور صاحب کے کلام سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خاصے پرگو شاعر تھے، لیکن ان کی تنقید اور دیگر نثری خدمات کی وجہ سے انھیں بطور شاعر نہ سمجھ کر لوگوں نے محض جز وقتی شاعر سمجھ لیا جس کی وجہ سے بھی ان کی شاعری پر زیادہ اعتنا نہ کیا گیا۔ حالانکہ ان کی شاعری میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو بڑے شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ آل احمد سرور نے گیارہ برس کی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کردیا تھا عمر کے ساتھ ساتھ ان کا شعری ذوق بھی بڑھتا گیا اور 1935 میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'سلسبیل' شائع ہوا تب ان کی عمر محض 24 سال تھی۔ دوسرا مجموعہ کلام 'ذوق جنوں' لکھنؤ سے 1955 میں اور تیسرا مجموعہ کلام 'خواب اور خلش' 1991 میں دہلی سے شائع ہوا۔ چوتھا مجموعۂ کلام 'لفظ' ان کی وفات کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی نے شائع کیا۔

سرور صاحب کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ شاعری میں انھیں جو مقام ملنا چاہیے وہ نہیں مل پایا۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں: ''اگر کسی شخص کی شہرت ایک میدان میں ہوجاتی ہے تو دوسرے میدان میں اس کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس لیے میرا نام نثر میں چل نکلا تو یار لوگوں نے میری شاعری کو اہمیت نہیں دی۔'' حالانکہ انھوں نے اپنی شاعری کے متعلق صاف طور پر لکھا ہے کہ 'میرے خیال میں، میری شاعری سے میری تنقید کو اور میری تنقید سے میری شاعری کو مدد ملی ہے۔' سرور صاحب شاعری کو ذات سے کائنات تک کا سفر مانتے ہیں اور اسے خوابوں کے ذریعے حقائق کی توسیع کا نام دیا ہے۔ ان سب کے باوجود انھوں نے شاعری سے اپنی دلچسپی کو حسرت کے محبوب سے مثال دی ہے:

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی   مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

کلیات آل احمد سرور (مجموعۂ کلام) ان کے چار شعری مجموعوں پر محیط ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام سلسبیل ان کے عہد شباب کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس مجموعہ میں ان کے اس دور کی شاعری کے باوجود وہ نگاہ شوق کی بے تابیوں کو حد سے تجاوز ہونے نہیں دیتے بلکہ شائستگی اور تہذیب کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کلام کی اکثر نظموں میں انھوں نے فطرت سے اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا ہے۔ آل احمد سرور اپنے پہلے مجموعۂ کلام سلسبیل کی تمہید میں لکھتے ہیں 'بعض لوگ اس کے قائل ہیں کہ جب تک شعر سے 'مشاعرے کی چھت' یا بصورت دیگر 'سننے والوں کی نیند' نہ اڑ جائے شعر شعر نہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ شعر کی خوبی نہیں، مشاعرہ یا مشاعرے کی چھت کا تصور ہے۔ سنتا ہوں جبریل مشرق نے بال جبریل کے بعد صور اسرافیل پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر بال جبریل سے زندہ بیدار نہیں ہوئے تو صور اسرافیل سے مردوں کو بے سروپا، سراسیمہ اور برہنہ کھڑا کرنے سے فائدہ۔'

آل احمد سرور کے شعری نظریات کی بھرپور ترجمانی درج بالا سطروں میں مکمل طور پر ہوجاتی ہے۔ وہ شاعری کو انسان کے ذہن و دماغ کی افزائش اور زندگی میں انقلاب پیدا کرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ سرور صاحب دوسرے مجموعۂ کلام 'ذوق جنوں' میں، 'میں اور میری شاعری' کے عنوان سے لکھتے ہیں ''میں شاعری کو انسانیت کی آواز سمجھتا ہوں، اس آواز کی ضرورت ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی ہاں اس کی لے ہر دور میں بدلتی رہی ہے اور ایسا ہونا قدرتی ہے۔''

زیر تبصرہ کتاب اردو کے ایک اہم ناقد کے مجموعۂ کلام کی کلیات ہے۔ اس کلیات میں سرور صاحب کی شاعری سے متعلق رائے نیز اپنی شاعری کے متعلق وہ کیا سوچتے تھے واضح ہوجاتا ہے۔ محی بخش قادری نے بڑی محنت اور لگن سے اس کلیات کو مرتب کیا ہے اور اردو داں طبقے میں سرور صاحب کی شعری خدمات کو پیش کیا ہے وہ لائق تحسین اور قابل مبارکباد ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی بھی مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس طرح کی اہم کتابیں شائع کرتی رہتی ہے۔

اردو کی کہانی

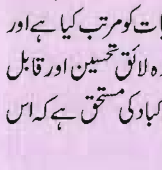

مصنف: سید احتشام حسین
صفحات: 104، قیمت: 20روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر مجیب احمد خان، غوری، ای62، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

سید احتشام حسین اردو ادب کے مشہور و معروف ترقی پسند نقاد ہیں۔ انھوں نے 'اردو کی کہانی' میں اردو ادب کی مختصر تاریخ دلچسپ اور مؤثر طور پہ پیش کی ہے۔ یہ کتاب دیباچہ اور دیباچہ (طبع اوّل) کے علاوہ چودہ ابواب (1) زبانوں کا گھر ہندوستان (2) اردو زبان کی ابتدا (3) گھر سے دور دکنی ہندوستان میں (4) دلی کی شاعری (5) ترقی کا زمانہ (6) پچھم سے پورب تک (7) نظیر اکبرآبادی (8) دبستانِ لکھنؤ (9) نثر کی ترقی (10) دلی میں ایک بہار اور (11) نئی منزل کی طرف (12) کچھ نئے کچھ پرانے (13) نیا زمانہ نیا ادب (14) کچھ ضروری اشارے، پر مشتمل ہے۔ ان ابواب کے عنوانات سے 'اردو کی کہانی' کو ایک خوبصورت لڑی میں پرو دیا گیا ہے۔ گو اس کے مطلب و معنی بھی ظاہر ہوگئے ہیں۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہونا بھی اس کی اہمیت و افادیت کے ضامن

ہیں۔عصر حاضر میں بچوں میں 'اردو کی کہانی' کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔

ہندوستان میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔دراوڑ قوم کی زبان پراکرت کہلاتی ہے۔ پراکرت صرف اک زبان نہیں ہے بلکہ زبانوں کا ایک مجموعہ ہے۔الگ الگ علاقوں کی الگ الگ پراکرت ہوتی تھی۔شمالی ہند میں جو پراکرت بولی جاتی تھی اسے 'شورسینی' کہتے تھے۔'شورسینی' سے ہی اردو اور ہندی کا رشتہ ہے۔آریہ ہندوستان آئے۔اُن کی زبان آریائی تھی۔سنسکرت آریائی زبانوں کی ایک شاخ ہے۔گو بنگالی، مراٹھی، پنجابی، سندھی، آسامی اوراڑیا بھی نئی آریائی زبانیں ہیں۔

دسویں صدی عیسوی کے بعد نئی زبانیں ہندوستان میں بولی جانے لگیں، ان میں اردو زبان بھی شامل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ زبان کہیں باہر سے نہیں آئی بلکہ یہیں پیدا ہوئی اور یہیں کے لوگوں نے اسے فروغ دیا۔اس کا رنگ وروپ اور بناوٹ سب ہندوستانی ہے۔گویا اس زبان کا مزاج مکمل ہندوستانی ہے۔اگر یہ زبان کسی دوسرے ملک میں بھی بولی جانے لگے تو یہ وہاں کی زبان نہیں بن جائے گی۔ یہ ہر حال میں ہندوستانی ہی رہے گی۔

بچوں کی تعلیم، صحت مند معاشرے کے لیے ایک انتہائی اہم جز ہے۔انھیں تعلیم کس نوعیت کی دی جارہی ہے یہ بھی غور دفکر کا موضوع ہے۔ دراصل بچوں کو ایسی تعلیم دینا چاہیے جس سے ان کی دماغی وجسمانی نشو ونما اچھی طرح ہوسکے۔بچوں کی نفسیات کو سمجھے بغیر ان کی کامیابی ممکن نہیں۔ انھیں کس عمر میں کتنا پڑھنا ہے اور انھیں کتنی معلومات ہونا چاہیے۔ بچے کی تعلیم وتربیت اس کی مادری زبان میں ہی ہونا چاہیے کیونکہ یہ زبان اس کے جذبات وخیالات کی حقیقی ترجمانی کرسکے گی۔ البتہ بچہ بڑا ہوکر دوسری زبانیں بھی سیکھ لیتا ہے مگر وہ اس کے جذبات واحساسات کی حقیقی ترجمانی نہیں کرسکیں گی۔لہٰذا ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی زبان کی تاریخ اور ادب سے واقف ہو۔اس طرح اسے اپنی زبان و ادب کی اہمیت کا احساس ہوگا اور وہ شعروادب سے خوب لطف اندوز بھی ہوگا۔

اردو زبان وادب کی یہ کتاب 'اردو کی کہانی' سید احتشام حسین نے اس خیال سے لکھی کہ بچے اوران پڑھ بالغ اس کی تاریخ سے واقف ہوجائیں۔اس میں اہم امور آسان اور روانی کے ساتھ بیان ہیں۔اس کتاب میں تاریخ ادب کے ہر دور کا سماجی اور سیاسی پس منظر بھی پیش نظر ہے جس سے اردو زبان وادب کی کہانی یہاں بسنے والوں کی زندگی سے مربوط و مبسوط معلوم ہوتی ہے۔'اردو کی کہانی' میں اردو ادب کی تہذیبی خصوصیات، ہندوستان کی آب وہوا اور جغرافیہ اور ہندوستان کی جنگ آزادی میں اس کے حصہ لینے اور ملکی اور قومی اتحاد وتعمیر کے لیے اس کی جدوجہد کا ذکر موثر طریق پر شامل ہے۔امید ہے کہ یہ مختصر سی 'اردو کی کہانی'، بچوں اوران پڑھ بالغوں کے ذوق وشوق کی مکمل اور صحیح رہنمائی کرے گی اور ان کے دلوں میں اپنی زبان اور ملک وقوم سے محبت اور اتحاد کا جذبہ بھی پیدا کرے گی۔

آتش رفتہ کا سراغ

مصنف: مشرف عالم ذوقی

صفحات: 719، قیمت: 700 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عشرت ظفر جگر اکیڈمی، 88/89، چمن گنج، کانپور

مشرف عالم ذوقی کا نیا ناول 'آتش رفتہ کا سراغ' ناول نگار کے سینے میں درد وکرب کی اس آگ کی موجودگی کا سراغ دیتا ہے جو علامہ اقبالؒ کے دل میں بھڑک رہی تھی اور جس میں ملت اسلامیہ کا درد بے پناہ پنہاں تھا، ناول نگار نے اپنے ناول کے صفحہ اول پر اقبالؒ کا یہ شعر بھی لکھا ہے:

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

اقبالؒ کی تمام تر شاعری اس آتش رفتہ کا سراغ تلاش کرنے پر محیط ہے جس پر ملت اسلامیہ کا پرشکوہ ماضی سایہ فشاں ہے۔ ذوقی کے یہاں بھی حال کے پیمانوں سے ماضی کی آتش سیال جھلک رہی ہے۔ یہ عہد تو ماضی کو فراموش کرنے کا عہد ہے پھر ملت اسلامیہ تو آج ایک بھولی بسری فرسودہ سی شے ہوچکی ہے، اقبالؒ کی زبان شاعرانہ اوران کی اپنی ہے لیکن ذوقی کی نثر بھی شگفتہ ہے سریع الاثر ہے اوران کے اپنے طرز سے عبارت ہے۔

مشرف عالم ذوقی کے ناول کا حصہ اول جس کا عنوان 'آتش رفتہ کا سراغ' ہندوستانی مسلمانوں کی آپ بیتی ہے اور سرسٹھ برسوں کی دردناک داستان ہے۔

سات سوبیس صفحات کا یہ ناول دو ہزار تیرہ کی سب سے پہلی اور اہم تصنیف ہے دونوں فلیپوں پر ناول کے اقتباسات درج ہیں، کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، انتساب، ایک ناول بزم یاراں کے لیے، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین (ڈائرکٹر قومی اُردو کونسل) پروفیسر انور پاشا، ڈاکٹر ابرار رحمانی مدیر آج کل اُردو کے نام اور اس عالمی سیاست کے نام جہاں ہر مسلمان خوف کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے ناول کے عقبی صفحے پر مصنف کی تصویر اور پاکستان کے یونس خاں کی چار سطور درج ہیں جو برصغیر کے اس اہم ترین ناول کے سیاق وسباق میں بہت اہم ہیں۔

''میں نے ابھی ابھی اس ناول کو ختم کیا ہے اور میں ابھی بھی اس کے سحر میں گم ہوں یہ کہنا مشکل ہے کہ اس ناول کے سحر سے کب باہر نکل سکوں گا اس ناول کو لکھنا آسان نہیں تھا، پاکستان میں ہم ایسے ناولوں کا تصور بھی نہیں کرسکتے مجھے نہیں خبر کہ آپ کو اس کے لکھنے کا حوصلہ کہاں سے ملا''۔

ناول کے آغاز میں تیرہ صفحات کا دیباچہ ہے جس میں ناول نگار نے ناول لکھنے کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے جسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ذوقی کے سینے میں کیسی آگ بھڑک رہی ہے، کہیں کچھ بھی ہو کوئی کچھ بھی کرے مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے۔

'آتش رفتہ کا سراغ' میں ناول نگار نے اپنے دل کی تمام آتش سیال کو انڈیل دیا ہے اس کا دیباچہ اہم ہے خاص طور پر یہ پہلا اقتباس پیش ہے۔

''قیصر وکسریٰ کو فتح کرنے والوں کے نام دہشت گردی کی مہر لگادی گئی، سائنسی انقلابات نے ارتقا کے دروازے تو کھولے لیکن ڈی این اے اور جینوم سے زیادہ شہرت اے کے 47 اور دیگر اسلحوں کو ملی۔ایک زمانے میں جہاں علوم وفنون کے لیے ٹینڈرسل جیسے دانش ور مسلمان سائنس دانوں کی مثالیں دیا کرتے تھے وہاں دیکھتے ہی دیکھتے مغرب نے جیش، لشکر طیبہ، ظواہری اور اسامہ بن لادن کے نام لینے شروع کردیے انحطاط وذلت کی حد یہ ہے کہ مسلمانوں کو مسلسل اپنی وفاداری وحب الوطنی کی شہادت پیش کرنی پڑتی ہے۔

آتش رفتہ کا سراغ، حصہ اول خود میں دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے کا عنوان ہے 'سراغ سے قبل' جو 25 سے 182 صفحات پر مشتمل ہے دوسرا حصہ ''ڈراونی رات کے بعد'' 183 سے 339 صفحات تک ہے۔ان دونوں حصوں میں 2008 کے وہ واقعات ہیں جن میں مسلمانوں کو کس انداز سے دہشت زدہ کیا گیا کہ وہ اپنے ہی ملک میں خود کو غریب الوطن سمجھنے لگے۔ بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر اس کی سب سے بڑی مثال تھی مسلمانوں کا مذہبی لباس داڑھی، ٹوپی ان کے دہشت گرد ہونے کی علامت بنا کر انھیں بدنام کیا جانے لگا۔

ناول کا دوسرا حصہ 341 صفحات سے 569 صفحات تک پھیلا ہوا ہے جو 1986 سے 1992 تک ہے۔ یہ اس کہانی کے فروغ کا حصہ ہے جو حصہ اول سے شروع ہوتی ہے کردار وہی ہیں بس کچھ نئے بھی شامل کیے گئے ہیں لیکن یہ وہ زمانہ ہے جب بابری مسجد رام مندر کی اجودھیا تحریک چل رہی تھی اور فرقہ پرست عناصر ہندو مسلمانوں کے

درمیان نفرت کی تخم ریزی کررہے تھے۔

ناول کا تیسرا حصہ آب روان کبیر 571 صفحے سے شروع ہوکر704 صفحات تک محیط ہے جو 2010 سے مسلسل واقعات واحساسات کو ہمارے سامنے لاتے ہیں اور ایسا احساس ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ مصنف کے آئندہ ناولوں پر بھی محیط رہے گا۔ حصہ سوم کے آغاز میں اقبال کا یہ شعر درج ہے:

آب روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی　　دیکھ رہا ہے کوئی اور زمانے کا خواب

اقبالؒ کی شہرۂ آفاق نظم مسجد قرطبہ کا یہ شعر شاعر کے اس کرب کو ظاہر کرتا ہے جو ملت اسلامیہ کے تیئں اس کے دل میں تھا وہ ماضی کے شکوہ کا راز داں تھا اور خوب سمجھ رہا تھا کہ آئندہ کیا ظہور پذیر ہونے والا ہے مشرف عالم ذوقی نے حصہ سوم میں بہت سی ایسی باتیں کی ہیں جو اقبالؒ کے اس شعر سے مترشح ہیں۔

آخر میں 705 سے لے کر719 تک چند صفحات نقش گر حادثات کے عنوان سے ہیں جنھیں اس ناول کا تتمہ تو نہیں کہا جاسکتا ہاں ایک نئے ناول یا پھر ایک نئی تاریخ کا نقطۂ آغاز ضرور کہا جاسکتا ہے جن ارباب دانش نے اقبالؒ کی نظم مسجد قرطبہ کا انہماک سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ مشرف عالم ذوقی کے اس ناول میں پارے کی طرح دوڑتے ہوئے اس کرب کا اندازہ لگاسکتے ہیں کہ ذوقی نے اپنے لکھنے میں اپنا کتنا خون جگر صرف کیا ہے میں تو صرف ان کے آئندہ ناولوں کے بارے میں اقبال کا یہی شعر پڑھوں گا۔

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا　　گنبد نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

بڑا شہر اور تنہا آدمی

شاعر: پرویز شہریار

صفحات: 139، قیمت: 150

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ابرار احمد اعظمی، 155 سابرمتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی 67

اچھی شاعری زندگی کے گہرے شعور، انسانی اقدار کے شدید احساس اور جمالیاتی پہلوؤں کے صحیح ادراک سے وجود میں آتی ہے۔ ایسی شاعری معراج کمال کو اس وقت پہنچتی ہے، جب شاعر اس میں مفکرانہ آہنگ پیدا کردیتا ہے۔ موجودہ دور کی شاعری میں یہ خصوصیات بمشکل تمام ملتی ہیں۔ کچھ فنکار ایسے بھی ہیں جو اس عام روش سے ہٹ کر اپنا کام کررہے ہیں۔ شاعری جن کے لیے طاق جاں میں چراغاں کرنے کا دوسرا نام ہے۔ پرویز شہریار کا شمار ایسے ہی شاعروں میں ہوتا ہے۔

پرویز شہریار ادبی دنیا میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ضرور جانے جاتے ہیں۔ لیکن حال ہی میں ان کا اولیں شعری مجموعہ 'بڑا شہر اور تنہا آدمی' شائع ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہ 1984 سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ نظمیں لکھ رہے ہیں اور ایک اندازے کے مطابق اب تک سوا سو سے زائد نظمیں لکھ چکے ہیں۔ گویا ان کا پہلا مجموعہ تقریباً اٹھائیس تیس برسوں کی ریاضت کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔ یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ انھوں نے اس معاملے میں کسی قسم کی عجلت سے کام نہیں لیا اور نہ ہی اپنا سارا کلام چھپوا کر پیش کیا بلکہ ایک کڑے انتخاب کے بعد اپنی بہترین نظمیں ہی قارئین کی نذر کی ہیں۔

'بڑا شہر اور تنہا آدمی' پرویز شہریار کی ایسی ہی چنندہ نظموں کا مجموعہ ہے، جس میں انھوں نے عصر حاضر کی شہری زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو اپنے منفرد لب و لہجے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ پرویز شہریار نے اردو شاعری کی محبوب صنفِ سخن غزل کو چھوڑ کے نظموں کو کیوں اپنے جذبات وخیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ آیئے اس کا جواز خود ان ہی کی تحریروں میں ڈھونڈتے ہیں۔ شہریار نے اس ضمن میں اپنی اِس کتاب کے سرورق پر غالب کا مشہور زمانہ شعر درج کیا ہے جس سے اُن کا مافی الضمیر بخوبی مترشح ہوجاتا ہے:

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

حقیقت یہ ہے کہ عصر حاضر کے متغیر حالات ومتنوع موضوعات کے مؤثر اظہار کے لیے نظم سے زیادہ مناسب اور موزوں کوئی دوسری صنف ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اس صنفِ سخن میں اظہار کے لامتناہی امکانات اور بے پناہ صلاحیتیں مضمر ہوتی ہیں۔ اس میں شاعر اپنے اسلوب کی پوری پاسداری کے ساتھ اپنے موقف کے اظہار کا مجاز ہوتا ہے۔ اسی لیے پرویز شہریار نے اس کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔

'بڑا شہر اور تنہا آدمی' میں کل 52 نظمیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر نظمیں عصر حاضر کے معاشرتی تفاعل سے رونما ہونے والی محرومی، بے اطمینانی، اور غیر یقینی صورتِ حال اور اس سے انسانی رشتوں میں پیدا ہونے والی خودغرضی، بے ایمانی اور مفاد پرستی کو آشکارا کرتی ہیں۔ 'ہم امن چاہتے ہیں'، 'ہجرت کی صلیب'، 'تو کوئی کیسے غزل لکھے'، 'دل پر رکھ لو پتھر'، 'حافظے میں بسا ہوا شہر'، 'آج کا عہد نامہ' اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ جبکہ جمشید پور کے دو فسادات، قطب مینار، کھاڑی یدھ، قتل صدام حسین، شیطان بزرگ کو خدا ماننے والو! موضوعاتی نوعیت کی فکر کو مہمیز کرنے والی نظمیں ہیں۔ ان میں واقعہ اور فکر کا ایسا حسین امتزاج پایا جاتا ہے کہ وہ دل کو موہ لیتی ہیں۔ ان کی نظم 'دل پر رکھ لو پتھر' کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

اعتبار ہے دھوکا یہاں، یقین ہے فریب/ اپنے ہوجاتے ہیں پل میں پرائے
دوست بن جاتے ہیں یہاں ایک دن میں دشمن
نہ خدا کا خوف ہے یہاں، نہ انسانوں سے پیار
دردمندی یہاں نمائش ہے/ اور ہمدردی بیوپار
شیشے کا دل لے کر اپنا، کہاں چلے شہریار
اس مشینی دور میں سیکھ لو جینے کے گر ومنتر
آنکھیں اپنی موند لو/ دل پر رکھ لو پتھر

پرویز شہریار کی تخلیق کے سماجی سروکار کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سینے میں غریب کسانوں اور مزدوروں کے لیے دردمندی کا جذبہ ہردم موجزن رہتا ہے۔ قرض کے بوجھ سے دبے قحط زدہ کسانوں کی بڑھتی ہوئی خودکشی کے رجحان کو دیکھ کے وہ تڑپ اُٹھتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظم 'کسان ہیں کسان' کی یہ سطور دیکھیے:

حضور!/ یہ مزدور ہے مزدور
جو رات کو درد سے کراہتا ہے پھٹے بستروں پر
جو شام سے جلتا رہتا ہے اندھیرے گھروں میں پیہم
جس کی بیوی راتوں کو روتی ہے/ جس کی اولادیں بھوکی سوتی ہے
یہ انسان جیسے ہوتے ہیں/ مگر— کسان ہیں کسان

پرویز شہریار کی نظموں کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کی انھوں نے ہندوستانی اساطیر اور اسلامی تلمیحات سے بھی ابلاغ کا کام لیا ہے، جس کی وجہ سے ان کی نظموں میں جابجا ڈرامائی کیفیت سی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً، اس مجموعے میں شامل ان کی پہلی نظم 'صندل کی خوشبو اور سانپ' کی یہ چند سطریں دیکھیں:

گو تری زلف کوئی شنکر کی جٹا بھی نہیں/ پھر کیوں یہ افعی
تیری گردن، تیرے ناف تن میں حمائل ہونا چاہتا ہے؟

بار بار!/ تیرے صندل بدن کی خوشبو۔
کوئی امرت، کوئی سوم رس بھی نہیں/ پھر کیوں یہ دشت راہو کیتو کی طرح
پینا چاہتا ہے اسے بوند بوند، چال بازی سے

پرویز شہر یار شہری زندگی کے پیچیدہ ماحول سے پیدا ہونے والے مسائل کے ترجمان شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانی زندگی بالخصوص نوجوان اذہان کی مختلف اور متنوع کیفیات کی بہت ہی دلکش عکاسی کی ہے۔ بڑے شہر کی بھاگ دوڑ والی زندگی میں لاکھوں انسان ایک بہتر زندگی کی تلاش وجستجو میں آئے دن شکست وریخت سے دوچار ہوتے رہتے ہیں اور پھر اس کے حصول کے لیے جدوجہد کے دوران ایک وقت ایسا بھی آتا ہے، جب انسان خود کو بالکل تن وتنہا محسوس کر کے تھکنے لگتا ہے۔ لیکن شہر یار کا ایسے ہی دل شکستہ لوگوں کے لیے پیغام ہے کہ بڑھے چلو کہ زندگی کبھی رکتی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ، اس مجموعے میں شامل میراجی کی طرز پر لکھی نظم 'مقدس راتوں کا بلاوا' اور علی سردار جعفری کے رنگ میں ڈوبی نظم 'ایک نئی دُنیا کی خواہش' شہر یار کی عظمتِ افکار کی شاعری کی عمدہ مثال ہے۔ بلاشبہ یہ نظمیں ہماری توجہ چاہتی ہیں۔ ہم ایسی امید کرتے ہیں کہ 'بڑا شہر اور تنہا آدمی' بہت جلد ہی اپنے سنجیدہ قارئین کے حلقوں میں پسندیدگی کا مقام حاصل کرلے گا۔

تہذیب غزل کا شاعر: مجروح سلطانپوری

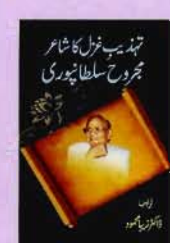

ترتیب: ڈاکٹر زیبا محمود
صفحات: 168، قیمت: 200 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6
مبصر: اقرا سبحان، ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ

مجروح سلطان پوری کی شخصیت وشاعری کا خاکہ پیش کرتی ہوئی یہ کتاب بائیس مختلف مصنّفین کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین سے پہلے 'تاثرات' کے عنوان سے دو مختصر مضامین ہیں، جن میں ڈاکٹر زیبا محمود کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ مقدمہ پروفیسر علی احمد فاطمی نے لکھا ہے اور ایک 'پیغام' ہے جو مرتبہ کے والد پروفیسر محمود الٰہی نے دیا ہے۔ یہ پیغام مختصر مگر جامع ہے، جس میں مجروح کی زندگی، ان کی شاعری، ان کی جائے پیدائش اور اس سے تعلق رکھنے والے فلمی نغمے کا ذکر ہے اور اسی کے ساتھ انھوں نے اپنی بیٹی کو دعا سے نوازا بھی ہے۔ یہ پیغام اس قدر جامع ہے کہ شاید اسی لیے یہ کتاب کے فلیپ پر بھی درج ہے۔ جمع کیے گئے یہ مضامین سلطانپور کے گنپت سہائے کالج کے سیمینار کا حصہ ہیں اور چند دیگر مضامین مثلاً رفعت سروش 'مجروح سلطان پوری: کچھ یادیں'، ڈاکٹر تنویر احمد علوی 'مجروح سلطان پوری موجودہ صدی کی ایک آواز'، پروفیسر شمیم حنفی 'ادھر بھی تماشا ہے میری کم سخنی کا'۔ خلیق انجم کی مرتب کردہ کتاب 'گلکاریِ وحشت کا شاعر مجروح سلطان پوری' سے بھی اخذ کیے گئے ہیں۔ جس کا اعتراف ڈاکٹر زیبا محمود نے 'زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر' میں جذباتی اور بڑے ہی انکسارانہ انداز میں کیا ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ ان اہم نقادوں کے مضامین مجروح فہمی میں اپنی نوعیت کے بالکل الگ اور مختلف مضامین ہیں۔

کتاب کو پڑھ کر، نہ صرف مجروح سلطان پوری کے سوانحی حالات کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ مضامین بھی زیبا محمود نے اپنی کتاب میں یکجا کیے ہیں جن سے مجروح صاحب کے بارے میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک ترقی پسند نظریات کے حامی تھے۔ اپنے شاعرانہ مزاج خاص طور سے غزل کے ساتھ ان کی نسبت اور دوسری طرف ترقی پسند تحریک کو غزل سے جو اختلاف تھا اس کے درمیان مجروح صاحب نے اپنے لیے کس طرح راہ ہموار کی اور یہ کہ غزل کے ساتھ ان کی دیوانگی فلمی گیتوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مجروح سلطان پوری نے ہر جگہ ہر میدان میں غزل جیسی صنف سخن پر نظر رکھی اور اس کی تہذیب اور اس کے اصول ونظریات سے انھیں ہمیشہ محبت رہی۔ شاید اسی مناسبت سے کتاب کا نام 'تہذیب غزل کا شاعر- مجروح سلطانپوری' رکھا گیا ہے۔ ادبی دنیا میں 'اقبال سمّان' اور فلمی دنیا میں 'دادا صاحب پھالکے' جیسے بڑے انعامات سے مجروح صاحب کو نوازا گیا۔ ترقی پسند تحریک ہو، چاہے فلم انڈسٹری دونوں جگہ انھوں نے غزل کے ذریعے اپنی چھاپ چھوڑی۔ لہٰذا یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی زندگی غزل کے لیے سہارا بنی یا غزل نے ان کو سہارا دیا۔ زیبا محمود کی ترتیب کردہ زیر تبصرہ کتاب میں شامل ان مضامین کا مطالعہ، ہمیں مجروح صاحب کو تفصیلی طور پر پڑھنے اور ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر اُکساتا ہے۔

بس یہی عیب اس کتاب میں نظر آتا ہے کہ ڈاکٹر زیبا محمود نے ایسے مضامین کا انتخاب کیا جن میں الفاظ کے الٹ پھیر سے کم وبیش ایک ہی بات دہرائی گئی ہے۔ مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے اس یکسانیت کے تحت اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ مثلاً مجروح کے یہ اشعار تمام ہی مضامین میں مل جائیں گے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر — لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں — میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا
سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ — اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

اس کے علاوہ مجروح کی شاعری میں جگر کی شاعری کا اثر، وہ بمبئی گئے صرف جگر کی وجہ سے، انھوں نے ترقی پسند ہونے کے باوجود غزل میں طبع آزمائی کی، وہ کم گو تھے، انھوں نے کم لکھا لیکن خوب لکھا اور نام پیدا کیا وغیرہ کثرت سے ملتے ہیں۔ ان مضامین میں سوانحی عنصر زیادہ ہے۔ اچھا ہوتا کہ اگر سوانحی مضامین کے ساتھ ساتھ، ان کی غزلوں اور ان کے فن پر گفتگو کرنے والے مضامین کا انتخاب بھی کیا جاتا یا پھر ان کی غزلوں یا فلمی نغموں سے لے کر ان کی نفسیات اور سوانحی کوائف بیان کیے جاتے یا پھر غزلوں اور فلمی نغموں کے تقاضوں کو بیان کر کے مقابلہ آرائی کرنے والے مضامین ہوتے تو مجروح کے فن کا مطالعہ دلچسپ ہوتا۔ اس کے باوجود کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے کچھ مصنّفین کے مضامین مثلاً بشریٰ خاتون 'مجروح غزل کے آئینے میں' اور ڈاکٹر لئیق احمد صدیقی 'مجروح کی شاعری میں زنداں کا تصور' بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ جنھوں نے کسی حد تک مجروح سلطان پوری کی نفسیات کو کھنگالنے کی کوشش کی ہے اور مجروح اور دوسرے شعرا کے ایسے اشعار درج کیے ہیں جن کا مرکزی خیال ایک ہی ہے لیکن بیان کا ڈھنگ بدل گیا ہے۔ لیکن یہ مضامین اس قدر مختصر ہیں کہ دلچسپی قائم ہونے تک مضمون اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

شاید المیہ یہی ہے کہ ہر اچھے ادیب اور شاعر کے سوانحی حالات زیادہ بیان کیے جاتے ہیں اور اس کے فن پر بات کم کی جاتی ہے۔ مجروح کے فن کا مطالعہ بھی کم ہی کیا گیا اور ان کی زندگی پر نظر زیادہ رکھی گئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ زیبا محمود سوانحی مضامین اکٹھا کرنے پر مجبور تھیں۔ بہرحال یہ منتخب مضامین باشعور قاری کو مجروح صاحب کے فن پر قلم اٹھانے میں ضرور معاون ہوں گے۔ ڈاکٹر زیبا محمود اس طور پر بھی مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے اردو ادب کے ایک باشعور شاعر سے متعلق مضامین یکجا کیے ہیں، جس سے ادب کے تئیں خود ان کے باشعور مزاج کا پتہ چلتا ہے۔

جونپور کے چند شعرا

(ماضی قریب اور حال کے آئینے میں)

مصنف: ایس ایم عباس، ترتیب وتزئین: محمد عرفان جونپوری

صفحات 232، قیمت: 250 روپے

ناشر: ایس ایم عباس محلہ تاڑتلہ جونپور یو پی

مبصر: محمد زکریا ندوی، 206 ستلج ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

شیراز ہند جونپور علمی و ادبی ثقافتی اور تاریخی اعتبار سے مردم خیز ہے۔ علما، ادبا، شعرا، محققین اور دانشوروں کی کثیر تعداد نے اس کی عظمت کے آفاق کو روشن کیا ہے اور ہر چہار دانگ عالم میں اس کی شہرت کی کرنوں کو پھیلایا ہے اور یہ شہر 'مدینۃ العلم والعلما' کے نام سے بھی موسوم ہے۔ شیر شاہ سوری نے اس شہر کے ایک مدرسہ میں تعلیم حاصل کی تھی اور پھر ہندوستان کی تاریخ میں اپنے عدل وانصاف اور ملک کی ترقی کے باب میں نمایاں خدمت کی وجہ سے زندہ ہیں۔ ملاجیون، ملامحمود، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ظہیرالدین، سرشاہ سلیمان، پروفیسر مجتبیٰ حسین، مجتبیٰ حسن، نورالدین زیدی، افتخار اعظمی، پروفیسر عبدالودود، جمیل فاروقی، مرزا متین سروش، اسامہ فاروقی، علی ضامن ترمذی، سید اقبال جونپوری، سید غلام سمنانی، سراج الحق مچھلی شہری، آفاق مچھلی شہری جیسی نابغۂ روزگار شخصیات کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔ زیرتبصرہ کتاب 'جونپور کے چند شعرا ماضی قریب اور حال کے آئینے میں' اردو کے معروف ادیب وناقد وافسانہ نگار ایس ایم عباس کی تازہ ترین کتاب ہے جس میں انھوں نے جونپور کی تاریخ وتہذیب کے علاوہ اس شہر کی تخلیقی شناخت کے معتبر حوالوں سے بھی روشناس کرایا ہے۔ ایسی شخصیات میں حفیظ جونپوری، شہیر مچھلی شہری، شفیق جونپوری، سلام مچھلی شہری، سجاد ظہیر، منشی محسن رضا رضا جونپوری، وامق جونپوری، عزیز ربانی عزیز، کامل شفیقی، ہوش جونپوری، شوکت پردیسی، نسیم واسطی، پرواز جونپوری قابل ذکر ہیں۔

جونپور سے ہی بعض ایسی شخصیات کا تعلق ہے جن کے افکار سے اردو ادب کا منظرنامہ روشن ہے۔ سجاد ظہیر اور وامق جونپوری دو شخصیت تو ایسی ہیں، جن کے بغیر ترقی پسند تحریک کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکی۔ حفیظ جونپوری کا شمار بھی ایسے شعرا میں ہوتا ہے جن کے ایک شعر نے ہی انھیں زندہ جاوید کردیا ہے۔ ان کا یہ شعر زبان زد خاص وعام ہے:

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے   ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

سلام مچھلی شہری کا شمار بھی اردو کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے شعرا ہیں جن سے اردو کے قومی شعری منظرنامے کو تابندگی اور درخشندگی ملی ہے۔ بقید حیات شعرا میں اسلم سہیل، منہاج احمد رہبر جونپوری، عارف برقی، عبرت مچھلی شہری، احمد نثار جونپوری، پی سی وشنکر ماہر یم جونپوری، عباس حسین احساس پر مضامین لکھے ہیں۔ یہ تمام مضامین اس لیے بھی اہم ہیں کہ ان سے جونپور کے جدید تخلیقی منظرنامے کی تفہیم میں مدد مل سکتی ہے۔

جونپور کی تخلیق تہذیب اور تاریخ کے حوالے سے ماضی میں بھی کچھ کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اس کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں بعض شخصیات پر جو تفصیلات ہیں وہ کہیں اور نہیں ملتیں۔

پروفیسر عبدالحق نے بھی تعارف میں اعتراف کیا ہے کہ "شفیق و وامق کے علاوہ شیراز ہند کے موقر ومعتبر فنکاروں پر لکھے گئے مضامین بڑی افادیت کے حامل ہیں۔ شہیر مچھلی شہری پر لکھا گیا مضمون معلومات افزا ہے اور نیا بھی۔ اسی طرح سلام مچھلی شہری پر ان کے تاثرات بڑی اہمیت رکھتے ہیں، اسلم سہیل اور حفیظ جونپوری وغیرہ پر تعارفی مضامین بڑے گراں قدر ہیں۔ ان میں عرفان کے ادبی ذوق کی سرشار کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور ان کے زمیں نسبتوں کا شعور ایک فطری رجحان بن کر ابھرتا ہے۔"

دوسری خوبی یہ بھی ہے کہ ان شخصیات سے مصنف کا براہِ راست رشتہ رہا ہے۔ اس جہت کی طرف سے عرفان جونپوری نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اکثر ادیب وشاعر ایسے ہیں کہ جن سے مصنف کا براہِ راست تعلق رہا ہے اور موصوف نے جنھیں ادبی محفلوں میں دیکھا اور سنا بھی ہے اور ان کی نگارشات کا بغائر مطالعہ بھی کیا ہے۔"

آج کے عہد میں علاقائی تذکروں کی ضرورت کا احساس شدت سے ہونے لگا ہے اور اس تعلق سے کتابیں بھی شائع ہورہی ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی ضرورت کی تکمیل کرتی ہے۔ مصنف کی محنت قابل ستائش ہے امید کہ ادبی حلقے میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

با ادب با محاورہ ہوشیار!

مصنف: نادر خان سرگروہ

صفحات: 96، قیمت: 150: روپے

ناشر: برنٹ ژون، نزد پنجاب نیشنل بینک، بسٹو پور، جمشید پور

مبصر: محمد فیروز اختر، E-011، مہاندی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

با ادب با محاورہ ہوشیار! نادر خان سرگروہ کے مزاحیہ مضمون کا مجموعہ ہے۔ اس میں سولہ مضمون شامل ہیں۔ سبھی مضمون میں طنز ومزاح کا عنصر شامل ہے۔ 'زبان ہے تو جہان ہے' عنوان کے تحت مصنف نے الگ الگ زبانوں کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ جس میں ملکی، غیرملکی اور علاقائی زبانیں شامل ہیں۔ مختلف زبانوں کے جاننے کے کیا کیا فائدے ہیں اور نہ جاننے سے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، ان تمام پہلوؤں پر انھوں نے مزاحیہ انداز میں اپنی بات کو پیش کیا ہے۔

'نٹ کھٹ روزہ دار' عنوان کے تحت چھوٹے بچوں کے روزہ رکھنے پر دلچسپ اور بچوں کی نفسیات پر مبنی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے تحت بچوں کے تمام حرکات وسکنات بیان کئے گئے ہیں۔ روزہ، افطار، نماز، تراویح اور عید تک کے دوران بچوں کو کن کن حالات سے گزرنا پڑتا ہے اس کی مکمل وضاحت کی گئی ہے۔ ان میں بچوں کی شرارتیں اور والدین کی نصیحتیں بھی شامل ہیں۔

'دنیا بھر کے راستے واستے' کے تحت انھوں نے شہری، دیہی، ملکی اور غیرملکی راستوں میں آنے والی پریشانیوں اور رکاوٹوں کا ذکر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے۔ اجنبی شہر میں انسان کسی دوسرے سے پتہ پوچھ کر ہی اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ حالات اس وقت اور سنجیدہ ہوجاتے ہیں جب آپ کو کوئی غلط پتہ بتا دے۔ جیسے جیسے شام ڈھلتی ہے مسافروں کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت رکتا ہے جب مسافر اپنی منزل تک پہنچ جائے۔ راوی کا بیان ہے "ممبئی شہر میں راستے پہ چلنا ایسا ہے جیسے قطار میں چلنا۔ ایک دوسرے کے دھکے سے ہی پورا شہر چلتا ہے"۔

"اونٹ پہاڑ کے نیچے" اس میں مصنف نے لفظ 'پہاڑ' سے متعلق تمام چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ خاص کر پہاڑ سے متعلق محاوروں کے استعمال پر بات کی گئی ہے۔ "پیسا..... ہے ہی ایسا" کے تحت پیسے کی اہمیت وافادیت اور اس کے استعمال کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ ایک انسان اپنی زندگی میں پیسے کے لیے کیا کیا نہیں کرتا ہے۔ اس کی حصولیابی کے لیے جو نہیں کرنا چاہیے وہ بھی کر گزرتا ہے۔ اس میں انسان کی عزت بھی ہے اور ذلت بھی۔ "ہر جوتے کے دن پھرتے ہیں" یہ مضمون سابق امریکی صدر بش کی پریس کانفرنس اور عراقی صحافی، منتظر الزیدی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اسے موضوع بنا کر مصنف نے عراقی عوام کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ ان کے اوپر ڈھائے گئے ظلم اور بربریت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی کی اوقات دیکھنا ہو تو اس کے جوتے دیکھو اور کسی

کو اس کی اوقات دکھانا ہو تو اس کو جوتا دکھاؤ۔

''کینگروکی ماں کب تک خیر منائے گی'' ورلڈ کپ 2007 اور آسٹریلیائی کرکٹ ٹیم کے متعلق ہے۔ آسٹریلیا کے سامنے باقی ٹیموں کا کیا حشر ہوتا اسے نہایت ہی دلکش اور مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر نادر صاحب کو خوب آتا ہے۔ 'ہنوز بلی دور است' میں انسانی زندگی میں چوہوں کا کیا رول ہے کس کس طرح سے چوہے انسانوں کو پریشان اور نقصان پہنچاتے ہیں، ان تمام باتوں پر پرمزاح گفتگو کی گئی ہے۔ عنوان ''تصویر کے ہر رنگ میں.....'' تصویر کے متعلق عجیب وغریب باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ شادی بیاہ کا موقع ہو یا کوئی سیاسی پارٹی کی میٹنگ یا کوئی اور سماجی تقریب۔ ہر جگہ تصویر کشی عام بات ہوگئی ہے۔ تصویروں کی نمائش بھی ہوتی ہے۔ مقابلے میں ایسی تصویروں کو پہلا انعام ملتا ہے، جس میں بھکمری کا شکار بچہ نظر آتا ہے۔ تصویر میں نظر آنے والے ایسے بھوکے ننگے بچے نہ جانے کتنے آسودہ حال لوگوں کا پیٹ اور ان کی جیبیں بھرتے رہتے ہیں۔ ''ٹرکی ادب'' میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ٹرک والے اپنی گاڑیوں کی پشت پر اشعار کندہ کرواتے ہیں۔ ان ٹرکوں کا بھی اردو ادب کے فروغ میں حصہ ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیں:

نہ ملا ہے نہ ملے گا مجھے آرام کہیں   میں مسافر ہوں، میری صبح کہیں شام کہیں

''چھوٹے موٹوں کا بچپن'' بچوں کے موٹاپا اور اس کے اسباب پر بات کی گئی ہے۔ موٹاپے سے ہونے والی مختلف قسم کی بیماریاں اور آنے والے خطرات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ ''خاکہ 'قدیم خاں ازلی' بھی نہایت ہی دلچسپ ہے۔ شگفتہ اسلوب کے پیرائے میں پوری کہانی بیان کی گئی ہے۔ 'کچھ تفریح، کچھ معلومات' کے تحت 'دم سانہیں دیکھا'، 'پیشہ اور پیشہ ور'، 'ہشیار باش!'، 'انڈاسکوپی' یہ تمام عنوان بھی قابل مطالعہ ہیں۔ مصنف نے ان تمام تحریروں میں مزاح کا پہلو نکالا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تمام مسئلوں کا حل بھی پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

طنز و مزاح اور مولانا ابوالکلام آزاد

مصنف: ڈاکٹر خالد مبشر

صفحات: 184، قیمت: 150 روپے

ناشر: ادبستان پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: نوشین حسن، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو ادب میں مولانا ابوالکلام آزاد ایک جید عالم کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ وہ بیک وقت اعلیٰ پایہ کے ادیب، مورخ، سیاست داں، مفکر، مدبر اور انشاپرداز ہونے کے ساتھ طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب 'طنز و مزاح اور مولانا ابوالکلام آزاد' ڈاکٹر خالد مبشر کا ایک تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے۔ وہ دور حاضر کے ایک ایسے ابھرتے ہوئے ستارے کے مانند ہیں جن کی روشنی مستقبل قریب میں نمایاں ہوتی نظر آئے گی۔ ان کی بہت سی کتابیں زیر طبع ہیں۔ ان میں 'مقدماتی ادب' (تحقیق و تنقید) 'تخلیق و تنقید' (ترتیب)، 'مقدمات رشید حسن خاں' (ترتیب)، 'مقدمات مسعود حسن خاں'، (ترتیب)، 'حرف تمنا'، (شعری مجموعہ)، 'پیش نقش' (مضامین کا مجموعہ) قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ تمام کتابیں اور ان کے موضوعات، اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ موصوف بلیغ نقطۂ نظر کے حامل قلم کار ہیں جنھوں نے اتنی کم مدت میں تحقیقی و تنقیدی کارنامے انجام دیے۔ علاوہ ازیں وہ مختلف تعلیمی اداروں کی طرف سے، حوصلہ افزا انعامات سے بھی سرفراز ہو چکے ہیں۔

یوں تو مولانا ابوالکلام آزاد اپنی شعلہ نما تحریروں کی وجہ سے ادب میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسی قدر آور شخصیت ہیں جن کو قدرت نے بہت سے اوصاف سے نوازا تھا۔ انھوں نے تعلیمی، سیاسی، معاشی، ہر میدان میں کامیابی اور کامرانی کے جھنڈے گاڑے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے چاہنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ نیز مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں پر مبنی بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جس میں ناقدین نے مولانا آزاد کے تمام ادبی اوصاف نمایاں کر دیے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'طنز و مزاح اور مولانا ابوالکلام آزاد'، اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جو ادبستان پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوئی۔ 184 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور طنز و مزاح کے فنی مباحث سے لے کر، اس کے آغاز و ارتقا و ظرافت و مبادیات کے حوالے سے، تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ باب دوم 'فکاہیہ کالم نگاری فن اور تنقیدی تاریخ' پر مبنی ہے۔ دراصل یہ کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے، جو کافی وقیع ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ یہ وہ گوشہ ہے، جس پر اہل قلم کی نظر بہت کم پڑی اور اگر پڑی بھی تو انھوں نے نا قابل التفات سمجھا۔ خالد مبشر نے مولانا آزاد کے اس پہلو کو بڑے عزم کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں موصوف لکھتے ہیں کہ:

''مولانا آزاد کے اس پہلو کو نہ صرف 'ماہرین ابوالکلامیات نے حاشیے میں ڈالنے کی غلطی کی ہے بلکہ طنز و مزاح کے سربرآوردہ نقادوں نے بھی قابل التفات نہیں سمجھا۔'' (ص 111)

باب دوم بہ عنوان 'مولانا آزاد کی طنز و مزاح نگاری' کو شامل کیا گیا ہے۔ اس باب میں وہ الہلال والبلاغ کا پس منظر اور اس کے اسلوب پر مدلل گفتگو کرتے ہیں اور اس میں شائع ہونے والے 'افکار و حوادث' کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرتے ہیں اور اس کے آغاز وارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔

بہرحال یہ کتاب ڈاکٹر خالد مبشر کا لائق ستائش کارنامہ ہے، جنھوں نے 'ابوالکلامیات' کے بیش قیمت ذخیرے میں سے 'فکاہیہ کالم نگاری' کے روپ میں وہ کوہ نور ہیرا بازیافت کیا ہے، جس کو تقریباً تمام ناقدین نے نا قابل توجہ سمجھ کر ایک کونے میں چھوڑ دیا تھا۔ موصوف نے اس پہلو کو اپنی تحقیقی کاوشوں اور پختہ وضاحتوں اور دلیلوں کے ساتھ، مولانا آزاد کو باضابطہ کسی مخصوص عنوان کے تحت 'فکاہیہ کالم نگاری' کا بانی قرار دیا۔ کسی بھی تحریر کا اسلوب ایک ایسا ذریعہ (میڈیم) ہوتا ہے، جس کے توسط سے مصنف اپنے خیالات کا اظہار، گنجلک اظہار و پیرائے میں تحریر کر سکتا ہے اور آسان، سادہ انداز و بیان میں بھی، یہاں پر خالد مبشر کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں کیونکہ انھوں نے اس کتاب میں عالمانہ گفتگو کرنے کے بجائے، سادہ شیریں اور آسان نثر میں اپنی بات کہی ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے موضوع کا تعلق ہے، وہ قابل تحسین ہے، لیکن جس طرح کتاب میں 'مولانا آزاد کی 'فکاہیہ کالم نگاری' پر مصنف نے سیر حاصل بحث کی ہے، جس کو دیگر کتب میں آسانی کے ساتھ تلاش کرنا محنت طلب ہے۔ یہاں پر میری ناقص رائے یہ ہے کہ اس کتاب کا موضوع 'اردو میں فکاہیہ کالم نگاری اور مولانا ابوالکلام آزاد' ہوتا، تو زیادہ مناسب تھا کیونکہ اس کتاب کے بیرون میں پوشیدہ اور قیمتی فکاہیہ کالم نگاری، ٹائٹل پیج سے ہی عیاں ہو جاتی۔ البتہ کتاب کافی دیدہ زیب ہے۔ پروف کی غلطیاں بہت کم ہیں بلکہ یوں کہیے نہ کے برابر ہیں، کتاب کے اختتامیہ پر حوالہ جات کا اہتمام وضاحتی انداز سے کیا گیا ہے۔ بعد ازیں کتابیات کو بھی حروف تہجی کے اعتبار سے شامل کیا گیا ہے نیز کتاب کی اہمیت منفرد نوعیت کی سی ہے جو قابل توجہ ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک مشترک اسلوب کے ضمن میں ایک ایسی دستاویز بھی ہے، جو نہ صرف ادبی حلقوں میں بلکہ طالب علموں کے لیے بھی کافی مفید ثابت ہوگی۔ ■

یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ترانے کی خاص پیشکش

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ترانے کے خالق اسرارالحق مجاز کے 102 ویں یومِ پیدائش پر منعقد کیے جارہے پروگراموں کے سلسلے کے تحت کینیڈی ہال میں نان اسٹاپ ترانہ پیش کیا گیا۔ اس نان اسٹاپ ترانہ میں یونیورسٹی کے پچاس طلبا و طالبات نے حصہ لیا

اور اپنی پیش کش سے سبھی کا دل جیت لیا۔ یہ ترانہ مسلسل ایک گھنٹہ تک پیش کیا گیا۔ ترانہ مختلف سازوں گٹار، ہارمونیم اور ہندوستانی سرگم الاپ وسوپرانو ٹینر ووکل سنگنگ اور الگ آواز کی پیچ واسکیل جسے گانا بے حد دشوار ہوتا ہے، میں پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر پرووائس چانسلر برگیڈیئر (ریٹائرڈ) ایس احمد علی، سابق طالب علم تنویر حاذق، ڈاکٹر نذر عباس، ڈاکٹر مسرور سیٹھ، جی ای سی کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر ایف ایس شیرانی وغیرہ بھی موجود تھے۔ یہ پروگرام غزل سنگر جانی فاسٹر کی ہدایت میں تیار کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 12 اپریل 2013

میڈیا کے ذریعے سائنس کی مقبولیت پر سیمینار

علی گڑھ: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ اور وگیان پرسار، حکومت ہند کی جانب سے منعقدہ سیمینار و ورکشاپ 'سائنس کی مقبولیت کے بذریعہ طباعتی ذرائع ابلاغ میں' ڈاکٹر ٹی وینکٹیشورن رجسٹرار وگیان پرسار، وزارت سائنس وٹیکنالوجی، حکومت ہند نے بتایا کہ ان کا ادارہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں جن میں اردو بھی شامل ہے، سائنسی علوم پیش کرنے کا منصوبہ رکھتا ہے اور اس پر کام کر رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس ضمن میں نصابی وعمومی سائنس کو عام کرنا وگیان پرسار کا اہم مقصد ہے۔ مہمانِ خصوصی ممتاز سائنس داں واولین وائس چانسلر مانو پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری نے سائنس کے حوالے سے اردو زبان کے مستقبل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہر زبان اپنی ضرورت اور اہمیت کی بنیاد پر پروان چڑھتی ہے۔ اردو ایک شیریں زبان ہے اس کا دامن وسیع ہے۔ اگر ہم عمومی و نصابی سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنا شروع کر دیں تو اس کا مستقبل شاندار ہوگا۔ پروفیسر عرفان حبیب نے خطبہ افتتاحیہ میں اردو میں سائنسی علوم کے فروغ پر روشنی ڈالی اور دہلی کالج کے ماسٹر رام چندر سے لے کر حیدرآباد کی جامعہ عثمانیہ اور شمس الامراء کی کوششوں کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے اردو طبقے میں سائنس کا ذوق وشوق رکھنے والے عوام کے لیے ہر قسم کے علوم کو دستیاب کرانے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ جہاں بھی ممکن ہو، دینی مدارس میں بھی سائنسی علوم کی رسائی کو یقینی بنانے کی کوشش ہونی چاہیے۔ وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں نے اردو میں سائنسی کتب کی اشاعت پر زور دیا۔ پروفیسر محمد ظفرالدین، سیمینار ڈائرکٹر، صدر شعبۂ ترجمہ نے ورکشاپ کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے سائنسی ادب کو عام کرنے اور سائنسی مضامین کو مقبول بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 10 اپریل 2013

کشمیر یونیورسٹی کے اردو طلبا کے اعزاز میں استقبالیہ

نئی دہلی: کشمیر یونیورسٹی سے اردو اور ماس میڈیا کے طلبا کے ایک گروپ نے دہلی کا اپنا تعلیمی دورہ کیا۔ کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر الطاف انجم اور ان کے رفیق کار ریاض صدیقی نے گروپ کی قیادت کی۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں طلبا واساتذہ کے اس گروپ کا والہانہ استقبال کیا گیا، پروفیسر محمد شاہد حسین، پروفیسر معین الدین جینابڑے، پروفیسر رام بخش جاٹ، ڈاکٹر آصف زہری اور ڈاکٹر شفیع ایوب نے کشمیری طلبا سے خطاب کیا۔ ناظم جلسہ ڈاکٹر شفیع ایوب نے طلبا اور اساتذہ کا استقبال کیا اور ہندوستانی زبانوں کے مرکز کی تاریخ اختصار کے ساتھ بیان کی، اس کے بعد پروفیسر محمد شاہد حسین نے تفصیل سے شعبے کی کارکردگی پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر آصف زہری نے طلبا کو سنجیدگی سے مطالعہ کرنے کی ترغیب دی۔ ڈاکٹر الطاف انجم نے اپنے اس تعلیمی سفر کے مقاصد بیان کیے اور بتایا کہ کشمیر میں اردو پڑھنے والوں کی حقیقی صورت حال کیا ہے۔

دوپہر کے بعد کشمیر یونیورسٹی کے اردو طلبا کا یہ کارواں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان پہنچا جہاں ان کے اعزاز میں ایک شاندار استقبالیہ جلسہ ہوا۔ اس جلسے کی صدارت اردو کے معروف نقاد شاعر اور شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر و پروفیسر عتیق اللہ نے کی۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے تجربات کی روشنی میں بتایا کہ اردو زبان آج دنیا کے مختلف حصوں میں کامیابی کے پرچم لہرا رہی ہے اور اردو کے مستقبل سے قطعی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس موقعے پر طلبا کے نگراں استاد ڈاکٹر الطاف انجم نے تعلیمی دورے کے اغراض و مقاصد سے حاضرین کو آگاہ کیا۔ طلبا کو قومی اردو کونسل سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'اردو دنیا' کی ایک ایک کاپی اعزازی طور پر پیش کی گئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالحی اور معید رشیدی نے کشمیر کے اردو طلبا کا خیر مقدم کیا اور کونسل سے متعلق کچھ اہم باتوں پر اظہار خیال کیا۔ واضح رہے کہ نظامت فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی کا ہی نہیں بلکہ پوری ریاست کا ایک ایسا اہم ادارہ ہے جو اردو زبان، ادب اور صحافت کی تدریس اور ترقی کے لیے مختلف قسم کی سرگرمیاں کر رہا ہے۔ اس ادارے کی ناظمہ پروفیسر نیلوفر خان ہمیشہ اردو کی سرگرمیوں کے لیے فراخدلی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 اپریل 2013

عالمی اردو نامہ

دوحہ قطر

سترہواں عالمی فروغ اردوادب ایوارڈ

اس سال 'سترہویں (17) عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ' کی جیوریز میٹنگیں نئی دہلی اور لاہور میں بالترتیب 15 اپریل اور 20 اپریل کو منعقد ہوئیں جن میں اردو کے ممتاز فکشن نگار اور صحافی جناب نند کشور وکرم اور نامور ناول نگار محترمہ نثار عزیز بٹ صاحبہ کو مشترکہ طور پر اِس دنیائے اردو کے موقر ترین ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا، یاد رہے کہ 'عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ' تواتر و تسلسل کے ساتھ گزشتہ سترہ سال سے لائف ٹائم گراں قدر نثری خدمات کے اعتراف میں ایک ہندوستانی اور ایک پاکستانی نثر نگار کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپے کیش، طلائی تمغہ اور سپاس نامہ پر مشتمل ہے۔

ہندوستانی جیوری کے چیئرمین پدم بھوشن و ستارۂ امتیاز سے نوازے گئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اراکین جیوری پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر شافع قدوائی مجلس کے کورآڈینیٹر (ہند) کفایت دہلوی کی معیت میں ایوارڈ کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان سے محترم نند کشور وکرم اردو کے اُن بے لوث اور بے نیاز خدمت گاروں میں ہیں جو نصف صدی سے بھی زائد عرصے سے اردو نثری ادب، اردو فکشن اور اردو کی ادبی صحافت کی بے مثال خدمت کر رہے ہیں۔ نند کشور وکرم کے ناول 'انیسواں ادھیائے' کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ ناول جو برصغیر کے تہذیبی اور سماجی تہہ نشیں رشتوں پر مبنی ہے، نہایت مقبول و معروف ہوا اور پاکستان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ مجلس فروغ اردو

ادب دوحہ قطر کا 2013 کا 'عالمی فروغ اردو ایوارڈ' فکشن میں نند کشور وکرم کی مجموعی تخلیقی خدمات کے لیے دیا جارہا ہے۔ جناب نند کشور وکرم کے افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی کل تصانیف کی تعداد پچاس سے بھی زائد ہے۔ وہ اردو کے مشہور ادبی رسالہ 'آج کل' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہے۔ وہ پچھلے تقریباً بیس برسوں سے 'عالمی اردو ادب' کے نام سے ایک ضخیم جریدہ نکالتے رہے ہیں۔ اس سے قبل بھی انھیں متعدد انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے جن میں وزارت زراعت، حکومت ہند کا انعام، اتر پردیش اردو اکادمی اور مغربی بنگال اردو اکادمی کا انعام، غالب انسٹی ٹیوٹ کا ایوارڈ اور انو واد پریشد کا ایوارڈ شامل ہے۔ عہد حاضر کے اہم تخلیق کار اور ستارۂ امتیاز جناب مشتاق احمد خان یوسفی، جو پاکستان جیوری کے صدر نشین ہیں، بوجوہ اجلاس میں تشریف نہ لا سکے۔ وائس چیئرمین جناب مختار مسعود نے اُن کی نیابت کرتے ہوئے اجلاس کی صدارت کی، صاحب اسلوب انشاپرداز جناب مختار مسعود صاحب نے اراکینِ جیوری جناب مسعود مفتی صاحب، پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی اور کوآرڈی نیٹر مجلس جناب داؤد احمد ملک کی موجودگی میں ایوارڈ کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان سے محترمہ نثار عزیز بٹ صاحبہ گزشتہ چھ دہائیوں سے کسی صلے کی پروا کیے بغیر اردو فکشن کی بے مثال خدمت کر رہی ہیں۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور لیکچرار میتھ کیا، 1951 تا 195 فرنیٹر کالج فار ویمن پشاور اور 195 تا 1956 سنٹرل کالج فار ویمن کراچی سے وابستہ رہیں۔

ہفت زباں محترمہ نثار عزیز بٹ صاحبہ کی تخلیقی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کے پانچویں عشرے سے ہوتا ہے، اب تک ان کے چھے (6) ناول اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ نگری نگری پھرا مسافر (195)، کو کافی شہرت ملی۔ 'نے چراغ، نے گلے (1973)' نے بھی محبانِ ادب کو

جاپان

ڈاکٹر معین الدین عقیل کو اعلیٰ ترین سول اعزاز

29 اپریل کو جاپان کے قومی دن کے موقعے کی مناسبت سے شہنشاہِ جاپان نے عالمی سطح کی 40 ممتاز شخصیات کو ان کی علمی اور تہذیبی خدمات کے لیے جاپان کے اعلیٰ ترین سول اعزاز (Order of the Rising Sun) سے نوازا جن میں پاکستان سے نامور محقق اور اسکالر اور جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو کے سابق پروفیسر اور صدر ڈاکٹر معین الدین عقیل کو ان کی اُن خدمات کے اعتراف میں، جو وہ علم اور ادب کے شعبے میں اور خاص طور پر جاپان میں اردو اور مطالعات پاکستان کی تدریس اور تحقیقات کے فروغ کے لیے انجام دیتے رہے ہیں، اس اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ جاپان اور پاکستان کے درمیان ثقافتی اور علمی روابط کے فروغ میں بھی ان کی خدمات جاپان میں سرکاری، علمی اور تعلیمی حلقوں میں عام طور پر قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر عقیل ایک طویل عرصے تک کراچی یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں اور ساتھ ہی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں کلیۂ زبان و ادبیات کے ڈین کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دینے کے علاوہ مجموعی طور پر دس سال تک یورپ میں اٹلی کی 'اورینٹل یونیورسٹی' اور جاپان کی چار نامور یونیورسٹیوں میں مہمان پروفیسر اور ریسرچ فیلو کے طور پر منسلک رہے ہیں اور اس طرح سات یونیورسٹیوں سے مستقل اور باقاعدہ وابستگی کا ایک ایسا اعزاز بھی انھیں حاصل ہے جس کی مثال کم ہی نظر آتی ہے۔ ملک اور بیرونِ ملک اردو اور انگریزی زبانوں میں ان کی ساٹھ سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور تین سو سے زیادہ مقالات عالمی معیار کے مجلوں میں چھپ چکے ہیں۔

بحوالہ بزم قلم گوگل گروپ، 30 اپریل 2013

اپنی طرف متوجہ کیا۔ اسی طرح 'کاروانِ وجود (1981)، 'دریا کے سنگ (1978) اور 'گئے دنوں کا سراغ' (2004) نے بھی فکشن کے رسیا قارئین کو فیضیاب کیا۔

حکومت پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر 1999 میں پرائڈ آف پرفارمینس سے نوازا۔ پاک و ہند کے مختلف ادبی مراکز اور ادبی شخصیات کی طرف سے 'سترہویں (17) عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ' کے ونرز جناب نند کشور وکرم اور محترمہ نثار عزیز بٹ صاحبہ کو ہدیۂ تبریک پیش کیا گیا۔ شیزان ہوٹل دوحہ میں چیئرمین مجلس محمد عتیق کی زیرِ صدارت ہونے والے اجلاس میں اراکین مجلسِ انتظامیہ شوکت علی ناز، سید فہیم الدین، پروفیسر فرتاش سید، جاوید ہمایوں اور اعجاز حیدر نے شرکت کی۔ محمد عتیق نے مجلس فروغ اردو ادب کے 'سترہویں (17) عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ' کا اعلان کرتے ہوئے پینل آف ججز کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ 'سترھواں (17) عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ' ان دونوں کو 31 اکتوبر 2013 کو دوحہ شیراٹن، ہوٹل قطر میں دیا جائے گا۔

رپورٹ: شوکت علی ناز، اردونیٹ جاپان 26 اپریل 2013

نیپال

م۔افضل کو ہمالیائی اردو ادب ایوارڈ

کاٹھمانڈو: ہندوستان کے معروف صحافی و سابق سفیر ممبر پارلیمنٹ م افضل کو کاٹھمانڈو میں نیپال کے سب سے بڑے ایوارڈ، ایوارڈ برائے صحافت (ہمالیائی اردو ادب ایوارڈ) سے سرفراز کیا گیا۔ م افضل نے کہا کہ ہم شکرگزار ہیں زاہد آزاد جھنڈانگری کے جنھوں نے مجھے نیپال کے واحد ایوارڈ ہمالیائی اردو ادب ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ صدر انجمن ارتقائے اردو ادب زاہد آزاد جھنڈانگری نے کہا کہ صحافت سے دائمی زندگی ملتی ہے، اصحاب قلم واہل تالیف، اور فن صحافت سے وابستہ افراد دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں، لیکن ان کے رشحات قلم ایک عرصے تک باقی رہتے ہیں۔ نیپال اردو اکادمی کے صدر ثاقب ہارونی نے کہا کہ ہم م افضل کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے ہماری دعوت قبول کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اپریل 2013

اسپین

اردو کی تین اہم کتابوں کے اسپینی ترجمے

روسیو موریو نس الونسو

اسپین کی قومی زبان اسپینش میں اردو افسانوی ادب کے شاہکار امراؤ جان ادا، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور عطر کافور منتقل کیے جاچکے ہیں۔ یہ اہم کام محترمہ روسیو موریونس الونسو (Rocio Moriones Alonso) نے انجام دیا ہے۔ محترمہ روسیو اسپین کی باشندہ ہیں لیکن ان کی ولادت اٹلی کے دارالحکومت روم میں 19 اکتوبر 1968 کو ہوئی جہاں ان کے والد UNO کے ادارے FAO میں مترجم (انگریزی سے اسپینش) تھے۔ وہ انگریزی، فرنچ، اطالوی، عربی، روسی اور جرمن زبانوں کے واقف کار تھے۔ ان کا انتقال بارہ سال پہلے ہوا۔ محترمہ روسیو اپنی والدہ، دو بھائی اور تین بہنوں کے ساتھ اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ میں رہتی ہیں۔ انھوں نے موسیقی میں ایم اے کیا ہے۔ پہلی بار 1996 میں وہ دہلی آئی تھیں اور دہلی یونیورسٹی میں موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1998 میں اسپین چلی گئیں۔ 2004 میں دوبارہ ہندوستان کا سفر کیا اور بنارس ہندو یونیورسٹی میں تعلیم کی شروعات کی۔ وہ اردو، ہندی، اطالوی، فرنچ، انگریزی اور فارسی زبانوں سے واقفیت رکھتی ہیں۔ اِن دنوں شعبۂ فارسی میں یو.جی ڈپلوما کے آخری سمسٹر کا امتحان دے کر فارغ ہوئی ہیں۔ انھیں اردو اور فارسی زبان وادب سے گہری دلچسپی ہے۔ اردو کے افسانوی ادب سے بھی انھیں دلچسپی ہے جس

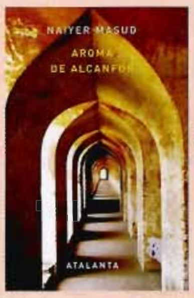

کے نتیجے میں 2010 میں انھوں نے پروفیسر نیر مسعود کے سات افسانوں کا اسپینش میں ترجمہ کر کے 'عطر کافور' کے نام سے مجموعہ شائع کرایا۔ اس مجموعے کا ناشر اٹلانٹا نامی ادارہ ہے۔ ان کی دوسری کتاب سعادت حسن منٹو کے 14 افسانوں کا مجموعہ ہے جو ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نام سے کنٹرا اسینا نامی ادارے نے زارا گوزا سے 2012 میں شائع کیا ہے۔ 2013 کے آغاز میں البا نے وارسلونا سے 330 صفحات میں مرزا محمد ہادی رسوا کے شاہکار 'امراؤ جان ادا'۔ لکھنؤ کی ایک طوائف کے نام سے اسپینش میں شائع کیا ہے۔ آغاز میں مفصل مقدمہ بھی شامل ہے۔ اردو کے افسانوی ادب کے ان ترجموں سے یقیناً اسپین والے ہندوستان میں تخلیق پانے والے اردو کے افسانوی ادب سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔ اردو سے دلچسپی کا ہی نتیجہ ہے کہ محترمہ روسیو نے پے در پے تین کتابیں اسپینش میں منتقل کر کے جہاں اپنی مادری زبان کے ادبی ذخیرے میں خوشگوار اضافہ کیا ہے وہیں اردو کے بین الاقوامی قارئین میں بھی قابل توجہ اضافہ کیا ہے۔

واضح رہے کہ یہ پہلا موقع ہے جب اسپین میں اردو کے افسانوی ادب کو براہ راست اردو سے اسپینش میں منتقل کیا گیا ہے۔

پریس نوٹ ڈاکٹر سید حسن عباسی، صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی، 8 مئی 2013

دبئی

دوبئی میں مشاعرہ

دبئی: دبئی میں اردو پریس کلب، دہلی وعلی گڑھ مسلم یونیورسٹی المنی فورم کے اشتراک سے شیخ راشد آڈیٹوریم میں ایک عالمی مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر ہندوستان کی مایہ ناز شخصیات ڈاکٹر شکیل احمد، سابق وزیر حکومت ہند، صفدر ایچ خان چیئرمین دہلی اقلیتی کمیشن و جلیس شروانی نے شرکت کی۔ عالمی مشاعرہ کی صدارت شاعر، نغمہ نگار وممبر پارلیمنٹ جاوید اختر نے کی جب کہ جلیس شیروانی، پریس کلب کے چیئرمین عبدالرشید شاہین اور اردو پریس کلب انٹرنیشنل کے چیئرمین عرفان اظہار نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ شعرا کی فہرست میں ڈاکٹر ثروت زہرا، طاہر فراز، نعمان شوق، افضل منگلوری، ڈاکٹر صباحت واسطی، سندر مالیگاوی، مختار یوسفی اور جلیس شروانی وغیرہ نے سخن نوازوں کی داد لوٹی۔ دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر ایچ خان نے مشاعرے کی کامیابی پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے مسٹر طارق فیضی کی کاوشوں کی ستائش کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 اپریل 2013

خبر نامہ

روزگار سے جوڑے بغیر اردو کا فروغ ممکن نہیں: جتن پرساد

نئی دہلی: اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے ضروری یہ کہ اسے تعلیم اور روزگار سے جوڑا جائے کیونکہ جب تک اردو کو تعلیم اور روزگار سے نہیں جوڑا جائے گا تب تک اردو کا فروغ ممکن نہیں ہے۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر مملکت جتن پرساد نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں 'قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ' کے عنوان سے منعقد دو روزہ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ جتن پرساد نے کہا کہ ان کی وزارت نے اردو کونسل کے ذریعے اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے کئی اقدام کیے ہیں اور آگے بھی اس سلسلے میں منظم کوشش کی جائے گی۔ انھوں نے بتایا کہ ابھی حال ہی میں انھوں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا دورہ کیا اور وہاں کی انتظامیہ کے ساتھ اس ایشو پر سنجیدہ غور وفکر کیا گیا کہ اردو کو تعلیم اور روزگار سے جوڑنے کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی ترویج و ترقی کے لیے یو پی اے حکومت، وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ، سونیا گاندھی سب کا زور اس بات پر ہے کہ اردو کو روزگار سے جوڑا جائے اور مواقع فراہم کیے جائیں۔ یہی اس سیمینار کا بھی مقصد ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے تمام مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے حکومت کی اس بات کے لیے ستائش کی کہ حکومت اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے سنجیدہ ہے اور اس سلسلے میں مسلسل اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ وسیم بریلوی نے کہا کہ اردو کونسل کی جانب سے اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے جو بھی تجاویز وزارت انسانی وسائل کو بھیجی جا رہی ہیں، ان پر مثبت ردعمل سامنے آرہا ہے۔ کونسل کے ڈائریکٹر خواجہ اکرام الدین نے اردو زبان کو نئی تبدیلیوں اور نئے امکانات سے جوڑنے کے لیے کونسل کے اقدامات کی تفصیلات پیش کیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو سائبر اسپیس اور جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کے لیے تعاون مل رہا ہے۔ قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین وجاہت حبیب اللہ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو زبان کا مستقبل روشن ہے بشرطیکہ اس زبان کو کسی خاص مذہب سے نہ جوڑا جائے۔ انھوں نے اردو کی ترقی کے لیے اس طرح کے اقدامات کرنے پر اردو کونسل کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کو تعلیم اور روزگار سے جوڑنے سے متعلق معاملے اقلیتی کمیشن کے زیر غور ہیں۔ معروف فلم ساز مظفر علی نے اردو اور بالی ووڈ کے رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو زبان اگر محفوظ ہے تو اس میں فلمی دنیا کا بہت بڑا رول ہے کیونکہ فلموں میں اردو کا سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ اردو ملک کی سب سے اہم زبان ہے کیونکہ یہ واحد زبان ہے جو پورے ملک میں پڑھی اور سمجھی جاتی ہے باقی زبانیں محض کچھ علاقوں تک ہی محدود ہیں لیکن اردو نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر بھی اپنے لیے زمین پیدا کرچکی ہے۔ اس پروگرام کی نظامت شگفتہ یاسمین نے کی۔

اردو زبان اگر محفوظ ہے تو اس میں فلمی دنیا کا بہت بڑا رول ہے کیونکہ فلموں میں اردو کا سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے: مظفر علی

قومی اردو کونسل کی تجاویز پر حکومت کا مثبت ردعمل سامنے آیا ہے
وسیم بریلوی

اردو کو سائبر اسپیس اور جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کے لیے سب کا تعاون مل رہا ہے
خواجہ محمد اکرام الدین

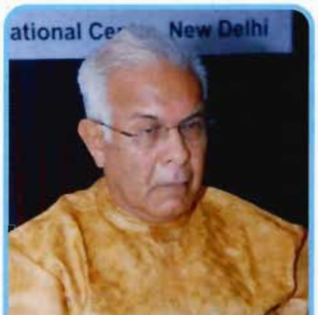

اردو کو تعلیم اور روزگار سے جوڑنے سے متعلق معاملے اقلیتی کمیشن کے زیر غور ہیں
وجاہت حبیب اللہ

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 اپریل 2013

اردو محض ایک زبان نہیں مکمل تہذیب ہے: خواجہ محمد اکرام

قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو شاعری وصحافت کے کردار پر سیمینار

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ نئے نئے موضوعات پر کتابوں کی اشاعت ہو اور اردو ادب و زبان کے میدان میں نئے امکانات کی تلاش کی جائے تاکہ اردو زبان قومی سطح پر اپنی اہمیت و افادیت درج کرائے اور محض ایک خاص طبقے تک سمٹ کر نہ رہ جائے۔ یہ واحد ایسی زبان ہے جس نے ملک کے اتحاد و اتفاق پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ اردو زبان نے ملک کی سالمیت اور اتحاد میں آغاز سے ہی اپنا قیمتی تعاون دیا ہے اور قومی یک جہتی کے فروغ میں دوسری زبانوں کے مقابلے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہی نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی اردو کونسل نے قومی یک جہتی کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ کے موضوع پر دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا۔ سیمینار کے دوسرے دن دو اجلاس منعقد کیے گئے۔ پہلا اجلاس 'قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو شاعری کا حصہ' کے موضوع پر تھا۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر عبد الحق اور قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے کی جبکہ معید رشیدی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ سیمینار کی غرض وغایت پر گفتگو کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ اردو زبان محض ایک زبان نہیں ہے بلکہ اس تہذیب کے ساتھ پورا ایک کلچر وابستہ ہے اور یہی وہ زبان ہے جس نے ملک کی آزادی میں اہم کردار ادا کیا اور آج اکیسویں صدی میں بھی اس موضوع کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کیوں کہ آج ملک کی صورتحال مختلف ہے، آج ملک کے مسائل

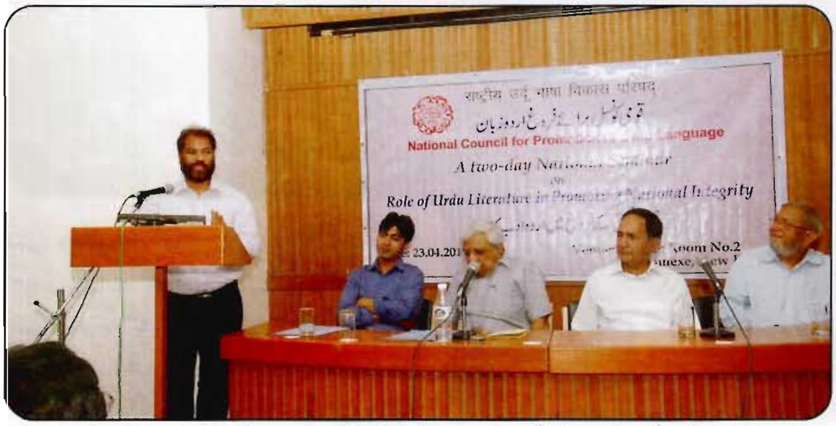

پروفیسر عبدالحق، قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، معید رشیدی، مائک پر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

'قومی یکجہتی اردو اور اردو شاعری میں اردو زبان کی خصوصاً اردو شاعری کا قومی یکجہتی کے حوالے سے تاریخی جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ جب اردو میں ادب تخلیق ہوا تو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں نے بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ آزادی کے بعد اردو کے ساتھ سوتیلا برتاؤ ہوا۔ ہندوستان کی خوبصورتی اور اتحاد اس زبان میں نظر آتا ہے۔ قومی یکجہتی کی مثال کے لیے نظیر کا پورا کلام پیش کیا سکتا ہے۔ معروف ترقی پسند نقاد پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے مقالے میں اردو اور مشترکہ تہذیب پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے مختلف اردو شاعروں کے حوالے سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ اردو شاعری میں آغاز سے ہی مشترکہ تہذیب کے عناصر دکھائی دے جاتے ہیں۔ کشمیر سے آئے معروف نقاد پروفیسر زماں آزردہ نے اپنے مقالے میں قلی قطب شاہ سے لے کر تناظر میں اردو زبان اور شاعری کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے قومی یکجہتی اور اردو شاعری کے کردار پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ صرف اردو کے ساتھ ہی یہ مسئلہ ہے کہ ہمیں مشترکہ تہذیب کی علامت کے طور پر خود کو پیش کرنا پڑتا ہے۔

قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے تمام مقالوں پر مدلل گفتگو کی اور کہا کہ ہندوستان میں اردو زبان اور قومی یکجہتی پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کونسل کے ڈائرکٹر کو مبارکباد پیش کی کہ کونسل نے یہ ایک قابل تحسین قدم اٹھایا ہے۔ آج کے اس خلفشار کے دور میں اس موضوع کی ہمت مزید بڑھ جاتی ہے۔ ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو کی تاریخ امیر خسرو سے ماقبل شروع ہوتی ہے۔ اردو کے سیکولر ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی مذہبی کتاب نہیں ہے۔ اردو کی نسبتیں بہت

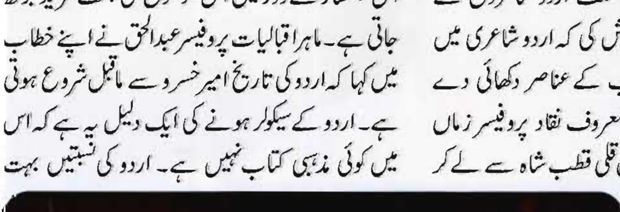

سامعین کا منظر

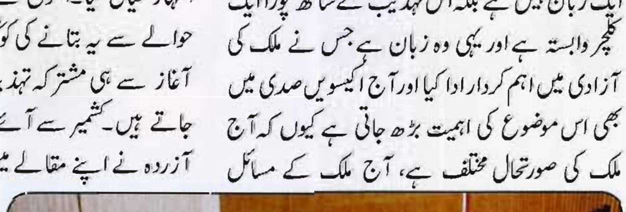

دوسرے ہیں اور آج ہمیں اپنی زبان کے تحفظ کی سمت میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ سیمینار کا پہلا مقالہ پروفیسر ابن کنول نے پڑھا۔ انھوں نے اپنے مقالے چکبست، نظیر، گلزار دہلوی کے شاعری پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ان کی شاعری میں مشترکہ تہذیب کو صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے مقالے میں عالمی بالائے آسماں ہیں۔ معروف نقاد جناب صدیق الرحمٰن قدوائی نے سبھی مقالات کی تعریف کی اور کہا کہ اردو کے تعلق سے ایک خود اعتمادی کی فضا قائم کرنے میں یہ

دائیں سے: پروفیسر عتیق اللہ، شاہد صدیقی، سید فیصل علی، قاسم انصاری، مائک پر شاہد لطیف

پروفیسر علی احمد فاطمی

پروفیسر عتیق اللہ

پروفیسر زماں آزردہ

پروفیسر ابن کنول

پروفیسر شافع قدوائی

مشرف عالم ذوقی

شکیل حسن شمسی

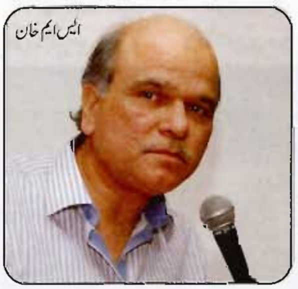
ایس ایم خان

سید فیصل علی

پروفیسر انوار عالم پاشا

مقالے کارآمد ہیں۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اس اجلاس میں شکریے کی رسم انجام دی اور کہا کہ بھلے ہی مقالات میں کچھ باتیں دوہرائی گئی ہیں لیکن آج ہمیں ان باتوں کو بار بار کہنے کی ضرورت ہے۔ ایک کونے میں بیٹھ کر بات کرنے سے معاملہ نہیں بنے گا بلکہ ہمیں مین اسٹریم پر آکر اپنی بات کہنی ہوگی۔ ہمیں اپنی زبان کی ترقی کے لیے اپنی باتیں حکومت تک اور ارباب اقتدار تک پہنچانی ہوں گی۔

ظہرانے کے بعد سمینار کے دوسرے اجلاس کا آغاز ہوا، اس اجلاس کا موضوع 'قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو صحافت' کا حصہ تھا۔ اس کی صدارت ڈی ڈی نیوز کے ڈائرکٹر جنرل ایس ایم خان، شاہد صدیقی اور سید فیصل علی نے کی۔ نظامت ڈاکٹر قاسم انصاری نے کی۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ پڑھتے ہوئے روزنامہ 'انقلاب'، ممبئی کے مدیر معروف صحافی شاہد لطیف نے اردو کے اہم صحافیوں کے خدمات کا تذکرہ کیا اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ پوری اردو صحافت دانشمندی کا نمونہ ہے۔ اردو صحافت آغاز سے ہی قومی یکجہتی کا پاس رکھتا ہے۔ ملک کی سالمیت اور اتحاد کو ترجیح دی ہے۔

اس اجلاس کے دوسرے مقالہ نگار پروفیسر شافع قدوائی نے اپنے مقالے میں موجودہ اردو صحافت پر روشنی ڈالی اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ اردو صحافت آج ترقی یافتہ صحافت ہے اور شروع سے یہ احتجاج کی صحافت رہی ہے۔ حکومت وقت کے خلاف ہمیشہ نبرد آزما رہی۔ قومی یکجہتی کا خواب شرمندہ تعبیر کرنے میں اردو صحافت کا بہت بڑا رول ہے۔

مشرف عالم ذوقی نے اپنے مقالے میں اپنا منفرد انداز اپناتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اردو صحافت کی کمیوں پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آج یہ صحافت ایک مخصوص طبقے تک سمٹ کر کیوں رہ گئی ہے۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور تعصب کی گرد بھی صاف کرنی ہے۔ ساتھ ہی اپنا محاسبہ بھی کرنا ہے۔ ہم اپنے عمل سے اس تہذیبی وراثت کو دھندلا نہ ہونے دیں جسے ہندوستانی کہتے ہیں۔ آج بھی اردو صحافت قومی یکجہتی ہو یا ملت و اتحاد اسے فروغ دینے میں پیش پیش ہے۔ روزنامہ 'انقلاب' کے ایڈیٹر نارتھ جناب شکیل حسن شمسی نے اس سمینار میں اپنے تجربات کے حوالے سے بتایا کہ اردو اخبارات قومی یکجہتی اور ملک کی سالمیت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ اردو صحافت اب گھاٹے کا سودا نہیں رہی۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر انوار عالم پاشا نے اس سمینار میں صحافت کے بنیادی مقصد پر روشنی ڈالی اور کہا کہ صحافت کا بنیادی مقصد دیانت داری ہے۔ قومیت اور یکجہتی کے علمبردار ہم اردو والے ہی ہیں اور ہماری نس نس میں قومیت بھری ہوئی ہے۔

معروف صحافی اور ہفتہ دار نئی دنیا کے مدیر جناب شاہد صدیقی نے صدارتی خطاب میں اپنے تجربات بیان کیے اور کہا کہ اردو صحافت کے مستقبل سے قطعی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہوئی ہے۔ زبانیں سیکڑوں برسوں میں بنتی ہیں اور انھیں جلدی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان کا مستقبل روشن تھا اور روشن رہے گا۔ اردو صحافت نے بدترین حالت میں بھی اردو کو زندہ رکھا ہے۔ مجلس صدارت کے دوسرے رکن روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو کے گروپ ہیڈ سید فیصل علی نے اردو صحافت کے مسائل پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ہمیں سنجیدگی سے اس موضوع پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ آج اردو صحافت منافع کا سودا ہے لیکن اردو زبان میں ہماری کوئی بھی بڑی نیوز ایجنسی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں مزید کوششیں کرنی چاہیے۔

دوردرشن نیوز کے ڈائرکٹر جنرل جناب ایس ایم خان نے کہا کہ قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو صحافت نے دیگر زبانوں کی صحافت کے برعکس منفرد کردار ادا کیا ہے لیکن ہمیں اردو صحافت کو نئی اونچائیوں تک پہنچانے کے لیے مزید اقدامات کرنے ہوں گے۔ انھوں نے اپنے دوردرشن کے تجربات سے بھی آگاہ کیا۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 23 اپریل 2013

قومی اردو کونسل کے فیصلوں پر عمل کے لیے ہر دروازے پر دستک دوں گا! جتن پرساد

مرکزی وزیرمملکت جتن پرساد قومی اردو کونسل کے دوروزہ ورکشاپ میں خطاب کرتے ہوئے۔

لکھنؤ: فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیرمملکت جتن پرساد نے کہا کہ اردو کو نصاب تعلیم کا حصہ بنانا اور روزگار سے جوڑنا ضروری ہے، فروغ اردو کونسل (این سی پی یو ایل) کے منصوبے پورے ملک میں بہتر طریقے سے چلانے کے لیے وہ ہر دروازہ پہ دستک دینے کے لیے تیار ہیں۔ کوئی بھی منصوبہ کاغذ اور فائلوں تک محدود نہ رہے بلکہ زمینی سطح پر اس کا رزلٹ دکھائی دے، نوجوانوں میں ہنر کا فروغ ہو جس سے انھیں روزگار ملے اور آمدنی میں اضافہ ہو یہی ان کی منشا ہے۔ جتن پرساد نے فروغ اردو کونسل کے ذریعے ملک بھر میں چلائے جانے والے کمپیوٹر سنٹر کے سربراہوں کے ورکشاپ اور مذاکرہ سے خطاب کرتے ہوئے یہ باتیں کہیں۔ ورکشاپ کا انعقاد نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹرانکس اینڈ انفارمیشن ٹکنالوجی (نیلیٹ) چنڈی گڑھ کے اشتراک سے کیا گیا۔

جتن پرساد نے این سی پی یو ایل کے کمپیوٹر سنٹروں پر روزگار پر مبنی دیگر کورس شروع کیے جانے کی جہاں ایک طرف بات کہی تو دوسری طرف اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ این سی پی یو ایل کے اتر پردیش میں 104 کمپیوٹر سنٹر ہیں مگر ایک بھی سنٹر کا سرٹیفکیٹ حکومت سے منظور شدہ نہیں ہے۔ کمپیوٹر کورس اور روزگار کے امکانات پر گفتگو کرتے ہوئے مرکزی وزیرمملکت نے کہا کہ پلیسمنٹ ہی وہ اشاریہ ہے جس سے ہماری کامیابی یا ناکامی کا پتہ چل سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ورکشاپ کے حاضرین سے ملنے والے فیڈ بیک کی انھیں مکمل جانکاری چاہیے تاکہ اسی سمت میں ہم چل سکیں جدھر لوگ چلنا چاہتے ہیں۔ صرف ڈگری دینے سے کام نہیں چلے گا، لوگوں کی صلاحیت اور ان کے ہنر کو بڑھانا ہوگا۔ سب کو مساوی مواقع دیے

کونسل کے وائس چیئرمین وسیم بریلوی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو کو عصر حاضر کی ضرورتوں سے جوڑنے کے لیے این سی پی یو ایل کا وائس چیئرمین بننے کے بعد ان کے دور کی یہ سب سے بڑی ورکشاپ ہے۔ لوگوں کو بہت سی توقعات ہیں۔ انھوں نے کہا ''ہمارا کام اس کوشش میں لگنا ہے کہ مدرسوں سے نکلنے والے بچے زیادہ سے زیادہ روزگار سے جڑ سکیں'' انھوں نے کہا کہ تنقید کے ساتھ ساتھ ہمارے رویہ میں مفاہمت بھی ہونی چاہیے تاکہ ہم بہتر مستقبل کا خواب دیکھ سکیں۔ وسیم بریلوی نے کہا کہ اردو والے احسان کبھی نہیں بھولتے، جو سیاسی جماعتیں صحیح معنوں میں اردو کا بھلا کریں گی، محبان اردو ان کا بھی بھلا کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہندوستانیت اور مشترکہ تہذیب کی علامت ہے، انھوں نے اپنی بات اس شعر پر ختم کی:

مزاجاً پھول جیسا، حوصلہ گلدان جیسا ہے\
یہ اردو ہے کہ جس کا دل بھی ہندوستان جیسا ہے

کے اردو میڈیم اسکولوں انجینئرنگ کالجوں کی معیاری تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ صابو صدیق انجینئرنگ کالج کے بچے ممبئی یونیورسٹی کے امتحان میں ٹاپ کرتے ہیں اس بار یونیورسٹی کے مجموعی 52 گولڈ میڈلسٹ میں انجمن اسلام کے اداروں کے 13 مسلمان طلبا شامل تھے۔ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے بچے ایم اے انگلش اور اکنامکس میں ٹاپ کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جب اقلیتیں آگے بڑھیں گی تبھی ہندوستان آگے بڑھے گا۔ انھوں نے حاضرین کو شکوہ شکایت کے بجائے محنت کرنے کی تلقین کرتے ہوئے اپنے ادارے کی بہترین کارکردگی کی مثالیں بھی پیش کیں۔ انھوں نے بتایا کہ ناسا کے ایئروناٹکس مقابلے میں پورے ایشیا کے تین کالجوں کے طلبہ کے ماڈل منتخب ہوئے تھے جس میں ایک ماڈل صابو صدیق انجینئرنگ کالج کے طالب علم کا بھی تھا۔ مسٹر ظہیر قاضی نے بتایا کہ انجمن کے کونسل کے کمپیوٹر سنٹر میں طلبہ کا صد فیصد پلیسمنٹ ہوتا ہے۔

قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر مراکز کے سربراہان اور سامعین کا منظر

جانے پر زور دیتے ہوئے جتن پرساد نے کہا کہ جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں انھیں برابر لایا جائے، مواقع دیے جائیں، شہر، گاؤں اور مختلف طبقات کے درمیان خلیج کو کم کیا جائے۔ جب تک برابری نہیں لائیں گے بے اطمینانی اور ناراضگی ختم نہیں ہوسکتی۔

ممبئی کے قدیم ادارے انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی نے اپنے خطاب میں کہا کہ این سی پی یو ایل کا بجٹ بڑھایا گیا اس سے وہ مطمئن تو ہیں مگر خوش نہیں ہیں، کیونکہ اقلیتوں میں غربت اور پسماندگی بہت زیادہ ہے اور کام کا دائرہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ انجمن اسلام

این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین نے حاضرین کا استقبال کیا اور ورکشاپ کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ نیلیٹ کے ڈائرکٹر اے کے ڈی دیویدی نے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ کمپیوٹر سنٹروں پر ہارڈ ویئر مرمت،

قومی اردو کونسل کی ورکشاپ میں سامنے لائی گئی اہم تجاویز

لکھنؤ: قومی کونسل برائے فروغ اردو بان کے تحت چلنے والے کمپیوٹر و دیگر مراکز سے کثیر تعداد میں طلبا و طالبات فیض یاب ہورہے ہیں، اس کو مزید بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ ان مراکز سے فارغین کو جو سند دی جاتی ہے اس کے 'او' لیول یا اس کے مساوی کیا جائے۔ اس کے علاوہ جن مراکز کو کونسل نے اپنی سرپرستی سے مبرا کردیا ہے اس ضابطے میں بھی تبدیلی کی جائے۔ کونسل سافٹ ویئر کے ساتھ ہارڈویئر کے کورس بھی شروع کرے تاکہ نوجوان خود کفیل بن سکیں۔ انھیں بی سی اے اور ایم سی اے کی طرح بہتر روزگار کے مواقع مہیا ہوسکیں۔ یہ باتیں کونسل کے دو روزہ قومی ورکشاپ میں ابھر کر سامنے آئیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب کونسل نے پورے ملک کے سینٹر انچارجوں کو جمع کرکے مشترکہ طور پر ان کے مسائل کو سنا۔ ان کی دشواریوں کو حل کرنے کے طریقوں کو جانا۔ ان کے مشوروں کی ستائش کی۔ کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین نے تمام مراکز کے سربراہوں کو یقین دلایا کہ حکومت نے کونسل کے بجٹ میں 100 فیصد سے زیادہ کا اضافہ کیا ہے۔ اس لیے جو مسائل پیسے سے متعلق ہیں ان کے حل ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اترپردیش سمیت کئی ریاستوں سے یہ نکتہ بھی اٹھایا گیا کہ کونسل کی جانب سے فارغین کو جو سند فراہم کرائی جارہی ہے اس کو سرکاری اداروں کے لیے لازمی 'او' لیول یا اس کے مساوی کرانے نیز تسلیم شدہ ہونے کی ضمانت بھی دی جائے۔ اس پر بتایا گیا کہ کونسل کا وزارت مواصلات کے ادارہ سے اشتراک ہے اور جلد ہی اترپردیش میں بھی اس کے مراکز کھولے جائیں گے۔ اس کے علاوہ مہاراشٹر سمیت کئی ریاستوں سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ کمپیوٹر مراکز میں نشستیں محدود ہیں، جب کہ مراکز کے پاس داخلہ کی درخواستیں زیادہ آتی ہیں۔ ایسے میں یا تو کونسل نشستوں میں اضافہ کرے، یا مراکز میں اضافہ کرے۔ کچھ مراکز نے اردو خوش خطی سیکھنے کے نصاب کو مزید آسان کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ نیز صحیح تلفظ کی ادائیگی کے ایسے ماڈل کا مشورہ دیا جو ان افراد کے لیے بھی آسان ہوں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ کیوں کہ الگ الگ ریاستوں میں ان کی علاقائی بولی کے سبب اکثر اردو الفاظ کے تلفظ کی ادائیگی میں فرق ہوجاتا ہے۔ ان تمام نکات پر کونسل کی جانب سے جلد از جلد غور و خوض کرکے اس پر عمل درآمد کرایا جائے گا۔ واضح رہے اس سے قبل دو روزہ قومی ورکشاپ کا افتتاح مرکزی وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل جتن پرساد نے جمعرات کو کیا تھا جس میں انھوں نے ورکشاپ میں موصول شکایتوں، مسائل، مشوروں سے انھیں بھی واقف کرانے کی ہدایت دی تھی۔ اس موقعے پر کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' لکھنؤ، 27 اپریل 2013

کونسل کے ڈائرکٹر ورکشاپ میں خطاب کرتے ہوئے

قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر مراکز کے سربراہان اور سامعین کا منظر

دائیں سے: پروفیسر انوار عالم پاشا، پروفیسر وسیم بریلوی، خواجہ اکرام، محترمہ شمع کوثر یزدانی اور کمپیوٹر مراکز کے سربراہان و کونسل کے ذمہ داران

الیکٹرانکس وغیرہ کے کورس شروع کیے جائیں گے۔ ٹیکنیکل کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر لوبیال نے کہا کہ این سی پی یو ایل کے کمپیوٹر سنٹروں پر انٹرنیٹ کی سہولت ہونی چاہیے تاکہ آن لائن کورس چلائے جاسکیں۔ ٹی وی اور اسکائپ کے ذریعے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر انور پاشا نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ ورکشاپ میں ملک کی 26 ریاستوں میں قائم 425 کمپیوٹر سنٹروں کے سربراہان موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' لکھنؤ، 26 اپریل 2013

دائیں سے: پروفیسر انور پاشا، ڈاکٹر ڈی کے لوبیا، خواجہ محمد اکرام، اے کے ڈی دیویدی اور دیپک وسا

پروفیسر وسیم بریلوی ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے

ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی ورکشاپ میں اظہار خیال کرتے ہوئے

کونسل کے اردو ادب پینل کے تحت 28 پروجیکٹس مکمل اور 18 کتابیں شائع

نئی دھلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر، فروغ اردو بھون میں، پروفیسر گوپی چند نارنگ (چیرمین پینل) کی صدارت میں، اردو ادب پینل کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی۔ پینل کے اہم علمی و ادبی شخصیات کی موجودگی میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے یہ اعلان کیا کہ بہت جلد کونسل ایک ایسا اردو کی پیڈ (Key Pad) تیار کر رہی ہے جو جلد ہی تمام انڈرائڈ فون (Endroid Phone) میں موجود ہوگا۔ اس طرح NOKIA کے صارفین اردو زبان میں اپنے موبائل فون کے ذریعے ''اردو میں Message'' بھیج سکتے ہیں۔ یہ تکنیکی انقلاب سے کم اہم نہیں ہے۔ اب طرح اردو ہر ایک موبائل میں موجود ہوگی اور بات چیت کا ذریعہ بھی اردو ہی ہوگی جبکہ پہلے، ہم صرف انگریزی یا دوسری زبانوں تک ہی محدود تھے۔ اس کوشش میں وزیر برائے مواصلات وانفارمیشن ٹیکنالوجی جناب کپل سبل صاحب کی خصوصی دلچسپی اور کوشش شامل ہے۔ اردو زبان تکنیکی ترقی میں حصہ دار ہے، اس خوش خبری کے ساتھ میٹنگ کی ابتدا ہوئی۔ کونسل کے اس انقلابی قدم کا اراکین مجلس نے خیر مقدم کیا۔ پینل کے چیرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کونسل ایک اسٹیچوری باڈی ہے، اور اس کی سالانہ رپورٹ پارلیمنٹ میں پہنچتی ہے لہٰذا اس کی کارگزاریوں میں شفافیت موجود ہے۔ قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کتابوں کی اشاعت پر اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ اس سلسلے کو مزید توسیع دینے کی کوشش کی جائے گی۔

میٹنگ میں پینل کے تحت چل رہے تقریباً 80 پروجیکٹس کی پیش رفت کا جائزہ لیا گیا۔ ساتھ ہی کچھ نئے اہم پروجیکٹس کو بھی منظوری دی گئی۔ اراکین کی ایک اہم تجویز کو منظوری دیتے ہوئے پینل نے یہ فیصلہ کیا کہ صرف معروف شخصیات جو باحیات نہیں ہیں ان کا کلیات شائع کیا جائے گا۔ پینل نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ سال 13-2012 کے دوران تقریباً 28 پروجیکٹس مکمل ہوئے اور اردو ادب پینل کے تحت 18 کتابیں شائع کی گئیں۔

اس میٹنگ میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی، قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، جناب مسعود سراج، ڈاکٹر مشتاق احمد، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر محبوب اقبال، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر اعجاز علی ارشد نے شرکت کی۔ ان کے علاوہ قومی اردو کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر محترمہ شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب اجمل سعید، محترمہ شہناز اختر، جناب محمد انصر اور محترمہ آبگینہ عارف نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 اپریل 2013

قومی اردو کونسل مونوگراف شائع کرے گی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنی سطح پر تاریخ زبان وادب، لغات اور دیگر علوم سے متعلق جو منصوبے بنائے ہیں انھیں بہت تیزی کے ساتھ عمل میں لایا جارہا ہے۔ کونسل کسی ایک علاقے یا کسی ایک صوبے کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اس کے مقاصد میں پورے ہندوستان کی نمائندگی اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ ہمارے لیے یہ بڑے اعزاز و فخر کی بات ہے کہ ہمیں اپنے کاموں کی تکمیل کے سلسلے میں پورے ملک کے ارباب علم ودانش کا تعاون حاصل ہے۔

ہمارے بہت سے منصوبوں میں سے ایک بلند کوش منصوبہ قدیم وجدید عہد کے ان مشاہیر قلم کاروں کے مونوگراف (یک موضوعی مقالے) کی تیاری سے متعلق ہے جنھیں ہم اپنے زمانوں کا نمائندہ، عہد ساز یا تاریخ ساز بھی کہتے ہیں۔ ہم نے اردو زبان وادب کی پوری تاریخ کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ مونوگراف کا سب سے بڑا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ایک چھوٹے سے کتابچے میں وہ تمام بنیادی معلومات درآئے جسے کسی بھی موضوع ومصنف کے بارے میں ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اس طرح طول طویل کتابوں کے بجائے مونوگراف پڑھنے میں ہمارے قاری کی دلچسپی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ کس سے کم میں بیش از بیش علم مہیا کرنے کا وسیلہ ہیں۔

کونسل کے کمپیوٹر مراکز کو 'O' Level کورس کی جلد ہی منظوری

NIELIT، نئی دہلی کے منیجنگ ڈائرکٹر اشونی کمار شرما نے قومی اردو کونسل کے ذریعے ملک بھر میں چلائے جارہے کمپیوٹر (CABA-MDTP) مراکز کو 'O' Level کی منظوری دینے کا وعدہ کیا ہے۔ بڑی تعداد میں مراکز کے اس اسکیم سے منسلک ہونے پر انھیں موجودہ فیس میں خاص رعایت دی جائے گی۔

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

ڈپٹی نذیر احمد کی خدمات پر سیمینار

نئی دہلی: ذاکر حسین دہلی کالج کے شعبۂ اردو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور انڈین کونسل آف ہسٹوریکل ریسرچ کے اشتراک سے دوروزہ قومی سیمینار بعنوان 'ڈپٹی نذیر احمد: حیات و خدمات' کا انعقاد کیا گیا۔ سید شاہد مہدی نے اس موقعے پر کہا کہ نذیر احمد کی تخلیقات کی معنویت آج بھی مسلم ہے۔ مہمانِ اعزازی پروفیسر قاضی افضال حسین نے اپنے خطبے میں کہا کہ نذیر احمد کے افکار میں انتشار پایا جاتا ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے صدارتی خطبے میں کہا کہ نذیر احمد کو ان کے عہد کے تناظر میں ہی جانچا اور پرکھا جانا چاہیے۔ کلیدی خطبہ پروفیسر محمد ذاکر نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ نذیر احمد کا نظریہ افادی تھا۔ خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایم اسلم پرویز نے دلی کالج کے تاریخی کردار پر روشنی ڈالی۔ عبدالعزیز نے تعارفی خطبے میں سیمینار کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ نظامت ڈاکٹر خالد علوی نے کی۔ اس اجلاس میں فرحت شہزاد (امریکہ) نے بھی شرکت کی۔ اس موقعے پر کالج کے مجلّہ فکر نو کا ڈپٹی نذیر احمد نمبر کا اجرا کیا گیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی افضال حسین اور پروفیسر شمس الحق عثمانی اور نظامت ڈاکٹر خالد علوی نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد ذاکر، پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور پروفیسر عبدالحق نے اور نظامت ڈاکٹر ممتاز فاخرہ مجیب نے کی۔ دونوں نشستوں میں کئی اہم مقالے پیش کیے گئے۔

ڈپٹی نذیر احمد محض شخصیت کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک دبستان کا نام ہے۔ ان خیالات کا اظہار الٰہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے پروفیسر علی احمد فاطمی نے ذاکر حسین دہلی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور انڈین کونسل آف ہسٹوریکل ریسرچ کے اشتراک سے 'ڈپٹی نذیر احمد: حیات و خدمات' کے عنوان سے منعقدہ قومی سیمینار کے دوسرے دن پہلے اجلاس کے صدارتی خطبے میں کہا۔ ناول کے تعلق سے مفصل گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر فاطمی نے کہا کہ ایک کامیاب ناول کو مفسرانہ طور پر پیش کرنے کے لیے تضاد ضروری ہے۔ صغیر افراہیم نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے کرداروں کی بنیاد، متضاد رویوں پر رکھی ہے، جس میں کرداروں کی نفسیاتی کیفیت کی مؤثر ترجمانی کی گئی ہے۔

اجلاس میں مدعو تمام شرکا نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ سید ضمیر حسن دہلوی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ نذیر احمد اپنے عہد کے نقیب تھے۔ انھیں یہ اعزاز دہلی کالج میں حصولِ علم کے بعد ہی حاصل ہوا۔ لہٰذا دہلی کالج بھی مبارک باد کا مستحق ہے۔ پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ انیسویں صدی میں کوئی ایسا عالم نہیں، جسے ڈپٹی نذیر احمد کے ہم پلہ قرار دیا جاسکے۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شاہ عالم نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر عبدالعزیز، ممتاز فاخرہ مجیب، جعفر احراری، بانو پرتاپ سنگھ، فیاض رفعت، ہما خان، یونس جعفری، جمیل الرحمٰن کے علاوہ دہلی کی مختلف یونیورسٹیوں کے طلبہ اور طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 و روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اپریل 2013

کل ہند مشاعرہ و کوی سمیلن کا انعقاد

ہرگوندور ما کھاد گرام ادھیوگ سمیتی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے لال پور بازار، لہرپور ضلع سیتاپور (یوپی) میں کل ہند مشاعرہ و کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے پیغام سے سجی اس محفل کا افتتاح مرکزی وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل جناب جتن پرساد نے شمع روشن کرکے کیا۔ گلال ہولی پتریکا پریوار نے وزیر موصوف کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اپنے افتتاحی کلمات میں جناب جتن پرساد نے زور دے کر کہا کہ مشاعرہ و کوی سمیلن ہماری سانجھی وراثت کا اہم حصہ ہیں اور لال پور بازار کی یہ شام اسی وراثت کی ترجمان ہے۔ مشاعرہ و کوی سمیلن کا انعقاد دو حصوں میں کیا گیا۔ شام سات بجے سے لے کر شب دس بجے تک مقامی شعرا و کویوں نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس کے بعد ملک کے نامور شعرا اور کویوں نے اپنے اشعار سے اس محفل میں چار چاند لگائے۔ کونسل کے وائس چیئرمین اور برصغیر کے نامور شاعر پروفیسر وسیم بریلوی کی صدارت میں منعقد ہوئے اس مشاعرہ و کوی سمیلن کی نظامت کے فرائض معروف شاعر انور جلال پوری نے انجام دیے۔

اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اجمل سعید اور ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر قاسم انصاری نے شرکت کی۔

رپورٹ: رابطہ عامہ سیل، 28 اپریل 2013

رانچی میں کل ہند سیمینار

رانچی: مرکز ادب و سائنس تعلیمی فلاح رجسٹرڈ ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے رانچی کے گوسنر تھیولوجیکل ہال میں 'اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ' کے عنوان سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس سیمینار کے مہمان خصوصی شری سبودھ کانت سہائے سابق وزیر کابینہ حکومت ہند تھے جب کہ صدارت فیروز احمد وائس چانسلر نیلامبر پتامبر یونیورسٹی نے انجام دی۔ مہمان خصوصی شری سبودھ کانت سہائے نے ٹرسٹ کی ڈوکیومینٹری فلم بعنوان 'قدم بقدم' کا اجرا کیا اور صدرِ جلسہ ڈاکٹر فیروز احمد نے ٹرسٹ کے ترانہ کا افتتاح فرمایا۔ شری سبودھ کانت سہائے نے اپنے قلیل عرصے میں ٹرسٹ کی بے مثال ترقی اور کامیابی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ توقع کی کہ جلد ہی یہ ٹرسٹ جھارکھنڈ میں ایک ڈیمڈ یونیورسٹی قائم کرنے میں کامیاب ہوگا۔ جناب نورالاسلام صاحب فاؤنڈر سکریٹری الامین مشن، مغربی بنگال نے 'الامین' مشن کے طرز پر کوچنگ سینٹرز کے نیٹ ورک قائم کرنے میں اپنے مشن کے ذریعے ہر طرح کے نظری و عملی تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ سیمینار کی نظامت ڈاکٹر سرور نے کی۔

پریس ریلیز، ارشاد احمد، بریاتو ہاؤسنگ کالونی، رانچی، جھارکھنڈ 4 اپریل 2013

مولانا اسمٰعیل میرٹھی یادگاری خطبہ

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے، شعبے کے پریم چند سیمینار ہال میں مولانا اسماعیل میرٹھی یادگاری خطبہ بعنوان 'بچوں کا ادب: تاریخ، ارتقا اور امکانات' منعقد ہوا۔ پروگرام کی صدارت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی۔ خصوصی مقرر کی حیثیت سے پروفیسر ارتضیٰ کریم (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)، مہمان خصوصی کی حیثیت سے راجکمار سچان ہوری (سابق، ایم سی ڈی کمشنر، میرٹھ) اور مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے ڈاکٹر نعیم انیس (کلکتہ) مہتاب عالم پرویز (جمشید پور)، ڈاکٹر خالد حسین خاں (صدر شعبۂ اردو، میرٹھ کالج، میرٹھ) اور معروف ادیب طالب زیدی شریک ہوئے۔ جب کہ نظامت کے فرائض شعبے کے استاد

ڈاکٹر آصف علی نے انجام دیے۔ خصوصی مقرر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ آج بچوں کو تعلیم تو دی جارہی ہے لیکن تہذیب نہیں جو صالح معاشرے کے قیام کے لیے ضروری ہے۔ بچوں کا ادب لکھنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ادب اطفال عمیق مطالعے، وسیع تجربے، گہرے مشاہدے اور زبان وبیان پر دسترس کا متقاضی ہے۔ کیونکہ بچوں کی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے، ان کی نفسیات، معاملات اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت الگ ہوتی ہے جسے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے قلم کار کو انھی کے رنگ میں رنگنا ضروری ہے۔ اسی لیے بچوں پر لکھنے والے ادیبوں کی تعداد کم ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ کم وبیش ہر بڑے اور تاریخ ساز ادیب وشاعر نے بچوں کے لیے ضرور لکھا ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے بھی بچوں کی نفسیات کو بخوبی سمجھا اور اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ مہمان خصوصی راج کمار سچان ہوری نے اسماعیل میرٹھی کی شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اسماعیل میرٹھی بچوں کے ساتھ ساتھ عوام کے شاعر تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ثقیل الفاظ، مشکل محاورات کے بجائے عوام میں رائج الفاظ استعمال کیے ہیں۔ آج اردو اور ہندی کے ادیب اپنی اپنی زبانوں کو فارسی اور سنسکرت کی طرف لے جانے کی کوشش کررہے ہیں، یہ نقصان دہ نظریہ ہے۔ آج پھر ضرورت ہے کہ ہم الفاظ کی شعبدہ بازی سے باز آکر سادہ عام فہم اور سماج میں رائج زبان کا استعمال کریں۔ یہی ان زبانوں کی بقا کا واحد راستہ ہے۔ تقریب کے دوسرے حصے میں دو کتابوں ڈاکٹر نعیم انیس کی تحقیقی و تنقیدی کاوش 'میزان افکار' اور مہتاب عالم پرویز کے افسانوی مجموعے 'کارواں' کی رسم نقاب کشائی بھی کی گئی۔ ڈاکٹر محمد کاظم اور ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے بھی اپنے اپنے خیالات پیش کیے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ اسماعیل میرٹھی ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے ادب کے ذریعے ملک وقوم کی تعمیر میں حصہ لیا۔ اسماعیل میرٹھی نے اپنی تخلیقات سے نہ صرف قوم کی اصلاح کا کام اور اتحاد و اتفاق کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی بلکہ قوم کے نونہالوں کے مستقبل کو سنوارنے والا ادب پیش کرکے انسانیت کے تن مردہ کی جڑوں کو سینچنے کا فریضہ انجام دیا۔ ساتھ ہی لڑکیوں کی تعلیم کا نہ صرف نظریہ پیش کیا بلکہ عملی طور پر ان کی تعلیم کا انتظام بھی کیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، 18 اپریل 2013

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

مقامی :

اردو کو نظرانداز کرکے ملک کی ترقی نہیں ہوسکتی: کپل سبل

نئی دہلی: ہندوستان سے جو اردو کی روشنی پھیلی ہے اس نے پوری دنیا میں اپنا جلوہ دکھایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کسی مذہب کی زبان کا نام نہیں، بلکہ تہذیب کا نام ہے۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر مواصلات کپل سبل نے قومی راجدھانی میں منعقدہ مشاعرہ جشن بہار میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان کی مٹھاس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اردو کے لیے صرف اتنا کہنا کافی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی ترقی تبھی ممکن ہے، جب اس کو ٹیکنالوجی اور روزگار سے وابستہ کیا جائے۔ بات لازمی ہے کہ جب اردو ٹیکنالوجی سے وابستہ ہوگی تو روزگار کے مواقع بھی فراہم ہوں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میری دلی خواہش ہے کہ ہر اسکول میں ہندی، اردو اور انگریزی زبان لازمی طور پر پڑھائی جائے۔ کپل سبل نے کہا کہ اردو کو نظرانداز کرکے ملک آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پریس کونسل آف انڈیا کے چیئرمین جسٹس کاٹجو نے کہا کہ اردو ہمارے ملک کی زبان ہے، اس کو اس کا جائز حق ملنا چاہیے۔ انھوں نے اپنا دیرینہ مطالبہ دہراتے ہوئے کہا کہ مرزا غالب کو بھارت رتن ایوارڈ دیا جانا چاہیے۔ صدارتی خطبے میں جاپان کی پروفیسر ہیروجی کوٹاؤکا نے کہا کہ جاپان میں اردو زبان وادب کا سلسلہ نہیں ہے لوگ عموماً انگریزی ادب کی طرف بھاگتے ہیں، لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اردو ادب کی طرف بھی لوگوں کو جانا چاہیے۔ مشاعرہ جشن بہار کی بانی کامنا پرساد نے اپنی تقریر کے درمیان حکومت سے مطالبہ کیا کہ اردو زبان کو پانچویں جماعت تک لازمی قرار دیا جائے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اپریل 2013

مولانا ابوالکلام آزاد کا یوم پیدائش

نئی دہلی: ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم، بھارت رتن مولانا ابوالکلام آزاد کے 125 ویں یوم ولادت کا جشن انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر میں حسن آرا ٹرسٹ و مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز کے زیراہتمام منعقد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر سابق صدر جمہوریہ پرتبھا دیوی سنگھ پاٹل نے شرکت کی جب کہ مہمانان ذی وقار میں مرکزی وزیر فاروق عبداللہ، آئی سی سی آر کے ڈائرکٹر جنرل سریش گوئل، سابق گورنر کرن سنگھ، سابق وزیر داخلہ شکیل احمد، کانگریس پارٹی کے

ترجمان راشد علوی، معروف شاعر نور امروہی (امریکہ) کے نام قابل قدر ہیں۔ ٹرسٹ کے سرپرست اعلیٰ پدم شری ڈاکٹر محسن ولی کے خطبہ استقبالیہ کے بعد سابق صدر جمہوریہ کا پھولوں سے استقبال کیا گیا۔ محترمہ پرتبھا پاٹل کے ہاتھوں ٹرسٹ کی جانب سے سال 2012 کا فخر ہند ایوارڈ سماجی کارکن ندیم عباس زیدی اور معروف شاعرہ سیما گپتا کو دیا گیا۔ اس موقعے پر پرتبھا پاٹل نے بیگم فرخ ناز کے اہم تحقیقی شاہکار مولانا آزاد کی شاعری پر مبنی کتاب 'فکر آزاد' کی رونمائی بھی کی۔ افتتاحی تقریر میں کرن سنگھ نے کہا کہ بیسویں صدی کے عالم سیاست میں مولانا آزاد ایک روشن وتابناک ستارے کی طرح ابھر کر سامنے آئے، ان کی زندگی، شخصیت اور بے مثال کارنامے تاریخ کے سنہرے قرطاس پر ہمیشہ ان کو سراہتے رہیں گے۔ صدارتی تقریر میں سابق صدر جمہوریہ پرتبھا پاٹل نے مولانا آزاد کی علمی ادبی وثقافتی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ہندوستان میں ثقافت کے اہم مراکز قائم کرنے میں مولانا آزاد کا اہم کردار رہا ہے، ملک کا تعلیمی نظام انھی کی زیرنگرانی تشکیل پایا تھا اور ملک کے تمام ثقافتی مرکز مولانا کی خدمات کا ہی ایک اہم حصہ ہے۔ محترمہ پاٹل نے بیگم ناز کی نئی کوشش اور حسن آرا ٹرسٹ کے اس جشن کی بھی پذیرائی کرتے ہوئے اس کو مولانا کے شایان شان جشن قرار دیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 اپریل 2013

قاضی عبدالستار کے ناول پر سیریل

بارہ بنکی: بڑاگاؤں میں قدوائی خاندان کی پشتینی

حویلی میں جمعرات کو نہایت شاندار طریقے سے دوردرشن اردو کے لیے سیریل 'شب گزیدہ' کی شوٹنگ کا آغاز کیا گیا۔ اس سیریل کے ہدایت کار مشہور ادیب وصحافی عابد سہیل ہیں۔ شب گزیدہ سیریل کے پروڈیوسر سنیل بتا ہیں،

انھوں نے اب تک اردو زبان و ادب میں بے شمار دستاویزی فلمیں بنائیں اور بڑے پردے کی فلم 'اماں' کے ڈائرکٹر و پروڈیوسر بھی رہے ہیں۔ سنیل بتا کی الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے کی گئی خدمات کے لیے ان کو اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام اور اعزاز سے بھی نوازا ہے۔ ناول 'شب گزیدہ' کے مصنف بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب پدم شری قاضی عبدالستار ہیں۔ شب گزیدہ ناول کی کہانی آزادی سے قبل کے زمیندار خاندان پر مبنی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اپریل 2013

اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے حکومت سنجیدہ: کپل سبل

نئی دہلی: اردو کے فروغ اور ترقی کے لیے گوگل کا اردو سرچ انجن بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور اب ہم تکنیکی ایجوکیشن بھی اردو میں مہیا کرا رہے ہیں تا کہ اردو کو روزگار سے جوڑا جا سکے۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم بچوں کو جو ٹیبلٹ دیں اس میں تمام مضامین کے سبق اردو میں بھی موجود ہوں اس کے لیے قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو سے تعاون لیا جا رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار آج مرکزی وزیر برائے مواصلات کپل سبل نے ڈپٹی اسپیکر ہال کانسٹی ٹیوشن کلب میں

آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے زیر اہتمام 'اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے حکومت کی اسکیمیں: بیداری اور ذمے داریاں' کے موضوع پر منعقد مذاکرے کے دوران کیا۔ کپل سبل نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ایسی بہت سی اسکیمیں ہیں جن کا فائدہ عام لوگوں تک نہیں پہنچ پا رہا۔ اس لیے اب سرکار نے سیدھے 'بینیفٹ ٹرانسفر' کی پالیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس موقعے پر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے نائب صدر مولانا ولی رحمانی اور محمد ادیب نے بھی مسلمانوں کی خستہ حالی کے تعلق سے اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی 25 اپریل 2013

یو پی ایس سی میں 31 مسلم امیدوار کامیاب

ممبئی /نئی دہلی: ہندوستان کے سب سے اہم مقابلہ جاتی امتحان یعنی یونین پبلک سروس کمیشن (یو پی ایس سی) کے نتائج کا اعلان ہو چکا ہے۔ میرٹ کے لحاظ سے اس مرتبہ 998 امیدواروں کا انتخاب عمل میں آیا ہے جن میں 31 مسلم ہیں، ان میں زکوۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا کے 7 امیدوار کامیاب ہوئے ہیں۔ وسیم اکرام (اتر پردیش)، انیس سی (کیرالا)، ماجد خان (اتراکھنڈ)، شکیل احمد خان (مہاراشٹر)، مونا یاسمین (یوپی)، نوید ترمبو (کشمیر) اور یاسر عرفات (تمل ناڈو) شامل ہیں۔ جب کہ 2 کا تعلق صوبۂ مہاراشٹر سے ہے۔ حسب سابق اس مرتبہ بھی مسلم نوجوانوں کی کامیابی کا تناسب 3 فیصد کے آس پاس ہے۔ واضح رہے کہ گزشتہ سال 910 امیدواروں میں سے 30 مسلم طلبہ منتخب ہوئے تھے، اسی طرح 2011 میں کامیاب مسلم امیدواروں کی تعداد 31 تھی جب کہ 2010 میں 875 میں 21 مسلم طلبہ کامیاب ہوئے تھے۔ حالیہ چند برسوں میں سب سے بہتر رزلٹ 2009 کا تھا جب 791 امیدواروں میں 31 مسلم طلبہ نے بازی ماری تھی۔ ان منتخب طلبہ میں انصاری شکیل احمد (رینک 507) اور ناک واڑی پرویز فتح اللہ (رینک 786) کا تعلق مہاراشٹر سے ہے جن میں سے انصاری شکیل احمد کی کوچنگ حج ہاؤس کے تربیتی مرکز پر ہوئی ہے۔ جامعہ سلفیہ وارانسی سے فارغ مولانا حماد ظفر جو فی الوقت جے این یو کے طالب علم ہیں، نے بھی سول سروسز میں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے اردو میڈیم سے امتحان دیا جو آنے والے دنوں میں اردو طلبہ کے لیے ایک مشعل راہ ہے۔ ٹاپ کے 100 طلبہ میں 4 مسلمان ہیں جن میں سید شہرش اصغر 23 ویں رینک کے ساتھ مسلم طلبہ میں اول مقام پر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 مئی 2013

اردو میں میڈیکل داخلہ ٹسٹ

نئی دہلی: سپریم کورٹ نے آج سی بی ایس ای کو حکم دیا ہے کہ وہ مہاراشٹر میں اردو میڈیم کے طلبا کے میڈیکل کالجوں میں (ایم بی بی ایس) داخلہ کے لیے امتحان کو 8 ہفتہ کے اندر یقینی بنائے۔ چیف جسٹس آف انڈیا جسٹس التمش کبیر کی قیادت والی سہ رکنی بنچ نے آج یہ فیصلہ انصاری ماہین فاطمہ کی طرف سے جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا محمود احمد مدنی کی پٹیشن پر سماعت کرتے ہوئے سنایا۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں اس بات کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ سی بی ایس ای کو یہ ہدایت صرف اس سال ہونے والے داخلہ امتحان کے لیے مخصوص ہے اور اس سے ان طلبا کو کوئی راحت نہیں ملے گی جو اپنا فارم بھرتے وقت امتحان دینے کے لیے کسی دوسری زبان کو اختیار کر چکے ہیں۔ ان طلبا کا اب امتحان کا میڈیم تبدیل کرنے کی اجازت نہیں ہوگی انھوں نے فارم میں جس زبان کو بھر دیا ہے اب اسی زبان میں امتحان دیں گے۔ البتہ جن طلبا نے فارم نہیں بھرا ہے اور وہ اردو زبان میں داخلہ امتحان دینے کے خواہشمند ہیں ان کو اب سی بی ایس ای کے نئے نوٹیفکیشن کے مطابق اپنا فارم بھرنا ہوگا۔ جمعیۃ علما ہند کی جانب سے اس معاملے کی پیروی کر رہے ایڈووکیٹ شکیل احمد سید نے کہا کہ صرف مہاراشٹر میں ہی اردو میڈیم سے سائنس کے 7800 طلبا ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں اردو میڈیم کے 227 جونیئر کالج ہیں جب کہ مراٹھی میڈیم سے سائنس کے طلبا کی تعداد محض 350 ہے۔ اتنا ہی نہیں پورے مہاراشٹر میں مراٹھی میڈیم کا ایک بھی سائنس کالج نہیں ہے، اس کے باوجود مراٹھی میں سوالنامہ تیار کیا جانا اور اردو کو امتحان سے نکال دینا ناانصافی اور لسانی تعصب پر مبنی فیصلہ ہے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا محمود مدنی نے کہا کہ آج کا فیصلہ اعتماد پیدا کرنے والا اور امیدوں کو جگانے والا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جانب داری اور تعصب کے اس دور میں عدلیہ ہی اقلیتوں، محروم اور کمزور طبقات کے لیے سب سے بڑی امید ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس فیصلے سے توانائی حاصل کر کے آگے بڑھیں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 مئی 2013

ممبئی میں 5 روزہ اردو ڈرامہ فیسٹول

ممبئی: ممبئی کے میسور ایسوسی ایشن آڈیٹوریم کردار آرٹ اکادمی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے 5 روزہ نیشنل اردو ڈراما فیسٹول کی بے پناہ کامیابی نے اردو کے پروفیشنل ڈراموں کے لیے ایک نئی راہ پیدا کردی ہے۔ غیر اردو داں شائقین دہلی، بھوپال، جموں اور ممبئی کے بہترین اردو ڈرامے دیکھ کر حیرت انگیز مسرت سے دوچار تھے اور انھوں نے اپنے تحریری تاثرات میں اظہار کیا کہ ''اردو تھیٹر میں بھی اتنے معیاری اور اتنے اچھے موضوعات پر ڈرامے ہوتے ہیں ہمیں پتہ نہ تھا... اردو ڈراموں سے متعلق ہماری غلط فہمیاں، کردار کے اس ڈراما فیسٹول سے دور ہوگئیں۔ 'کردار' کا یہ اردو ڈراما فیسٹول ممبئی میں اپنی طرز کا پہلا فیسٹول تھا جسے شری اے کے ہنگل اور دنیش ٹھاکر کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔ نیشنل اسکول آف ڈراما NSD کے سابق ڈائرکٹر رام گوپال بجاج نے کردار کے اس اقدام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اقبال نیازی کسی سرپھرے کی طرح اردو تھیٹر کو زندہ رکھنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں انھوں نے کہا کہ اردو ہمارے اتہاس کا حصہ ہے اور ہم نے جس زبان میں ڈرامے دیکھے وہ اردو کے ہی تھے۔ آج ڈراما ہی ہمیں اپنے مسائل سے روبرو کراتا ہے، ان سے مکالمہ کرواتا ہے۔ معتبر افسانہ نگار سلام بن رزاق نے کہا کہ کردار آرٹ اکادمی نے بہت محدود وسائل کے باوجود ڈراما کے لیے اپنے جنون کو زندہ رکھا ہے، معروف تعلیمی اور سماجی خدمت گار عبدالرحمٰن ونو نے کردار آرٹ اکادمی کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا یہ گروپ ڈراموں کے ذریعے اردو زبان و ادب اور تہذیب کی پرورش کررہا ہے اور اپنے بامقصد اور بامعنی ڈراموں سے کردار نے ہمیشہ سماجی بیداری اور سماجی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ مالیگاؤں سے خصوصی طور پر تشریف لائے ڈاکٹر منظور حسن ایوبی نے خوبصورت اور پراثر اشعار کی مدد سے کردار کے فنکاروں کی تعریف کی اور اس فیسٹول کے انعقاد کو اردو ڈراموں کی تاریخ میں ایک سنگ میل قرار دیا۔ ان کے علاوہ افتتاحی تقریب میں رمیش تلوار اور کلدیپ سنگھ (اپٹا) امتیاز حسین اور شفاعت خان (ڈراما نگار)، ڈاکٹر شیخ عبداللہ، ڈاکٹر مصطفی پنجابی، خالد شاہین کے علاوہ ملک کی دیگر اہم شخصیات موجود تھیں اور پانچ روزہ پروگرام سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر'، دہلی، 29 اپریل 2013

طوطیِ ہند امیر خسرو کو جتن پرساد کا نذرانۂ عقیدت

رامپور: رضا لائبریری میں 'جشن امیر خسروؔ' کے سلسلے میں لگائی جانے والی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل جتن پرساد نے کہا کہ اردو

ملک میں اتحاد اور بھائی چارہ قائم رکھنے والی زبان ہے۔ اس لیے اسے فروغ دینا چاہیے۔ ملک کی آزادی کی لڑائی میں اردو نے ہی 'انقلاب زندہ آباد' کا نعرہ دیا تھا۔ اس بات کا اعتراف کیا کہ ملک میں اردو کو جو مقام ملنا چاہیے تھا وہ نہیں ملا۔ انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ اردو کسی مذہب یا فرقے کی زبان نہیں ہے۔ یہ گنگا جمنی تہذیب اور عام لوگوں کی زبان ہے جو کشمیر سے کنیا کماری تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ حضرت امیر خسرو نے اپنی نظموں اور رباعیات میں جہاں حضور اکرمؐ کا نذرانہ عقیدت پیش کیا وہیں انھوں نے ہندوؤں کے دیوتاؤں کے قصیدے بھی پڑھے۔ وزیر موصوف نے رضا لائبریری کو این سی پی یو ایل کی جانب سے 1300 کتابیں دینے کا اعلان کیا ہے۔ ڈائرکٹر رضا لائبریری پروفیسر سید محمد عزیز الدین نے بتایا کہ امیر خسروؒ کے کلام میں ہندو۔مسلم اتحاد اور بھائی چارہ کا پیغام ملتا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 اپریل 2013

بہادر شاہ ظفر کے باقیات ہندوستان لانے کی مہم

نئی دہلی: رنگون میں دفن آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی باقیات ہندوستان لانے کے لیے ایک بار پھر کوششیں شروع کردی گئی ہیں۔ مرحوم بادشاہ کی باقیات

دہلی لاکر خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار کے احاطے میں دفن کرنے کے لیے کئی بار کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اب معروف صحافی کلدیپ نیر، سعید نقوی نے جسٹس راجندر سچر کے ساتھ مل کر باقیات ہندوستان لانے کی مہم چھیڑی ہے۔ ان کی باقیات کو بصد احترام ہندوستان لاکر نہ صرف ہم سیکولرازم کی مثال پیش کریں گے بلکہ صوفی خواجہ بختیار کاکی کے مزار کے بغل میں ان کا مزار بنا کر ہم ان کی حسرت بھی پوری کریں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 مئی 2013

دھلی: ——————

غالب کی یاد میں کلچرل پروگرام

نئی دھلی: انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر میں آج اوما شنکر اینڈ گروپ کی جانب سے غالب کی یاد میں غالب میموریل موومنٹ کے زیر اہتمام ایک کلچرل پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب میں مہمان خصوصی دہلی کے وزیر توانائی و خوراک و رسد ہارون یوسف نے پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں اس جگہ کا رہنے والا ہوں جہاں دہلی میں غالب کی رہائش تھی۔ انھوں نے کہا کہ صرف یہیں کی بات نہیں بلکہ دہلی کو غالب کی وجہ سے ایک شناخت ملی ہے جس کی تاریخی حیثیت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ دہلی حکومت کا محکمہ لسانیات اس بات کی پوری کوشش کررہا ہے کہ مرزا غالب کی حویلی کا پورا حصہ خالی کرایا جائے اور اس میں میوزیم بنایا جائے۔ کمیشن کے چیئرمین اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے نائب صدر صفدر حسین خان نے کہا کہ ہمیں آج اس بات پر فخر ہے کہ مرزا اسداللہ خاں غالب نے اپنے کلام سے ہندوستان کا نام تمام دنیا میں روشن کیا ہے۔ قومی خواتین کمیشن کی چیئرپرسن ممتا شرما نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اس موقعے پر یادگار غالب اسکرین فلم بھی دکھائی گئی۔ پروفیسر وسیم بریلوی، نواز دیوبندی، منظر بھوپالی، انور جلال پوری، خورشید حیدر، منور رانا، پاپولر میرٹھی، فرحت، پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی اور اودے پرتاپ سنگھ و دیگر معزز شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ پروگرام کی کنوینر اوما شرما نے کہا کہ غالب اپنے کلام کے لیے ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے اہم شرکا میں دوردرشن کے ڈائرکٹر جنرل شہزاد محمد خاں، جسٹس اعجاز سہیل صدیقی وغیرہ موجود تھے۔ محفل مشاعرہ کی نظامت کے فرائض انور جلال پوری اور شاہینہ خان نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ آخر میں ڈائرکٹر جنرل آئی سی سی آر سریش کے گوئل، صفدر حسین خان، استاد اقبال احمد خان اور اوما شرما نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 اپریل 2013

اردو اکادمی دہلی کی سالانہ ایوارڈ تقریب

نئی دھلی: کوئی بھی زبان جب تک عام انسان کے لیے کاروبار میں لازمی نہ ہو جائے وہ ترقی نہیں کرسکتی۔ اس لیے اردو کو زندہ رکھنا ہے تو اسے روزگار سے جوڑنا ہوگا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اردو کی تعلیم کم سے کم آٹھویں جماعت تک ہندی کی طرح لازمی قرار دی جائے۔ یہ بات آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر نجیب جنگ نے دہلی سکریٹریٹ میں اردو اکادمی دہلی کی جانب سے منعقد سالانہ ایوارڈ تقریب کے موقعے پر بطور مہمان خصوصی تقریر کرتے ہوئے کہی۔ جامعہ کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ میں نے کوئی بڑا کام نہیں کیا اگر اردو جامعہ ملیہ میں لازمی نہیں ہوگی تو پھر کہاں ہوگی، نجیب جنگ نے اس بات کی وکالت کی کہ اسکول میں بچوں کو اردو پڑھائی جائے لیکن ترقی کے لیے انگریزی کی تعلیم بے حد ضروری ہے اسی لیے ہم نے جامعہ اسکول کو اردو میڈیم کی بجائے انگریزی میڈیم کردیا ہے۔

صدارتی تقریر میں دہلی کی وزیر تعلیم پروفیسر کرن والیہ نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کافی ترقی کی ہے۔ اور اس کی تعلیم کا معیار بھی بلند ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اکادمی دہلی اردو کے فروغ کے لیے اپنی جانب سے ہر ممکن اقدامات کررہی ہے اور اس کے لیے دہلی سرکار کا مکمل تعاون اس کے ساتھ ہے۔ انھوں نے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع اور سکریٹری انیس اعظمی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی محنت سے اکادمی نے بہترین نتائج پیش کیے ہیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ چونکہ پروفیسر اسلوب انصاری اپنی ضعیفی کے سبب ایوارڈ لینے یہاں نہیں آسکے ہیں، اس لیے ان کو بہادر شاہ ظفر ایوارڈ پیش کرنے کے لے اردو اکادمی کا ایک وفد علی گڑھ جائے گا۔ دہلی کے وزیر توانائی ہارون یوسف نے کہا کہ معاشرہ کی تشکیل اور اس کی اصلاح میں رائٹرس کا بہت اہم رول ہوتا ہے اور اردو کے ادیبوں اور شعرا نے ہمیشہ ہی قومی یکجہتی اور اتحاد کا پیغام دیا ہے۔ اس سے قبل وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا اکادمی جس طرح سے اب تک ای ٹی ای، بی ایڈ کورسز وغیرہ کے لیے امیدواروں کو کوچنگ دیتی آئی ہے اسی طرح اب بی ایڈ اور بی ٹی سی اساتذہ کو ملازمت کے لیے لازمی ٹسٹ پاس کرنے کے لیے بھی مفت کوچنگ کرائے گی۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو کے احیا اور اس کے فروغ کے لیے اہم قدم اٹھائے جانے پر وائس چانسلر نجیب جنگ کو اردو اکادمی کے 'سرپرائز ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ اسی حیثیت کا دوسرا بڑا ایوارڈ 'پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ' دہلی کے معروف محقق و نقاد اور سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر محمد ذاکر کو پیش کیا گیا۔ علاوہ ازیں اردو کے معروف و بزرگ صحافی و ادیب سید ماجد علی زیدی المعروف ماجد رمن کو ان کی اردو صحافت کی خدمات کے پیش نظر اردو صحافت کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ تقریب کی نظامت اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے کی۔ اس موقعے پر دہلی کی متعدد ادبی، صحافتی اور سماجی شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 اپریل 2013

اردو و پنجابی سے متعلق سروے

نئی دھلی: دہلی اقلیتی کمیشن کی دسویں سکھ صلاح کار کمیٹی کی میٹنگ کمیشن کے دفتر میں سردار پشپندر سنگھ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر پشپندر سنگھ نے بتایا کہ پنجابی اور اردو زبان سے متعلق جو سروے کمیشن کے ذریعے کرایا گیا ہے اس کی ابتدائی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دہلی سرکار میں 65 دفتر اور 53 مختار ادارے ہیں۔ اگر ان سبھی میں پنجابی اور اردو کے زبان افسر کا تقرر کیا جائے تو 700 زبان افسران کی ضرورت پڑے گی۔ دہلی حکومت میں ایک لاکھ 70 ہزار ملازمین کام کرتے ہیں، جس کو دیکھتے ہوئے دہلی سرکار پر ان 700 زبان افسران کی تقرری سے کوئی خاص اقتصادی بوجھ نہیں پڑے گا۔ پشپندر سنگھ نے بتایا کہ کمیشن کے ذریعے آئندہ ماہ اس رپورٹ کی فائنل کاپی دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دکشت کو پیش کی جائے گی۔ اس موقعے پر دہلی اقلیتی کمیشن کے ممبر اے سی مائیکل نے بھی میٹنگ سے خطاب کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اپریل 2013

علامہ اقبال پر یادگاری خطبہ

نئی دھلی: شاعر مشرق علامہ سر محمد اقبال کے یوم وفات کے سلسلے میں اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام چوتھے 'علامہ اقبال یادگاری خطبہ' کا انعقاد کیا گیا۔ اکادمی کے قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم میں 'کلام اقبال، جدید فارسی شاعری کے تناظر میں' کے موضوع پر منعقد کیا گیا یہ خصوصی لیکچر دہلی یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے سابق صدر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے دیا۔ اس ادبی پروگرام کی صدارت ذاکر حسین دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسلم پرویز نے کی جب کہ ڈاکٹر جی آر کنول نے بطور خاص شرکت کی۔ اردو اکادمی کی سیمینار کمیٹی کے کنوینر و ماہر اقبالیات پروفیسر ایمریٹس عبدالحق نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے اور مہمانان کا تعارف کرایا۔ اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے تمام مہمانان و شرکا کا شکریہ ادا کیا اور شاعر مشرق کے حوالے سے اپنی معلومات کی ضیاپاشی کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، ڈاکٹر علیم اشرف، ڈاکٹر خالد علوی، ڈاکٹر جمیل الرحمٰن، ڈاکٹر محمد شمیم، ڈاکٹر جمشید خان، ڈاکٹر ملک تسلیم جاوید، ڈاکٹر صغیر اختر، مسٹر عثمانی، مسٹر شمسی، ڈاکٹر شعیب رضا فاطمی، ڈاکٹر سید احمد، علیم الدین اسعدی اور شہباز ندیم ضیائی سمیت بڑی تعداد میں علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والی شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 اپریل 2013

گوپی چند نارنگ کی نئی کتاب پر گفتگو

نئی دھلی: غالب کے متن کی تعبیریں وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہیں۔ بجنوری کا غالب وہ نہیں ہے جسے حالی نے پڑھا تھا اور حالی کا غالب وہ نہیں جسے شیخ محمد اکرام یا نظم طباطبائی یا سہا مجددی نے پڑھا۔ جیسے کلاسکیت پرستوں اور رومانیت کے شیدائیوں کو اپنے اپنے غالب مل گئے تھے، ترقی پسندوں اور جدیدیت والوں نے بھی غالب کی اپنی اپنی تعبیریں وضع کرلی تھیں۔ ان خیالات کا اظہار اردو زبان و ادب کے ممتاز نقاد، دانشور

اور محقق پدم بھوشن و ستارۂ امتیاز پروفیسر گوپی چند نارنگ نے صحافیوں سے اپنی نئی کتاب 'غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کیا۔ غالب کے نئے مطالعے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ غالب کے نئے انسان کا تصور جیسے جدید ذہن کو راس آتا تھا، غالب کی جدلیاتی فکر عہد حاضر کے مابعد جدید مزاج کو راس آتی ہے۔ پروفیسر نارنگ نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ نئی علمیات اور شعریات سب سے زیادہ زور معنیاتی تکثیریت، تجسس اور بوقلمونی پر دیتی ہے اور غالب کے جدلیاتی ڈسکورس کا آزادگی وکشادگی پر زور دینا اور طرفوں کو کھلا رکھنا گویا مابعد جدید ذہن سے خاص نسبت رکھتا ہے۔ غالب کی فکر ایسے تمام تعینات وتصورات کو بے دخل کرتی ہے جو فکر ونظر کی آزادی کو مسدود کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب کے کچھ اہم نکات کی نشاندہی کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ یہ کتاب غالب کی نئی باریک بیں قرأت اور غالب شناسی کا ایک نیا سنگ میل ثابت ہوگی جو حالی کی تائید وتوثیق نیز ردتشکیل؛ اور آج کے تنقیدی محاورے کی رو سے نئے فکر انگیز سوالات کو سامنے لاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ سبک ہندی کی شعریات؛ اور ہندوستان کے تہذیبی وجدان وزیر زمین لاشعوری رشتوں اور جڑوں پر نئے تنقیدی دریچوں کو وا کرتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ کتاب میں نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ غالب بخط غالب اور متداول دیوان مشمولہ نسخہ شیرانی وگل رعنا کے متن کا جامع جدلیاتی معروضی مطالعہ پیش کیا گا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے بتایا کہ یہ تقریباً دس بارہ برسوں کی محنت کا ثمرہ ہے۔ کچھ کام حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے دورانِ قیام مکمل کیا جاسکا اور پہلے بہت سا کام دہلی میں جاری رہا۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب سے اکیسویں صدی میں غالب فہمی کے نئے دروازے وا ہوں گے۔

روزنامہ 'قومی سلامتی' دہلی، 21 اپریل 2013

ویسم بریلوی و اطہر فاروقی کو استقبالیہ

نئی دہلی: معروف شاعر پروفیسر وسیم بریلوی کو

اترپردیش سرکار کی جانب سے لیش بھارتی ایوارڈ سے نوازے جانے اور ڈاکٹر اطہر فاروقی ایڈووکیٹ کو انجمن ترقی اردو کا سکریٹری منتخب کیے جانے پر الحکمہ ایجوکیشن پوائنٹ ذاکر نگر نئی دہلی کی جانب سے استقبالیہ دیا گیا۔ استقبالیہ پروگرام میں الحکمہ فاؤنڈیشن کے چیئر مین ڈاکٹر ضیاء الدین ندوی نے تمام مہمانوں کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر وسیم بریلوی نے الحکمہ فاؤنڈیشن کی کارکردگی پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنی طرف سے الحکمہ فاؤنڈیشن کا ہر طرح سے تعاون کروں گا۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر اطہر فاروقی ایڈووکیٹ نے فاؤنڈر کی کارکردگی کو بہ نظر تحسین دیکھتے ہوئے انجمن ترقی اردو کی جانب سے بھرپور تعاون دینے کا یقین دلایا۔ پروفیسر خالد محمود نے صدارت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 اپریل 2013

آندھرا پردیش

شگوفہ کا نصرت ظہیر نمبر

حیدرآباد: زندہ دلان حیدرآباد کے مشہور زمانہ ترجمان ماہنامہ شگوفہ کے تازہ خصوصی ضخیم شمارے میں اس مرتبہ عصری طنز ومزاح کے ایک نمائندہ تخلیق کار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بلا ناغہ اشاعت میں اردو طنز ومزاح کے مایہ ناز جریدے 'اودھ پنچ' کا ریکارڈ توڑنے والے طنزیہ مزاحیہ ماہنامہ 'شگوفہ' کے نصرت ظہیر نمبر' میں مقبول صحافی وممتاز طنز ومزاح نگار کی شخصیت وفن پر پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، پروفیسر نثار احمد فاروقی، موہن چراغی اور شجاع خاور کے علاوہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور ظفر عدیم کے تنقیدی جائزے و خاکے شامل ہیں۔ تعارفی مہمان اداریہ پروفیسر محمد ظفر الدین کا ہے۔ مدیر شگوفہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کے پریس نوٹ کے بموجب ماہنامہ 'شگوفہ' نے پچھلے 46 برسوں میں تیس سے زائد خصوصی نمبر اور 70 کے قریب مختلف النوع گوشوں پر مشتمل خاص شمارے شائع کیے ہیں۔ نصرت ظہیر کے انشائیوں، مکالموں، نثری پیروڈیوں نیز ان کے کارٹونوں، تصاویر و شاعری کے انتخاب نے اس شمارے کو دلکش، شاداب اور متنوع بنا دیا ہے۔ اسے ویب سائٹ شگوفہ ڈاٹ کوم پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اپریل 2013

دہلی سکریٹریٹ میں جلسہ تقسیم انعامات

نئی دہلی: دہلی حکومت کے محکمہ فن وثقافت والسنہ، اردو سیل کے زیر اہتمام دہلی کی سکریٹریٹ میں 'جلسہ تقسیم انعامات' کا انعقاد کیا گیا، جس میں سرکاری محکموں میں ملازمت کررہے ان افراد کو انعامات سے نوازا گیا جو اردو کی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ تعارفی تقریر میں محکمہ کے اردو افسر اشفاق احمد عارفی نے بتایا کہ جس طرح محکمے کے ذریعے ہندی شعبے کے ہندی زبان میں مختلف مقابلہ، ورکشاپ اور کورسیز کرائے جاتے ہیں اسی طرح اردو زبان میں بھی سرکاری یا سرکار سے منسلکہ دفاتر میں کام کرنے والے غیر اردو داں ملازمین کو مقابلہ جاتی امتحانات اور تربیتی کورسیز کرائے جاتے ہیں جس میں اردو سرٹیفکیٹ کورس، اردو مضمون نویسی اور خوش نویسی کا خاص طور سے مقابلہ ہوتا ہے۔ ان مقابلوں میں کامیاب

ہونے والے افراد کو اول، دوم، سوم اور حوصلہ افزائی کے انعامات کچھ معینہ رقم، ٹرافی اور سند کے ساتھ دیے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ 2001 سے جاری ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کے پروگراموں سے متاثر ہوکر حکومت سے بہت سے محکموں نے ہمیں درخواستیں دی ہیں جس میں ملازمین کو اردو کی تعلیم دیے جانے کی گزارش کی گئی ہے۔ اشفاق عارفی نے یہ بھی بتایا کہ دہلی میں اردو دوسری سرکاری زبان ہے لہٰذا لوگوں کو چاہیے کہ وہ سرکاری محکموں میں اردو زبان میں زیادہ سے زیادہ درخواستیں دیں، اگر اس پر عمل نہ ہو یا جواب اردو میں نہ آئے تو اس کی شکایت دہلی سرکار کے محکمہ ثقافت والسنہ کے اردو سیل میں کی جاسکتی ہے۔ اس موقعے پر امرتا بیرا نے اقبال اشہر کا لکھا ہوا اردو ترانہ بھی پیش کیا۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو طبقے کے ذریعے اردو کے تئیں برتی جانے والی بے اعتنائی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو تنزلی کی طرف لے جانے میں انھیں لوگوں کا خاص کردار ہے جو اردو کا دم بھرتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی یکم مئی 2013

اتر پردیش:

اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ

لکھنؤ: انجمن ترقی اردو اتر پردیش کی مجلس عاملہ کا اجلاس نعمت اللہ بلڈنگ امین آباد لکھنؤ میں زیر صدارت جناب چودھری شرف الدین منعقد ہوا جس میں صوبے بھر کے مختلف اضلاع کے محبان اردو نے شرکت کی، شرکت کرنے والوں میں پروفیسر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر ڈاکٹر خان محمد عاطف، پروفیسر ڈاکٹر شاہ عبدالسلام وغیرہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جلسے میں مقررین نے جہاں حکومت کے معلم اردو کے اساتذہ کی منظوری کا خیر مقدم کیا وہاں یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ جو لوگ عمر کی حد پار کر چکے ہیں ان کو عمر میں رعایت دی جائے تاکہ ان کی زندگی برباد نہ ہو۔ ایک مطالبہ یہ بھی کیا گیا کہ اقلیتوں کے تعلق سے جو ادارے ہیں ان میں سربراہوں کی ترقی فوراً کی جائے تاکہ وہ مقصد حاصل ہو جس کے لیے ادارے قائم کیے گئے تھے، ایک تجویز میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ اردو اکادمی بزرگ ادیبوں، صحافیوں، شاعروں اور دانشوروں کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ حقیر رقم دیتی ہے اس کو بڑھا کر پانچ ہزار روپے کر دیا جائے۔ اجلاس میں حکومت سے اس کے منشور کے مطابق جلد سے جلد اردو میڈیم ہائی اسکول اور انٹر کالج قائم کیے جائیں۔ اجلاس میں شریک لوگوں سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ کم از کم اردو کا ایک اخبار ضرور بالضرور خریدیں اور اپنے بچوں کو گھر پر اردو پڑھائیں تاکہ وہ زبان کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن اور زبان سے واقف ہو جائیں۔ اردو اکادمی اور فخر الدین علی احمد کمیٹی کی نئے سرے سے تشکیل کی جائے اور اس میں باصلاحیت افراد کا تقرر کیا جائے اس سے قبل انجمن کے جنرل سیکریٹری محمود الظفر رحمانی ایڈووکیٹ نے گزشتہ کارروائی کی مکمل رپورٹ پیش کی۔ جلسے کے اختتام پر چودھری شرف الدین نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 13 اپریل 2013

کیرانہ میں اردو پر مباحثہ

کیرانہ: معروف شاعر و ادیب شمس دیوبندی نے اردو کی حالت زار پر ہوئے ایک مباحثے میں کہا کہ دینی مدارس و مکاتب نے آج بھی اردو زبان کے اثاثے کو بچا رکھا ہے، جس سے ہمارا مذہب و کلچر، ثقافت اور تمدن محفوظ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی ترقی و ترویج کا آغاز مغلیہ دور سے شروع ہوا اور یہ زبان جلد ہی ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوئی ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان بن گئی۔ انھوں نے کہا اردو کی ترقی میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو ادیبوں نے بھی بہت کام کیا ہے۔ موصوف معروف شاعر کوثر کیرانوی نے کہا کہ تاریخی اعتبار سے لکھنؤ، دہلی، اور حیدرآباد ہندوستان میں اردو زبان و ادب کے گہوارے تصور کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہندوستان کی بعض ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا گیا لیکن اس ضمن میں کوئی خاص ٹھوس کارروائی نہیں کی گئی۔

روزنامہ 'قومی سلامتی' دہلی، 15 اپریل 2013

میکش اکبرآبادی کے فن و شخصیت پر سیمینار

آگرہ: علامہ میکش اکبرآبادی کے فن اور شخصیت پر منعقد سیمینار بزم میکش آگرہ کی جانب سے گراؤنٹ ہوٹل میں منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نے بحیثیت مہمان خصوصی کہا کہ تصوف، اردو شاعری، تصوف اور علامہ اقبال کو نئے سرے سے سمجھنے کے لیے میکش اکبرآبادی کو سمجھنا ضروری ہے۔ آگرہ نے اردو زبان کے ائمہ اربعہ یعنی خان آرزو، میر تقی میر، نظیر اکبرآبادی اور مرزا غالب جیسے اساطین دیے۔ اس موقعے پر میکش ایوارڈ افتخار امام صدیقی ایڈیٹر ماہنامہ شاعر ممبئی کو دیا گیا۔ ان کی جانب سے یہ ایوارڈ ان کی صاحبزادی حنا صدیقی نے وصول کیا۔ اس موقعے پر آگرہ یونیورسٹی سے اردو میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر میکش گولڈ میڈل دیا گیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر علی احمد فاطمی (الہ آباد یونیورسٹی) نے آگرہ میں اردو تعلیم کے فروغ کے لیے میکش اکبرآبادی کی خدمت اور ان کی جدوجہد پر مقالہ پیش کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نسرین بیگم نے انجام دیے۔ صدارت حکیم سید معراج الدین نے کی۔ سرپرست سید اجمل علی شاہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 اپریل 2013

'روہیل کھنڈ میں افسانہ و غزل' سیمینار

رامپور: آل انڈیا مسلم فیڈریشن کے زیر اہتمام یک روزہ اردو ادبی سیمینار بعنوان 'روہیل کنڈ میں اردو افسانہ اور غزل' کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کے روح رواں الیس فضیل نے افتتاحی کلمات میں سیمینار کے اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ روہیل کھنڈ میں جتنے شعرا اور ادبا پیدا ہوئے انھوں نے پورے ملک میں اپنے وطن عزیز کا نام روشن کیا۔ انھوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ آج ہمارے بچے اردو کی تعلیم سے بہت دور نظر آ رہے ہیں اور اس کے لیے کسی حد تک ہم خود ذمے دار ہیں۔ بعد ازاں غزالہ پروین نے اپنا مقالہ پیش کیا اور صولت پبلک لائبریری کے صدر س ش عالم نے رامپور میں اردو غزل پر تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے روہیل کھنڈ میں خصوصی طور پر رامپور کے شعرا اور ادیبوں کی اردو خدمات کا ذکر کیا۔ تقریب کی صدارت مسلم فیڈریشن کے قومی صدر نسیم احمد ایڈووکیٹ نے کی جب کہ مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے پروفیسر طاہر بیگ اسما اسلم، اتراکھنڈ کے صوبائی صدر عبدالعزیز قریشی، شباب عالم اور قومی جنرل سکریٹری بابر خاں موجود تھے۔ سیمینار کی نظامت انور لطفی نے کی۔ تقریب میں ڈاکٹر رباب انجم، انجم بہار شمسی، فائزہ زبیر، ڈاکٹر تبسم صابر، ساجدہ شیروانی، سید مسرور میاں اکرام، جعفر خاں، ضمیر امید ایڈووکیٹ، مسرت تنزیل، عبید خاں، سید اطہر مسعود، ریاض احمد کے علاوہ کثیر تعداد میں معززین شہر موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 6 دہلی 2013

میتھلی اردو ڈکشنری ورکشاپ

وزارت انسانی وسائل کے محکمہ اعلیٰ تعلیم کے تحت قائم ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے علاقائی مرکز اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر لکھنؤ کی زیر نگرانی بتاریخ 31 مارچ تا اپریل 2013 ایک آٹھ روزہ ورکشاپ 'میتھلی اردو انگلش ڈکشنری' تیار کرنے کی غرض سے پروفیسر و ڈاکٹر ملکہ خورشید سلطانہ کے زیر ہدایت منعقد کی گئی۔ میتھلی زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں یہ ورکشاپ ایک تاریخی اور تعمیری حیثیت رکھتا ہے۔ مزید میتھلی اردو اور دیگر زبان اور بولیوں کے بولنے والے بھی اس ڈکشنری کی مدد سے میتھلی اور اردو کے الفاظ سے بخوبی واقف ہو جائیں گے۔ مذکورہ باتیں ورکشاپ اور پروگرام کی کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر ملکہ خورشید سلطانہ نے ورکشاپ اور اس کے موضوع کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہی۔ اس ورکشاپ میں میتھلی، ہندی، اردو اور انگریزی کے محققین اور اسکالرز کو جمع کیا گیا تھا، ورکشاپ کے درمیان

متھلا سے آئے ہوئے محققین اور اسکالرز کی ادارے کے ڈائرکٹر، اساتذہ اور کارکنان کے ذریعے تعریف و تحسین کی گئی۔ للت نرائن متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کے سی ایم کالج ہندی ڈپارٹمنٹ کے ڈاکٹر کرشن چندر جھا اور اسی کالج کے میتھلی ڈپارٹمنٹ کے صدر ڈاکٹر نرائن جھا، مارواڑی کالج کے میتھلی ڈپارٹمنٹ صدر ڈاکٹر شری شنکر جھا اور بی ایم ایس کالج بھیڑی کے شعبہ ہندی کے صدر ڈاکٹر امیش کار کو ایک ماہر اور اکسپرٹ کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ اردو انگریزی کے ماہرین اور اسکالرز کو بھی اس ورکشاپ میں دعوت دی گئی تھی جس میں ڈاکٹر ایاز احمد، ڈاکٹر محمد قمر الدین، ڈاکٹر طیب علی خاں، سید محمد عمیر ندوی، علینہ علی ملک اور ضوفشاں انجم قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز (پروفیسر) ملکہ خورشید،لکھنؤ، 31 مارچ2013

ٹیپو سلطان کا 214واں یومِ شہادت

علی گڑھ: ٹیپو سلطان ایک انتہائی سیکولر بادشاہ تھے اور ان کی حکومت میں تقریباً 150 مندروں کو باقاعدہ سرکاری خزانے سے گرانٹ ملتی تھی۔ ان خیالات کا اظہار معروف صحافی یوسف انصاری نے کیا۔ وہ سرسید اوئینس فورم کے زیرِ اہتمام ٹیپو سلطان کے 214 ویں یومِ شہادت پر 'ٹیپو سلطان کی حیات و خدمات' پر منعقدہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس کو بطورِ مہمانِ خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ٹیپو سلطان کی شہادت تاریخ کا وہ موڑ ہے جہاں سے انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کا آغاز ہوتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ میڈیا نے ٹیپو سلطان کی شخصیت کو اس انداز سے اجاگر نہیں کیا جس انداز سے کیا جانا تھا۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے وائس چانسلر ضمیر الدین شاہ نے کہا کہ اس ادارے میں مجوزہ اسٹریٹجک سینٹر کا نام ٹیپو سلطان کے نام پر رکھا جائے گا۔ انھوں نے بتایا کہ فوجیوں کو تاریخ میں گہری دلچسپی ہوتی ہے اور ایک فوجی ہونے کے ناطے وہ ٹیپو سلطان سے کافی متاثر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ٹیپو سلطان حقیقی معنوں میں سیکولر تھے۔ پروفیسر اے آر قدوائی نے کہا کہ ٹیپو سلطان ہندوستانیوں کے لیے ایک رول ماڈل ہے کیونکہ انھوں نے ہندو اور مسلمان دونوں میں کوئی تفریق نہیں کی۔ سرسید اوئینس فورم کے صدر ڈاکٹر شکیل صمدانی نے کہا کہ میڈیا کی بے رخی اور فرقہ پرست طاقتوں کی سازش کی وجہ سے ٹیپو سلطان کو لوگ فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ٹیپو سلطان نہ صرف شیرِ میسور تھا بلکہ وہ شیرِ ہند اور شیرِ مشرق تھا۔ انھوں نے وائس چانسلر سے گزارش کی کہ ٹیپو سلطان کے نام پر ایک اسٹڈی سینٹر قائم کیا جائے۔ انھوں نے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ٹیپو کے نام پر میسور ایئرپورٹ کا نام رکھا جائے اور این سی ای آر ٹی کی کتابوں میں ایک چیپٹر ٹیپو سلطان کے نام پر ضرور شامل کیا جائے۔ اس موقعے پر پروفیسر این اے کے درانی، ڈاکٹر سید محبّ الحق وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر عبید اقبال کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ فواز شاہین نے حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ نشرہ حیدر نے فورم کے مقاصد پر روشنی ڈالی اور مینا خاں نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 مئی 2013

حیات اللہ انصاری کے فن و شخصیت پر سیمینار

لکھنؤ: روزنامہ آگ کے ایڈیٹر احمد ابراہیم علوی نے ریاستی انجمن ترقی اردو اتر پردیش کی جانب سے مدرسہ حیات العلوم فرنگی محل میں 'حیات اللہ انصاری حیات و خدمات' پر منعقد ہونے والے سیمینار میں کہا کہ حیات اللہ انصاری جیسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی خاص خوبی یہ تھی کہ وہ لوگوں کو بنایا کرتے تھے اور ان کی عظمت، ان کے مقام و مرتبے کی قدر کرتے تھے۔ اردو صحافت پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ قارئین سے رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا ہی صحافت کا اصل مقصد ہے۔ مہمان خصوصی رمیش دکشت نے کہا کہ حیات اللہ انصاری کے اندر ایک خاصیت یہ تھی کہ خاندان اور سماج کو جوڑنے کا کام کرتے تھے۔ حیات اللہ انصاری نے قومی آواز کے ذریعے ملک اور سماج کی کم وقت میں وہ خدمت انجام دی جس کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں اور انھوں نے قومی آواز کے ذریعے وطن پرستی، مساوات اور اکثریت و اقلیت کے درمیان مساویانہ حقوق کا پیغام دیا۔ مقالہ نگار مرزا شفیق حسین شفق نے حیات اللہ انصاری کے مختلف افسانوں اور ناولوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے وقت کا جید صحافی، کامیاب افسانہ نگار اور ناول نگار قرار دیا۔ اخیر میں ریاستی انجمن ترقی اردو اتر پردیش کے ضلع صدر محمد خالد اعظمی نے انجمن کے مقاصد کو لوگوں کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ حیات اللہ انصاری پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 مئی 2013

جموں و کشمیر:

راجوری میں کوئز سیمینار

راجوری: راجوری ضلع کے ہائر سیکنڈری اسکول سموٹ میں تحریک بقائے اردو نے آرمی کے اشتراک سے یک روزہ سیمینار اور کوئز مقابلہ منعقد کرایا جس میں مہمان خصوصی ممبر اسمبلی درہال چودھری ذوالفقار علی نے بتایا کہ تب تک ریاست میں اردو دبی رہے گی جب تک کہ ریاستی سرکار اس کو ملازمت سے نہیں جوڑے گی۔ اس پروگرام کی صدارت تحریک کے سرپرست فاروقی شاہ بخاری کر رہے تھے جب کہ 60 راشٹریہ رائفل ناگا کے کمانڈنگ آفیسر محمد شاہد احمد خان مہمان ذی وقار کے طور موجود تھے۔ اس پروگرام کی شروعات میں تحریک کے صدر عرفان علی عارف نے استقبالیہ خطبہ پڑھا اور تحریک کے اغراض و مقاصد بیان کیے جس کے بعد جنرل سیکریٹری و ترجمان ذاکر ملک بھلیسی نے تحریک کی دو سال کی کارکردگی لوگوں کے سامنے رکھی اور آئندہ کا لائحہ عمل کا بھی اعلان کیا۔ پروگرام کی نظامت بارہویں کلاس کی طالبہ رابیہ میر کر رہی تھے۔ سیمینار میں موضوع 'اردو و قومی یکجہتی' کے حوالے سے 7 طلبا نے حصہ لیا جن میں آسیہ میر، رابیہ میر، سورین کوثر، نازیہ کوثر، نورین کوثر اور تنویر احمد شامل تھے۔ اس مقالے میں بارہویں کلاس کی آسیہ میر نے اوّل مقام حاصل کیا۔ کوئز مقابلے میں کل 4 ٹیموں نے حصہ لیا جن میں سے ٹیم اے نے کوئز مقابلے کو جیتا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 مئی 2013

مہاراشٹر:

تحریر نو کی ادبی خدمات پر سمپوزیم

ممبئی: یک روزہ قومی سمپوزیم 'تحریر نو کی ادبی خدمات' کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ بے شمار رسائل و جرائد کی بھیڑ میں وہی رسالے اپنے نقوش ثبت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جو معاشرے کی حقیقی عکاسی کرتے ہیں اور عوامی مسائل کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔ تحریر نو کے

اداریوں میں یہ وصف صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ انقلاب کے ایڈیٹر شاہد لطیف نے کہا کہ موجودہ دور میں تکنالوجی کے ذریعے اردو رسائل و جرائد کی ترقی کے روشن امکانات ہیں اور ادب کی کاوشوں کو تکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے سے نہ صرف خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے بلکہ اس کا دائرہ پوری دنیا تک وسیع ہوگا۔ مولانا ابوظفر حسان ندوی (بھیونڈی) نے تحریر نو کو جاگتے رہو کی صدا

لگانے سے تعبیر کیا وہیں اورنگ آباد کے ماہر تعلیم ڈاکٹر غفار قادری نے تحریر نو کے اداریوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سماج کو آئینہ دکھانے اور معاشرے میں صالح تبدیلی کی راہ ہموار کرنے میں ان اداریوں کا اہم کردار ہے۔ ای ٹی وی اردو سے وابستہ بھوپال کے ڈاکٹر مہتاب عالم نے شمالی ہند اور جنوبی ہند کا موازنہ کرتے ہوئے اردو صحافت کا جائزہ لیا اور کہا کہ تحریر نو نے اپنی ایک منفرد پہچان بنائی ہے۔ اس اجلاس میں اسیم کاویانی، منور علی رضوی اور ہندی اردو کے معروف صحافی فیروز اشرف نے بھی رسائل و جرائد کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر نو کی پذیرائی کی۔ سابق صدر شعبہ اردو ممبئی یونی ورسٹی پروفیسر یونس اگاسکر کی صدارت میں منعقد دوسرے اور آخری اجلاس میں ظہیر علی، حقانی القاسمی (دہلی) اور رحمان عباس نے تحریر نو کے حوالے سے مقالات پیش کیے۔ مشہور و معروف نقاد، شاعر و صحافی فضیل جعفری نے تحریر نو کے تازہ شمارے کا اجرا کرتے ہوئے اپنی افتتاحی تقریر میں رسالے کے 5 سال پورا ہونے پر ظہیر انصاری کو مبارک باد دی۔ مہمانان خصوصی مشہور صنعت کار میڈلے فارمیسیٹکلس کے چیئرمین سمیع خطیب اور کاسٹ ویریفکیشن کے سابق چیئرمین سید ناصر الدین قادری کے علاوہ نامور وکیل یاسین مومن نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 10 اپریل 2013

اعزاز و اکرام:

کیفی اعظمی ایوارڈ

لکھنؤ: کیفی اعظمی جیسے مشہور و معروف شاعر جنھوں نے زندگی کا بڑا حصہ ممبئی میں بسر کیا لیکن وہ اپنے آبائی وطن، اپنے گاؤں کی مٹی سے جڑے رہے۔ اس کے لیے انھوں نے بڑی محنت و مشقت بھی کی۔ انھوں نے اپنے قلم اور عمل سے جو کارہائے نمایاں انجام دیے انھیں آگے بڑھانا ہی انھیں سچا خراج عقیدت ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے سنگیت ناٹک اکادمی کے سنت گاڈ کے ہال میں منعقد ایک تقریب میں کیا۔ کیفی اعظمی کی 11 ویں برسی

کے موقعے پر کیفی ایوارڈ کی تقریب کے مہمان خصوصی وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے کہا کہ حکومتی سطح پر ادب، ثقافت کے فروغ کے لیے بھرپور تعاون دیا جائے گا۔ اس موقعے پر وزیر اعلیٰ نے کیفی اعظمی اکادمی کی جانب سے معروف شاعر پروفیسر وسیم بریلوی، مشہور کوی ڈاکٹر گوپال داس نیرج، خبر لہریا کی ایڈیٹر شالنی جوشی اور ان کی معاون میرا کو کیفی ایوارڈ سے نوازا۔ ایوارڈ کے بطور تمام معزز مہمانوں کو ایک شال، ایک نشان یادگار اور توصیفی سند پیش کی گئی۔ اس سے قبل ممبر راجیہ سبھا جاوید اختر نے تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے لکھنؤ سے اپنے گہرے تعلق کا تذکرہ کیا۔ اکادمی کے جنرل سکریٹری سعید مہدی نے مختصر رپورٹ پیش کی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر گوپال داس نیرج، پروفیسر وسیم بریلوی اور شالنی جوشی نے بھی اظہار خیال کیا۔ تقریب کی نظامت خلیل خاں نے کی۔ تقریب کے دوسرے دور میں مصروف نغمہ نگار و اسکرپٹ رائٹر جاوید اختر کا تخلیق کردہ ڈرامہ 'کیفی اور میں' پیش کیا گیا جس میں خود جاوید اختر نے کیفی اعظمی کا اور شبانہ اعظمی نے شوکت کیفی کا کردار پیش کیا۔ اس دوران معروف غزل گلوکار جسویندر سنگھ اور ساتھیوں نے کیفی اعظمی کی غزلوں کو مترنم آواز میں پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 مئی 2013

قومی یکجہتی ایوارڈ

نئی دہلی: ساؤتھ ایشین مائنارٹیز لائرز ایسوسی ایشن (ساملا) کے زیر اہتمام یہاں منعقدہ ایک مذاکرہ میں نامور دانشور، سیاست داں، سفارت کار اور سابق رکن

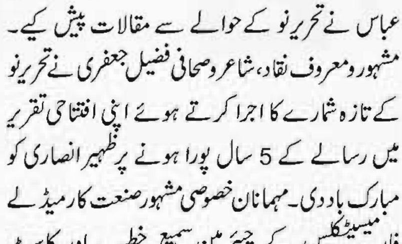

پارلیمان سید شہاب الدین اور ممتاز صحافی کلدیپ نیر کو ان کی خدمات کے اعتراف میں قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ قومی اقلیتی کمیشن کے سربراہ وجاہت حبیب اللہ کے بدست یہ ایوارڈ ان دونوں صاحبان کو پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر ساملا کے سکریٹری جنرل فیروز خان غازی نے کہا کہ ان دونوں شخصیات کی ہر میدان میں خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہر ملک اور معاشرہ میں بعض ایسی شخصیات ہوتی ہیں جنھیں ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے۔ کلدیپ نیر اور سید شہاب الدین دونوں اسی طرح کی گراں قدر شخصیات ہیں۔ پروگرام کو آرڈی نیٹر سالار محمد خاں نے شہاب الدین کی خدمات کا خاکہ پیش کیا جب کہ شکیل احمد نے کلدیپ نیر کے حالات زندگی پیش کیے۔ وجاہت حبیب اللہ نے کہا کہ ان دونوں بزرگوں نے ہندوستان کی یکجہتی کے لیے کام کیا ہے اور ستون کے مانند ہیں اور تاریخ میں ان کے نام کو سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اپنے ملک کے جمہوری نظام سے ہم نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 اپریل 2013

سیما صغیر کو ساہتیہ شری اردو ادب ایوارڈ

علی گڑھ: چوبیس ویں بین الاقوامی ادبی جشن کے موقعے پر ہندی اردو ادب ایوارڈ کمیٹی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبہ اردو کی استاد معروف ادیبہ سیما صغیر کو 'ساہتیہ شری اردو ادب ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ ان کی قومی یکجہتی اور مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔ مذکورہ ایوارڈ گورنر اتر پردیش بی ایل جوشی نے لکھنؤ میں منعقد ایک پروقار تقریب میں انھیں پیش کیا۔ گورنر نے اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندی اردو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اس موقعے سے جن معروف ادیبوں کو ایوارڈ سے نوازا گیا ان میں مصروف کہانی کار جاوید صدیقی، پروفیسر نصیر خاں، ڈاکٹر خواجہ یونس، پروفیسر صاحب علی، ڈاکٹر اقتدار فاروقی اور ڈاکٹر شیخ عبداللہ کے نام ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سیما صغیر نے کہا کہ 1857 کے بعد جب ہندوستان پورے طور پر انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا تو ادب نے بھی درباروں سے نکل کر عوام کی ترجمانی کا کام شروع کیا۔ معنویت پیدا ہوئی اور ادب کا دامن مزید وسیع ہوا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 10 اپریل 2013

معصوم شرقی کو وحشت اور پرویز شاہدی ایوارڈ

مغربی بنگال: اردو کے معروف شاعر اور محقق ڈاکٹر معصوم شرقی کو ان کے مقبول شعری مجموعہ 'عکس تاب' (مطبوعہ 2009) پر بہار اردو اکادمی کی جانب سے پرویز شاہدی ایوارڈ اور مغربی بنگال اردو اکادمی کی جانب سے علامہ رضا علی وحشت ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ادبی انعامات رقم اور اسناد پر مشتمل ہیں۔ کولکاتا میں منعقدہ ایک پروقار تقریب میں انھیں یہ اعزاز اکادمی کے نائب چیئرمین پروفیسر سید منال شاہ القادری اور اردو بھون پٹنہ میں معزز وزیر اقلیتی فلاح جناب شاہد علی خان کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔ اس موقع پر شہر کی علمی و ادبی شخصیتوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر معصوم شرقی تنقیدی اور تحقیقی مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔ موصوف کا بے مثال تحقیقی کارنامہ 'نظیر ثانی اشک امرتسری' کی بازیافت ہے۔

پریس ریلیز، ایم نصر اللہ (ہوزہ، مغربی بنگال) 23 اپریل 2013

دانش اقبال کو ریڈیو ایوارڈ

نئی دھلی: دلی کے شنڈے آڈیٹوریم میں ہونے والی پروقار اور بارونق تقریب میں مرکزی وزیر برائے اطلاعات ونشریات منیش تیواری نے تخلیقی کارکردگی پر ملک کے نمایاں ریڈیو براڈ کاسٹر کو اے آئی آر کے سالانہ ایوارڈ پیش کیے۔ ایوارڈ یافتگان میں اے آئی آر کے ایف ایم گولڈ چینل کے سربراہ دانش اقبال بھی شامل تھے۔ دانش اقبال کو گزشتہ دس سال میں اس قومی ایوارڈ سے سات مرتبہ نوازا جاچکا ہے اور مختلف بین الاقوامی ریڈیو ایوارڈز کے لیے وہ تیرہ مرتبہ نامزد کیے جاچکے ہیں۔ اس کے علاوہ دانش اقبال کو ساہتیہ کلا پریشد کے موہن راکیش سمان سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ دانش اقبال گزشتہ پچیس سال کے عرصے میں آل انڈیا ریڈیو کے حیدرآباد، دہلی اور سری نگر اسٹیشنوں سے وابستہ رہے ہیں۔ وہ اے آئی آر کے سینٹرل ڈرامہ یونٹ کے سربراہ بھی رہ چکے ہیں۔ وہ اب تک ایک ہزار سے بھی زائد ریڈیو ڈرامے ڈاکیومنٹریز اور فیچرس پیش کر چکے ہیں۔ ماضی میں ہندوستانی بری فوج اور شورش زدہ علاقوں میں زندگی پر مبنی موضوعات پر دانش 26 ڈرامے اور کئی مختصر فلمیں پیش کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اور نئے زمانے کی نامور ہستیوں کی سوانح پر دانش متعدد اسٹیج پلے پیش کر چکے ہیں۔ ان ہستیوں میں داراشکوہ، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، منٹو، غالب، امرتا پریتم اور محمد شاہ رنگیلا کے نام شامل ہیں۔ ان کے دو ڈراموں 'داراشکوہ' اور 'امرتا: A Sublime Love Story' جو کہ مشہور مصنفہ امرتا پریتم کی زندگی پر مبنی ہے، ان کی ہدایت فلمی دنیا کے مشہور ہدایت کار ایم ایس ستھیو نے دی تھی۔ ان کا حالیہ اسٹیج پلے 'ایک کتے کی کہانی' جو کہ سعادت حسن منٹو کی زندگی اور تخلیقوں پر مبنی ہے، اُسے حال ہی میں قومی سطح کے بھارتیندو ناٹیہ اتسو میں پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 19 اپریل 2013

محمد احمد اور ڈاکٹر محسن ولی

نئی دھلی: اتر پردیش میں ضلع بلرام پور کے ایک گاؤں جیتا پور سے تعلق رکھنے والے محمد احمد بن عبداللہ سنابلی کو صدر جمہوریہ گولڈ میڈل سے نوازا گیا ہے۔ انھوں نے جامعہ اسلامیہ سنابل سے فضیلت کے بعد اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں یونیورسٹی سطح پر پہلا مقام حاصل کرتے ہوئے یو جی سی کی طرف سے پوسٹ گریجویٹ میرٹ اسکالرشپ فار یونیورسٹی رینک ہولڈر 12-2010 حاصل کیا۔ جون 2011 میں یو جی سی نیٹ اور جے آر ایف کوالیفائی کیا۔ 25 مارچ 2013 کو مدراس یونیورسٹی میں منعقدہ ہونے والے مقابلہ جاتی سیمینار میں نمایاں کارکردگی کی

بنا پر بیسٹ ریسرچ پیپر ایوارڈ سے نوازا گیا اور 13 مئی کو جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں تعلیمی، ادبی خدمات، غیر نصابی سرگرمیاں جیسے کھیل، موسیقی، ہاسٹل لائف میں نمایاں کارکردگی اور اخلاق و کردار میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے ہوئے صدر جمہوریہ گولڈ میڈل برائے مہارت عامہ 13-2012 سے نوازا گیا۔ دوسری جانب کانپور میں میڈیسن کے میدان میں اہم ترین شخصیت ڈاکٹر محسن ولی کو صدر جمہوریہ ہند پرنب مکھرجی کے دست مبارک سے ایک ہفتہ میں دوسری بار ایوارڈ سے نوازا۔ اطلاعات کے مطابق گزشتہ دنوں 3 مئی کو راشٹر پتی بھون میں صدر جمہوریہ کے دست مبارک سے ملنے والے گولڈ میڈل کے بعد 10 مئی کو ڈاکٹر ولی کو صدر جمہوریہ کے دست مبارک سے ہی کانپور کے جے ایس وایم میڈیکل کالج میں بیسٹ الیومنی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 مئی 2013

رضا امروہوی

نئی دھلی: معروف شاعر اور ادیب رضا امروہوی کو 'بزم ادب کرنال' کی جانب سے ادبی خدمات کے اعتراف میں 'مولانا الطاف حسین حالی لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ

ہریانہ اردو اکادمی اور بزم ادب کرنال کے اشتراک سے منعقدہ مشاعرے میں ہریانہ اسمبلی کے اسپیکر کلدیپ شرما، ہریانہ اردو اکادمی کے ڈائرکٹر دیس راج سپرہ نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور نظامت ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری شمس تبریزی نے کی۔ مشاعرے میں روپ نارائن کی کتاب 'پھول اور کانٹے' کی رونمائی بھی عمل میں آئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اپریل 2013

سہیل کاکوروی و سلام صدیقی کو ثاقب ایوارڈ

لکھنؤ: ثاقب ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے تحت ثاقب ماڈل اسکول کا مشہور شاعر مجاز کے نام منسوب سالانہ جلسہ ثاقب پارک، راجا جی پورم میں ہوا جس کی صدارت این سی سی گروپ کے ٹریننگ افسر میجر اے کے سنگھ نے کی۔ ریاستی خواتین کمیشن کی چیئرپرسن زرینہ عثمانی نے جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ مشہور شاعر ثاقب لکھنوی کی یاد میں ثاقب ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی تعلیم کے میدان میں اہم کام انجام دے رہی ہے۔ سنگیت ناٹک اکادمی کے صدر نوید صدیقی، سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر اشوک باجپئی، ابھے پرتاپ سنگھ اور

کارپوریٹر شیو پال نے بھی اپنے خیالات ظاہر کیے۔ کالج کے بانی ظاہر قزلباش نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اسکول کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔ اس موقعے پر خواتین کمیشن کی چیئرپرسن زرینہ عثمانی کے ہاتھوں ٹیچرس کو اعزاز سے نواز کر ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اپنے اپنے کلاس میں اوّل دوم اور سوم آنے والے طلبا و طالبات کو انعامات سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر سوسائٹی کی جانب سے ہندی، انگریزی، اردو اور فارسی میں گرانقدر نثر و نظم لکھنے والے سہیل کاکوروی اور ممتاز کالج کے سبکدوش پرنسپل سلام صدیقی کو مجموعی خدمات کے لیے ثاقب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اسکول کی پرنسپل اسمتا سنگھ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 مئی 2013

مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ

نئی دهلی: اس کتاب کی تحقیق واشاعت پر دل کی گہرائی سے مبارکباد دیتا ہوں اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے علمی کارنامے لائق ستائش ہیں اور اس کے مرتب لائق مبارکباد ہیں۔ ان خیالات کا اظہار کپل سبل مرکزی وزیر حکومت ہند نے شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شائع شدہ کتاب مجموعہ امام شاہ ولی اللہ جلد اول کی رونمائی کی تقریب میں کیا۔ جس کے مرتب مشہور اسلامی محقق اور ماہر اسلامیات مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی ہیں۔ انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مختلف عربی، فارسی کتابوں کا اردو ترجمہ مع حواشی شائع کیا ہے اور ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ ڈاکٹر علیم اشرف خاں نے 'مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ ایک تعارف' کے عنوان سے ایک کلیدی مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر

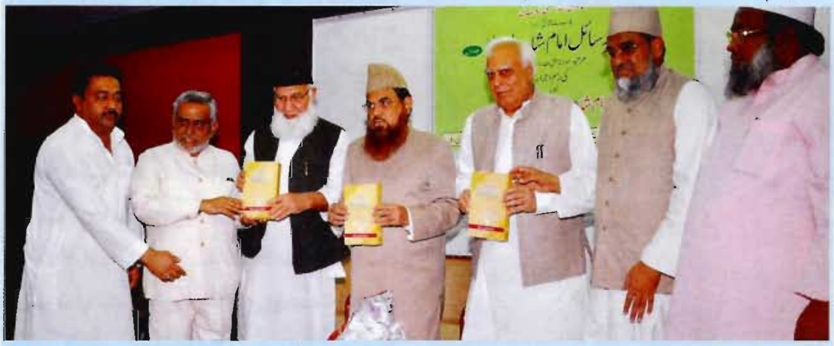

شریف حسین قاسمی نے شاہ صاحب کی فارسی خدمات اور اس خانوادہ کے قرآنی تراجم کا ذکر اپنے والد کے حوالے سے کیا جب کہ پروفیسر سید شاکر جمیل ڈائریکٹر جنرل یونانی کونسل نے بھی اس مجموعے کی اشاعت پر خوشی کا اظہار کیا اور تصوف کی معنویت وافادیت پر روشنی ڈالی۔ شاہی جامع مسجد فتح پوری کے امام وخطیب مولانا ڈاکٹر مفتی مکرم احمد نے بھی غیر معمولی حیرت واستعجاب کا اظہار کیا کہ اس مجموعے میں حضرت شاہ صاحب کے وہ نادر ونایاب رسائل وکتب شامل ہیں جن کے نام آج تک سنتے تھے اور ان کے اقتباسات ہی پڑھتے آئے تھے۔ پروفیسر اختر الواسع نے اس موقر سیمینار میں تصوف اور شاہ ولی اللہ کے موضوع پر وقیع اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ شاہ ولی اللہ مجدد وقت تھے اور تصوف کے متضاد تصورات کے درمیان تطبیق دینے کی سعی بلیغ کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس ضخیم مجموعہ رسائل کا اردو اور انگریزی زبان میں بھی ترجمہ ہونا چاہیے۔ محمد ادیب (ایم پی) نے کہا مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی کے شوق وجذبہ صادق اور ان کے کام اور مسلسل کام کرنے کے جنون سے ہم متاثر ہوئے ہیں اور یہی شاہ شناسی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ چودھری متین احمد چیرمین دلی وقف بورڈ نے بھی شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی خدمات کا بھی بھرپور اعتراف کیا۔ اس تقریب رونمائی اور سیمینار کی نظامت باترتیب ڈاکٹر عبید العلیم اور معصوم مرادآبادی نے کی، جبکہ اس کی صدارت مفتی مکرم احمد اور مولانا رفیق احمد قاسمی سکریٹری جماعت اسلامی نے کی۔ آخر میں مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے فکر ولی اللہ پر مختصر تقریر کی اور مہمانان وحاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، عطاء الرحمٰن قاسمی، دہلی، 7 مئی 2013

رسم اجرا:

دسترس

امروهه: انڈین کلچرل سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک شعری نشست اور معروف شاعرہ نگار بانو ناز کے اوّلین شعری مجموعہ 'دسترس' کی رسم رونمائی ڈاکٹر شمیم، ڈاکٹر مینا نقوی، مسرور جوہر، مکیش امروہوی، راشدہ باقی حیا کے دست مبارک سے سوسائٹی کے جنرل سکریٹری مکیش امروہوی کی رہائش گاہ پر عمل میں آئی۔ نشست کی صدارت ڈاکٹر مینا نقوی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض اسلم بقائی نے بخوبی انجام دیے۔ اس موقعے پر تمام شعرا نے نگار بانو ناز کو مبارکباد پیش کی۔ نشست میں مقامی شعرا کے علاوہ بیرونی شعرا نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 اپریل 2013

رام کا کردار اقبال کی نظر میں

سهارنپور: سوامی رام تیرتھ کیندر میں علامہ اقبال اور سوامی رام تیرتھ کے دوستانہ مراسم پر ڈاکٹر کیدار ناتھ پربھاکر کی کتاب 'رام ان دی آئیز آف اقبال' کی رسم اجرا اتراکھنڈ کے گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی کے ہاتھوں ہوئی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال آفاقی شاعر تھے اور وہ انسانیت کو سرحدوں میں تقسیم کرنے کے قائل نہیں تھے۔ ڈاکٹر عزیز قریشی نے اقبال کی شاعری پر بھی اظہارِ خیال کیا اور ان کے اشعار سنائے۔ علاوہ ازیں انھوں نے کہا کہ 'صلح کل' کا نظریہ اشوک کی دین ہے۔ بعد میں مغل شہنشاہ اکبر نے اس کی تبلیغ وتشہیر کی۔ اکبر کے بعد شاہجہاں کے بیٹے داراشکوہ نے اس نظریہ کو تقویت دی۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر کیدار ناتھ پربھاکر سوامی رام تیرتھ اور اقبال کے دوستانہ مراسم کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دونوں نے ایک ساتھ ایک کالج میں پڑھایا تھا۔ ڈاکٹر کیدار ناتھ کی اس کتاب کو انگریزی کے قالب میں ڈھالنے والے ڈاکٹر آکاش نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اقبالؒ اور سوامی رام تیرتھ دونوں کے نظریات میں بڑی یکسانیت تھی اور دونوں ویدانت اور تصوف پر ہم خیال تھے۔ ہرکیش بہادر، پروفیسر فلپ شاستری (پولینڈ) مس کرینا (روس) نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ سردار پی پی سنگھ نے اقبالؒ کی نظم پڑھی۔ پروگرام کی نظامت راؤ محبوب نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 اپریل 2013

مسافران لندن

نئی دهلی: 'مسافران لندن' ایک مفید اور لائق مطالعہ سفرنامہ ہے۔ اس کے مصنف مولوی سمیع اللہ خاں ایک

بڑے عالم اور کامیاب منتظم تھے۔ ان کا یہ سفرنامہ ہمیں 1880 کے لندن ہی نہیں بلکہ یوروپ کے سماج اور وہاں

جاری تبدیلیوں سے ہمیں آگاہ کرتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار جسٹس آفتاب عالم نے آج یہاں مولوی سمیع اللہ کے سفرنامہ 'مسافران لندن' کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔ تقریب رونمائی کا اہتمام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی کے اشتراک سے ایڈورڈ سعید ہال، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں کیا تھا۔ اس موقعے پر خواجہ محمد شاہد نے کہا کہ مولوی سمیع اللہ اپنے زمانے کے روشن خیالوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع وائس چیئرمین دہلی اردو اکادمی نے کہا کہ مولوی سمیع اللہ خاں ہماری تہذیبی روایت کا وہ انمول ہیرا ہیں جنھوں نے سرسید کے ساتھ مل کر ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی بہبود کے مشن کو آگے بڑھایا۔ انھوں نے کہا کہ جس نشاۃ ثانیہ کا رشتہ ہم راجہ رام موہن رائے سے جوڑتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا مطالعہ سرسید کے نانا اور خود مولوی سمیع اللہ کے ایک خاندانی بزرگ خواجہ فریدالدین کے تناظر میں بھی کیا جائے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے مینجنگ ڈائرکٹر پروفیسر خالد محمود نے 'مسافران لندن' کا تعارف کرایا اور ایسے وقیع کام کے لیے پروفیسر اصغر عباس کی ستائش کی۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے یہ اعلان کیا کہ مولوی سمیع اللہ کی ذکاء اللہ کی تصنیف کردہ سوانح عمری پروفیسر اصغر عباس کے ذریعے نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ اردو اکادمی دہلی شائع کرے گی۔ تقریب رونمائی میں جامعہ کے وائس چانسلر نجیب جنگ نے خصوصیت کے ساتھ شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 مئی 2013

اردو صحافت کا نیر تاباں

نئی دهلی: معروف صحافی ضیاء الرحمٰن نیر پر ڈاکٹر شمع افروز زیدی کی مرتب کردہ کتاب 'اردو صحافت کا نیر تاباں، ضیاء الرحمٰن نیر حیات وخدمات' کا جامعہ نگر کے بٹلہ ہاؤس علاقے میں اجرا کیا گیا۔ بیسویں صدی کے دفتر میں منعقد کی گئی ایک پروقار ادبی نشست میں اس کتاب کا اجرا اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے

کیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی نے کی جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر پنجاب اردو اکادمی کے سکریٹری پرویز محمد اقبال (مالیرکوٹلہ) نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ضیاء الرحمٰن نیر کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی۔ اس ادبی نشست میں ادبی وسماجی شخصیات موجود تھیں۔ نظامت معروف نقاد وشاعر ڈاکٹر مولا بخش نے کی۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 اپریل 2013

شہاب رنگ

رامپور: آل انڈیا مسلم فیڈریشن کے زیر اہتمام یک روزہ اردو ادبی سیمینار کے موقعے پر مرادآباد کے کہنہ مشق شاعر شہاب مرادآبادی کے مجموعہ کلام 'شہاب رنگ' کا رسم اجرا بدست شاعر اظہر عنایتی اور مقبول ادیب س ش عالم

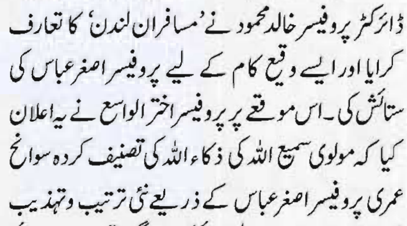

کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے س ش عالم نے کہا کہ شہاب مرادآبادی کی قلمی صلاحیتوں کا ذکر کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مانند ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ شہاب مرادآبادی کے ہم عصروں میں مرحوم گوہر عثمانی، شاہد احسن، سلیم کیفی اور رامپور کے اساتذہ میں ڈاکٹر شوق اثری اور ہوش نعمانی جیسے شعرا شامل ہیں۔ اس موقعے پر اظہر عنایتی نے کہا شہاب مرادآبادی کا رامپور سے تعلقات کا اس سے بڑا اور ثبوت کیا ہوگا کہ انھوں نے اپنے مجموعہ کلام کا اجرا رامپور میں کرایا۔ اس موقعے پر آل انڈیا مسلم فیڈریشن کے قومی صدر نسیم احمد ایڈووکیٹ، قومی جنرل سکریٹری بابر خاں، اتراکھنڈ صوبے کے صدر شیخ عبدالعزیز، شباب خان، شہنشاہ صابری، فرید شمسی، انور کیفی، اظہر مسعود خاں، الیس فضیلت، غفران فریدی کے علاوہ کثیر تعداد میں شعرا اور معززین نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 مئی 2013

بیسویں صدی کا مرثیہ

لکھنؤ: معروف صحافی عالم نقوی کی کتاب 'بیسویں صدی کا مرثیہ' کا اجرا جھارکھنڈ کے سابق گورنر سید سبط رضی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اردو میڈیا سینٹر کے تحت یہاں رائے اوماناتھ بلی ہال قیصر باغ میں ہونے والی اس تقریب کی صدارت معروف سائنسداں ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی نے اور نظامت رضوان فاروقی نے کی۔ مشہور شعرا منور رانا اور بشیر فاروقی نے اپنا معیاری کلام پیش کیا۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی نے اپنے خطاب میں کہا کہ عالم نقوی کی کتاب 'بیسویں صدی کا مرثیہ' اور گزشتہ چند ماہ پہلے شائع ہونے والی ان کی کتاب 'اذان' کا مطالعہ میں نے کیا تو بڑا خوشگوار تاثر قائم ہوا۔ ان کتابوں میں وہی کچھ ہے جو میری زندگی کا حاصل رہا ہے۔ سابق گورنر سبط رضی نے کہا کہ جسے بھی ماحولیات سے دلچسپی ہے وہ عالم نقوی کی کتاب 'بیسویں صدی کا مرثیہ' کو بہ یک نشست ختم کر کے دم لے گا۔ کسی خشک موضوع کو پرکشش بنا دینا قلمکار کی فنی مہارت اور چابکدستی کا غماز ہے۔ بلا مبالغہ عالم نقوی جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کردیتے ہیں۔ پروفیسر جمال نصرت نے کہا کہ 'بیسویں صدی کا مرثیہ' سے ہمیں یہ پیغام ملتا ہے کہ سارے فتنوں کی جڑ ہوس ہے۔ ہوس کے خاتمے کے بغیر دنیا کی فلاح و بقا کا کام ہم نہیں کر سکتے معروف ادب وشاعر سہیل کاکوروی نے کہا کہ عالم نقوی کے مضامین ادب عالیہ میں رکھے جانے کے لائق ہے۔ پروگرام کے کنوینز اوراودھ نامہ گروپ کے ایڈیٹر وقار رضوی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 مئی 2013

باغ و بہار کا اسلوبیاتی مطالعہ

نئی دهلی: کسی بھی تحریر کی امتیازی خصوصیت اس کا اسلوب ہوتا ہے یہی وجہ تھی کہ باغ و بہار کے مصنف میرامن نے اپنے اسلوب میں سادگی اور روانی کا خاص خیال رکھا۔ میرامن کے دور سے لے کر آج تک باغ و بہار کی طرز تحریر پر جس ادیب اور ناقد نے قلم اٹھایا وہ بغیر

تعریف کیے آگے نہیں بڑھا ہے۔ ان خیالات کا اظہار غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام نوجوان اسکالر ڈاکٹر شعیب رضا خان وارثی کی تصنیف 'باغ و بہار کا اسلوبیاتی مطالعہ' کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کیا۔ پروفیسر نصیر احمد خاں نے کہا کہ ڈاکٹر شعیب رضا خان نے اپنی اس کتاب میں میرامن کے اسلوب پر ایک تجزیاتی نظر ڈالی ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ باغ و بہار ہمارے ادب کا اتنا قیمتی سرمایہ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ اس داستان کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ رضا پی جی کالج رام پور شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر حسن احمد نظامی نے کہا کہ اردو ادب میں بہت بڑا ذخیرہ داستانوں کا ہے جس پر ابھی تک خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش نے کہا کہ ڈاکٹر شعیب رضا خان کا یہ کام علمی دنیا میں اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے باغ و بہار کے اسلوبی مطالعے کے ذریعے نثری اسلوب کی شناخت کے اصول وضوابط مرتب کیے ہیں۔ ڈاکٹر ظہیر رحمتی نے کہا کہ ڈاکٹر شعیب رضا خان نے اس کتاب میں اردو میں داستان گوئی کی روایت اور باغ و بہار کے فنی محاسن پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس موقعے پر نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر رضا حیدر نے کتاب کا تعارف پیش کیا۔ شعیب رضا خاں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان تمام مسائل وحالات پر روشنی ڈالی جن کا انھیں کتاب کو تحریر کرتے وقت سامنا کرنا پڑا۔ آخر میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے شام شہریاراں کے مقاصد پر گفتگو کی اور تمام سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس جلسے میں اے رحمان، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر جمیل اختر، پروفیسر مظہر مہدی، پروفیسر فاروق انصاری، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اپریل 2013

پیشانی

لکھنؤ: عالمی فروغ اردو سوسائٹی و قلم کاران اودھ کے اشتراک سے ڈاکٹر منصور حسن خاں کی مرتب کردہ کتاب 'پیشانی' کی رسم رونمائی یوپی پریس کلب میں ہوئی۔ 'پیشانی' عالمی شہرت یافتہ ادیب و شاعر نقاد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے ان مقدمات و تقریظات پر مشتمل ہے جو انھوں نے ملک کے معروف و غیر معروف شعرا، ادبا کی کتابوں پر قلم بند کیے ہیں۔ تقریب کی سرپرستی پنڈت ہنومان پرساد عاجز ماتوی اور صدارت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کی۔ بحیثیت مہمان خصوصی ڈاکٹر انیس انصاری (وائس چانسلر خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی) شریک ہوئے۔ دیگر مہمانان گرامی میں پروفیسر صابرہ حبیب اور انل دوبے کے نام قابل ذکر ہیں۔ نظامت معروف شاعر واصف فاروقی نے کی۔ ممتاز نثر نگار رضوان فاروقی، معروف شاعر شکیل گیاوی اور منفرد لب و لہجے کے نثر نگار سہیل کاکوروی نے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی علمی و ادبی شخصیت کا اپنے پرمغز مقالے میں اجمالی جائزہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی انیس انصاری نے ملک زادہ سے متعلق اس کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے مرحوم مقبول لاری پر لکھے گئے مقدمے سے اپنے ماضی کے تعلقات کو اجاگر کرتے ہوئے انھیں ایک نیک اور منکسر المزاج انسان بتایا۔

وفیات/خراج عقیدت:

اصغر علی انجینئر

ممبئی: معروف اسلامی اسکالر اصغر علی انجینئر کا 14 مئی کو صبح طویل علالت کے بعد ممبئی میں انتقال ہوگیا۔

74 سالہ انجینئر ترقی پسند بوہرہ تحریک کے رہنما تھے۔ ذرائع کے مطابق سانتا کروز کے مضافاتی علاقے میں رہائش پذیر انجینئر کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ 1940 میں پیدا ہوئے اور وکرم یونیورسٹی سے سول انجینئرنگ میں بی ایس سی کی اور 1980 سے انھوں نے دی اسلامک پرسپیکٹیو جرنل شروع کیا اور 1980 کی دہائی میں انھوں نے اسلام اور ہندوستان میں فرقہ وارانہ تشدد پر کئی کتابیں لکھیں۔ کئی کتابیں آزادی کے بعد پیدا شدہ حالات پر لکھی گئیں۔ انھیں 1978 میں یو ایس اے انٹرنیشنل اسٹوڈنٹ اسمبلی اور یو ایس اے انڈین اسٹوڈنٹ اسمبلی نے ان کی خدمات کے لیے اعزاز سے نوازا تھا۔ فرقہ وارانہ یکجہتی کے لیے انھیں 1990 میں ڈالمیا ایوارڈ دیا گیا اور 3 اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں بھی حاصل ہوئی تھیں۔ بابری مسجد کی 1992 میں شہادت کے بعد انھوں نے 1993 میں سینٹر فار اسٹڈی اینڈ سیکولرزم (سی ایس ایس ایس) کی بنیاد ڈالی اور وہ اس سینٹر کے چیئرمین تھے اور ایک عرصے تک اسی کام میں انھوں نے توجہ دی۔ انھوں نے 52 کتابیں لکھیں، ان کے متعدد مضامین اور مقالات کئی رسائل اور جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ وہ انڈین جرنل آف سیکولرزم کے ایڈیٹر اور ایک ماہنامہ 'اخبار اسلام اینڈ ماڈرن ایج' کے ایڈیٹر رہے۔ انھیں لاتعداد ایوارڈس سے نوازا گیا۔ جن میں قومی فرقہ وارانہ ہم آہنگی ایوارڈ 1997 اور امریکہ کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی تنظیم کا 2003 کا ایوارڈ شامل ہے۔ اصغر علی انجینئر ایک بوہرہ مسلم تھے اور انھوں نے بوہرہ فرقہ میں اصلاحی تحریک شروع کی تھی۔ انھوں نے عصر جدید میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر حملے کا مثبت اور معروضی فکر سے جواب دیا۔ ہند-پاک تعلقات پر بھی قلم چلایا، لیکن ہندوستان کے فرقہ وارانہ حالات اور بھائی چارگی پر ان کے مضامین متاثر کن رہتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 مئی 2013

نصرت محی الدین

حیدرآباد: نصرت محی الدین ایک حرکیاتی، فعال، اردو سپاہی 'سراپا اخلاص' پابند نظم و ضبط شخصیت، ملک گیر سطح پر اردو تحریکوں کے روح رواں، مجبوروں، مظلوموں، مزدوروں کے مونس و غم خوار سچے ہمدرد اور اچھے انسان تھے۔ محمد علی حسینی سابق صدر انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے اردو گھر مغل پورہ میں 6 اپریل کی شام نصرت محی الدین صدر انجمن ترقی اردو مرحوم کے تعزیتی جلسے میں اپنے صدارتی خطاب کے دوران ان خیالات کا اظہار کیا۔ ابتدا میں امریکہ، شکاگو، کناڈا، دبئی، سعودی عربیہ سے موصولہ تعزیتی پیامات ڈاکٹر راہی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو نے جو جلسے کی نظامت کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے، پڑھ کر سنائے۔ ڈاکٹر منیر الزماں منیر نے کہا کہ نصرت محی الدین اردو زبان و ادب کا قطب بینار تھے ان کی رحلت اردو زبان و تہذیب کا نقصان عظیم ہے۔ حسن چشتی نے کہا کہ نصرت محی الدین ملک بھر میں اردو تحریکوں کے روح رواں تھے اور اردو کی ایک ایسی آواز تھے جو ملک و بیرون ملک اپنا ایک اثر رکھتی تھی۔ بشیر انور نے کہا کہ نصرت محی الدین کی زندگی کا مقصد ہی اردو زبان و ادب اور تہذیب کا فروغ، اردو کا تحفظ، اردو کی بقا اور اردو تہذیب کو دنیا بھر میں عام کرنا تھا۔ منور النسا منور، مولانا حبیب عبدالرحمٰن الحامد، پیرزادہ سید کاشف اللہ حسینی، ڈاکٹر م۔ ق سلیم، سید فضل الحق رضوی، محمد منیر الدین تمیز الدین، مسعود فضلی، عابد علی خاں، فرید سحر وغیرہ نے بھی نصرت محی الدین کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار اور خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 8-7 اپریل 2013

سکندر احمد

ممبئی: 'اردو چینل' کے توسط سے ملنے والی خبر کے مطابق اردو کے معروف نقاد اور عروض داں سکندر احمد اتوار 5 مئی کو حرکتِ قلب بند ہوجانے سے بھوپال میں انتقال کرگئے۔ سکندر احمد نئی نسل کے لکھنے والوں میں ایک نمایاں نام تھا۔ انھوں نے فکشن کی شعریات اور بنیادی مباحث کو روایتی تنقید کے حصار سے نکال کر اس کی مبادیات اور نظری مباحث کو ایک نئی زندگی دی۔ سکندر احمد نہ صرف یہ کہ شاعری اور فکشن کے نقاد تھے اور مشرق و مغرب کی تنقیدی روایت اور تاریخ سے آگاہ تھے بلکہ عروض میں بھی انھیں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ ان کی تحریروں میں ایک عالمانہ نکتہ رسی اور بالغ نظری دیکھنے کو ملتی ہے۔ اردو ادب کو خصوصاً تنقید کے میدان میں ان سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 مئی 2013

اختر پیامی

نئی دہلی: ممتاز شاعر اور صحافی اختر پیامی کا کراچی میں 9 اپریل کو انتقال ہوگیا۔ وہ کچھ عرصے سے علیل تھے۔ اختر پیامی کا تعلق ہندوستان کے صوبہ بہار سے تھا۔ ان کی پیدائش 1931 میں ہوئی تھی۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے معاشیات میں گریجویشن کیا۔ کچھ دنوں ان کا قیام کلکتہ میں بھی رہا، جہاں وہ ہفت روزہ 'نئی منزل' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان چلے گئے، جہاں انھوں نے مارننگ نیوز سے انگریزی میں اپنے صحافتی کریئر کا آغاز کیا۔ وہ کراچی کے مشہور انگریزی اخبار 'ڈان' کے نیوز ایڈیٹر بھی رہے۔ اختر پیامی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ شاعری اور صحافت میں ان کے ترقی پسندانہ خیالات کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ اردو شعر و ادب میں بھی انھوں نے نئے تجربے کیے۔ ان کے دو شعری مجموعے 'تاریخ اور کلس' بہت مشہور ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 اپریل 2013

تمنا مظفر پوری

پٹنہ: ممتاز ادیب اور انشائیہ نگار تمنا مظفر پوری کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ 70 برس کے تھے ان کی نماز جنازہ اتوار کو صبح آٹھ بجے سمن پورہ میں دانش اپارٹمنٹ کے احاطے میں ادا کی گئی اور تدفین ویٹنری کالج کے قریب قبرستان میں عمل میں آئی۔ تمنا مظفر پوری کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ ان کی پیدائش 17 نومبر 1943 کو محمد پور مبارک ضلع مظفر پور میں ہوئی تھی۔ ان کے والد حضرت جنداہا (ویشالی) سے ہجرت کرکے وہاں بس گئے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب سترہویں صدی کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم شاہ علی شطاری رحیم اللہ سے ملتا ہے۔ تمنا مظفر پوری رام دیالو سنگھ کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بہار اسٹیٹ شوگر کارپوریشن میں بحیثیت لیبر ویل فیئر آفیسر مقرر ہوئے جہاں سے وہ نومبر 2003 میں سبکدوش ہوئے۔ 1966 میں شاہینہ خاتون بنت سید جمیل احمد سے ان کی شادی ہوئی۔ تمنا مظفر پوری کو تصوف اور علم و ادب کا ذوق وراثت میں ملا۔ ان کے والد سید محمد عمر دراز خود شاعر تھے۔ انھوں نے طنز و ظرافت کے علاوہ ڈرامہ نگاری اور ادب اطفال سے بھی اپنا رشتہ جوڑا اور شہرت حاصل کی۔ ابھی حال ہی میں بہار اردو اکادمی نے ان کی کتاب 'عقل مند بچے' کو انعام سے نوازا ہے۔ تمنا مظفر پوری کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں ظرافت اور چند ظریف ہستیاں، تمنا پنچ، پردے کے سامنے، الٹے قلم سے، کلیات احرار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی سال ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا ایک مجموعہ 'تحقیق و تنقیدی آفاق' شائع ہوکر منظر عام پر آیا ہے۔ تمنا مظفر پوری کے انتقال پر اردو کی کئی ادبی اور لسانی تنظیموں نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور ان کے انتقال کو اردو ادب کا ایک عظیم خسارہ قرار دیا ہے۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 6 مئی 2013

شمشاد بیگم

ممبئی: اپنی سریلی آواز سے سامعین کے دلوں پر برسوں تک راج کرنے والی مشہور پلے بیک سنگر شمشاد بیگم کی اپنی بیٹی کی رہائش گاہ پر موت ہوگئی۔ وہ 94 برس کی تھیں۔ سال 1955 میں شوہر گنپت لال بٹو کی موت کے بعد سے وہ اپنی بیٹی اوشا راترا اور داماد کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ شمشاد بیگم کی پیدائش 14 اپریل 1919 کو امرتسر میں ہوئی تھی۔ شمشاد بیگم نے 16 دسمبر 1947 میں لاہور کے پیشاور ریڈیو سے اپنے کریئر کی شروعات کی تھی۔ ہندی فلموں کی مشہور پلے بیک سنگروں میں سے ایک شمشاد بیگم نے کئی مشہور گیت گائے ہیں جن میں سے ''بوجھ میرا کیا ناؤں رے، ندی کنارے گاؤں رے''، ''سیاں دل میں آنا رے''، ''لے کے پہلا پہلا پیار، بھر کے آنکھوں میں خمار، جادو نگری سے آیا ہے کوئی جادوگر''، ''میرے پیا گئے رنگون''، ''کبھی آر کبھی پار، لاگا تیر نظر''، ''کجرا محبت والا، انکھیوں میں ایسا ڈالا'' فلمی گیتوں کے علاوہ انھوں نے کئی غزل اور بھجن بھی گائے تھے۔ ان کی بیٹی اوشا نے بتایا کہ شمشاد بیگم کی آخری رسوم میں چند قریبی دوست شامل ہوئے۔'' وہیں دوسری جانب شمشاد بیگم کی موت پر سرکردہ شخصیات نے اظہار تعزیت کی ہے۔ وزیر اعظم منموہن سنگھ نے آج معروف گلوکارہ شمشاد بیگم کے انتقال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ غیر معمولی صلاحیت کی مالک آرٹسٹ تھیں۔ اپنے غم کے پیغام میں وزیر اعظم نے کہا کہ شمشاد بیگم تین دہائی سے زیادہ وقت تک ملک کے مقبول گلوکاروں میں سے ایک رہیں۔ اپنی جادو بھری اور مسحور کن آواز کے ساتھ ساتھ مختلف طرح کی تان سے انھوں نے موسیقی کے پرستاروں کا دل جیت لیا۔ گلوکارہ شمشاد بیگم کے انتقال کو موسیقی کی دنیا کا ناقابل تلافی نقصان بتاتے ہوئے اطلاعات اور نشریات کے وزیر منیش تیواری نے آج کہا کہ ان کی گائیکی کے طرز نے نئی مثال قائم کی تھی۔ ایک تعزیتی پیغام میں مسٹر تیواری نے کہا ہے، فلم صنعت نے ایک باصلاحیت گلوکارہ کو کھودیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 اپریل 2013

□